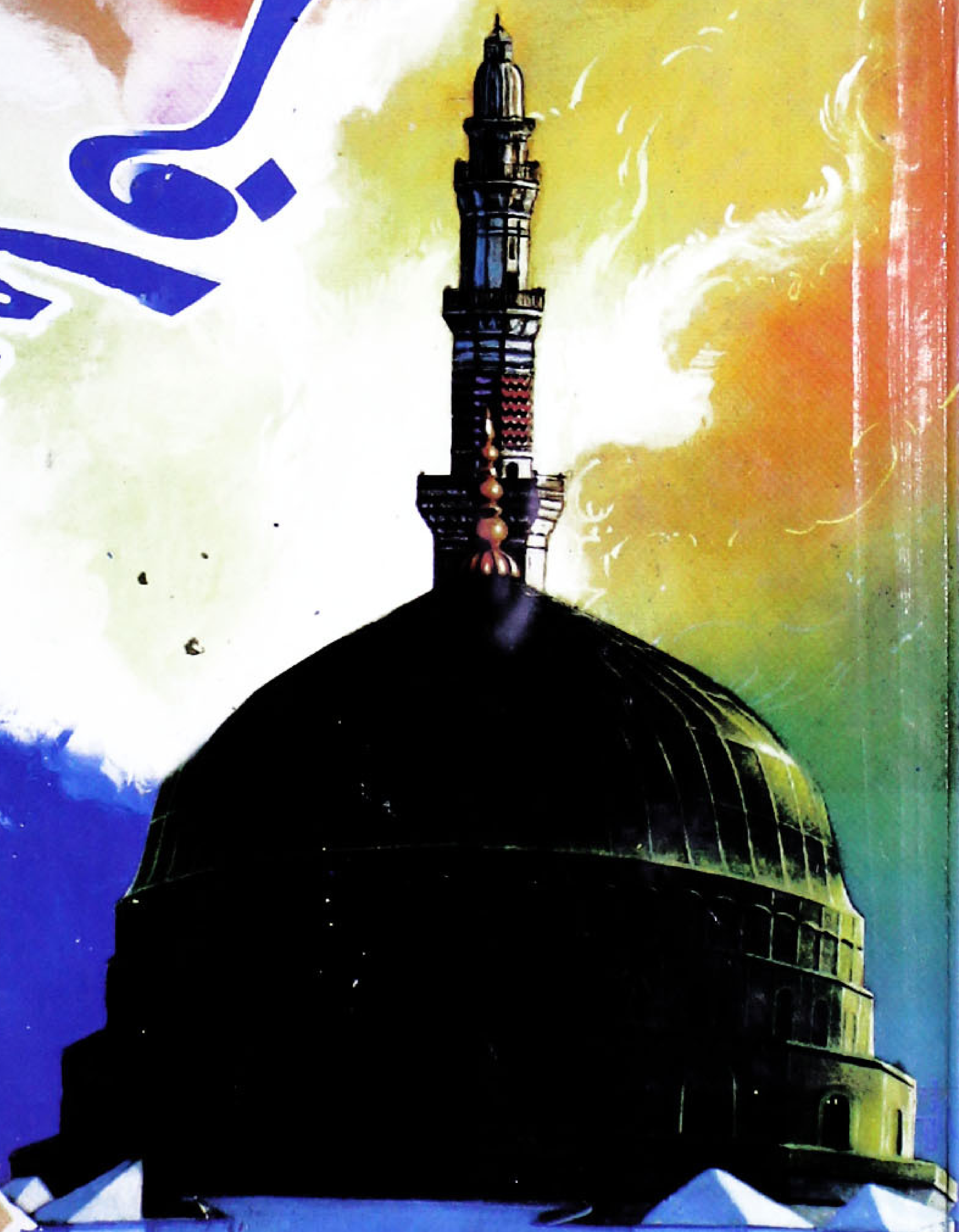
پروفیسر محمد اکرم رضا



قافلۂ شوق کے مسافر

(نعتیہ مضامین)

پروفیسر محمد اکرم رضا

[redacted]



فروغِ ادب اکادمی

لاہور ــــ گوجرانوالہ ــــ اسلام آباد

نام کتاب : قافلہء شوق کے مسافر

مصنف : پروفیسر محمد اکرم رضا

سال اشاعت : 2007ء

تعداد : اک ہزار

قیمت : [redacted]پے

اہتمام : فروغِ ادب اکادمی

88۔بی۔سیٹلا ئیٹ ٹاؤن گوجرانوالہ

فون : 055.3251603

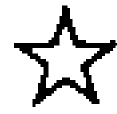
تقسیم کار

کتاب سرائے۔الحمد مارکیٹ' غزنی سٹریٹ۔اردو بازار لاہور

فون۔7320318

نعت مرکز۔المدینہ دارالاشاعت' یوسف مارکیٹ' غزنی سٹریٹ 88۔اردو بازار لاہور

سیدنا امام محمد بن سعید شرف الدین بُوصیری کے نام



کہ جن کی وارفتگیءشوق نے نعت ومدحتِ حضور ﷺ

کے حوالے ان سے وہ تاریخ ساز اشعار کہلوائے

جواُن کی جسمانی شفایابی' روحانی سرفرازی اور شعری رفعت کا اس شان سے اعزاز بنے

کہ وہ چادرِ رحمت (قصیدہ بردہ شریف) سے بھی نوازے گئے

اور اُن کی نعت گوئی ہر عہد' ہر دور اور ہر قرن کے ظلمت زدوں کے لئے پیغامِ نور بن گئی

فہرست

تاریخ طباعت: ''قافلۂ شوق کے مسافر''

نتیجہ فکر۔علامہ عبدالرشید ارشد جلال پوری

آ گئی ہے کتاب حقائق کشا 'دیکھئے ہے چھپی کس قدر دلربا
منفرد ہے کتابت میں بھی مرحبا ! جلد ہے بہترین ، سرورق خوش نما

ہے حلاوت زبان و بیاں میں بھری 'خوب ہے طرزِ تحریر میں چاشنی
کیا فصاحت ، بلاغت کی ہے ساحری' حسنِ ذوق تکلم میں ہے دلکشی!

ایک ناقد، پروفیسر اکرم رضا۔۱ 'جو ہیں موصوف در صنفِ شعر وسخن۔۲
ماہر نقدو معیارِ تنقید و فن۔۳ ' ان کی خوشبوئے سعد انجمن انجمن۔۴

آپ نے ذوقِ تقریظ و تحسین سے 'نعت گو شاعروں کے مضامین سے
ان کے اسلوب و اندازِ تدوین سے 'اک لیا جائزہ روئے آئین سے

نعت گو شاعروں کا ہے یہ تذکرہ' ان کے عیب و ہنر کا ز ہر زاویہ
خوب نقد و نظر سے کیا تجزیہ' پھر کیا ایک بے لاگ سا تبصرہ

عاشقانِ نبیؐ پر ہے رب کا کرم' جذب و مستی میں اُٹھتا ہے ہر اک قدم
ہے رواں دم بدم ، راہوارِ قلم' سوئے آں محترم ''تاجدارِ حرمؐ''

کارواں کے مسافر یہ عشاق ہیں' ''کشتگانِ محبت'' کے مصداق ہیں
مدح گوئی میں مشہورِ آفاق ہیں'جن کے مدحت سے لبریز اوراق ہیں

رہروانِ عقیدت کے یہ قافلے' چل پڑے ہیں دلوں میں لئے ولولے
جذبۂ شوق میں گھٹ گئے فاصلے' طے ہوئے وادیِ عشق کے مرحلے

۱۔۲۰۰۶ء ۲۔۲۰۰۶ء ۳۔۱۴۲۷ھ ۴۔۱۴۲۷ھ

یہ مسافر وفادارِ قرآن ہیں ، وارثانِ مقاماتِ حسانؓ ہیں
عصمتِ انبیا کے نگہباں ہیں ، سرفروشانِ اسلام و ایمان ہیں

مرحبا رہ نوردانِ دشتِ جنوں ! ان کے جذبِ دروں کے لیے کیا کہوں؟
لب پہ صلِ علیٰ، چال سیماب پا ، ہر قدم کیف زا پیشِ شوق فزوں!

کتنے خوش بخت ہیں آپؐ کے مدح خواں ، آپؐ کی منزلت کے جو ہیں قدرداں
آپؐ کے راز داں ، آپؐ کے ترجماں ، ان پہ ارشد ہے ہر دم خدا مہرباں

منزلِ شوق کے ہیں مسافر وہی ، جو ہیں مداحِ ممدوحِ معبودِ کُل
آسمانِ ولا کے کواکب ہیں۔ یہ ، محسنینِ محبینِ ختمِ رسلؐ

اشرف الانبیاؐ ، شاہدِ کبریاؐ ، مصطفیٰؐ ، مجتبیٰؐ ، آپؐ خیرالوریٰؐ
شب کی تاریکیاں، ظلم کی آندھیاں ، چھٹ گئیں آپؐ سے آپؐ بدر الدجیٰؐ

آپ خیر البشرؐ ، محسنِ بحروبر ، آپؐ کی اک نظر ، پُر اثر ، چارہ گر!
کہکشاں ، آسماں ، آپ کی رہ گزر ، سدرۃ المنتہیٰ سے بھی آگے سفر!

باعثِ کن فکاں، والیٔ دوجہاں ، ہادیٔ انس و جاں ، شافعِ عاصیاں
چشمۂ دینِ حق، جاوداں ، جاوداں ، رودِ رحمت رواں، بے کراں، بے کراں!

روز ہو یا کہ شب ، ہر گھڑی زیرلب ، آپؐ پر ہو درود و سلامِ اَدب!
آل و اصحاب پر بھی ہو والا حسب ، آپ اُمی لقب ، آپ محبوبِ رب

اے کثیر النعم ، سید المرسلینؐ ، زبدۂ عاطفت ، رحمتِ عالمینؐ
ہو عطف کی نظر سوئے ارشد حزیں ، طالبِ جذبِ صادق ہو در راہِ دیں

......☆......☆......

تجلی

پروفیسر محمد اکرم رضا

نعتِ مصطفٰے علیہ عبادت بھی ہے اور سعادت بھی۔ وہی لمحات حاصلِ حیات ہوتے ہیں جو ذکر و فکر مصطفٰی علیہ التحیۃ والثنا میں بسر ہوتے ہیں۔ یہ وہ حقیقت قدسی ہے جس سے میں اپنے خاندانی پس منظر اور نظریاتی کرم باریوں کی بدولت اوائل عمر ہی میں آگاہ ہو چکا تھا۔ جب سنِ شعور کو چھوا تو نعت کے انوار سے دل و جان ضوفگن ہونے لگے۔ جب فکر و شعور کو مزید پختگی ملی تو میں نے خود کو مذہبی، نظریاتی اور اَدبی رسائل کے ہجوم میں گھرا پایا۔ نعت کے نغمات ذہن و فکر کا افتخار بننے لگے اور ابھی میٹرک بھی نہیں کیا تھا کہ میری نعتیں معتبر رسائل و جرائد کی زینت بننے لگیں۔ جوں جوں عمر کے راہوار نے قدم آگے بڑھایا نعت کی سربلندیوں اور نئے نئے مضامین سے افکار کے اُلجھے ہوئے کنارے سلجھنے لگے اور زندگی کی بے کیف فضائیں تذکارِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے آباد ہونے لگیں۔

یہ عرض کرنا تحدیثِ نعمت ہے کہ فیاضی قدرت سے شاعری، نثر اور تقریر کا جذبہ خوب خوب عطا ہوا، اگرچہ میں نے نظم، نثر کو ایک میدان تک محدود نہیں کیا مگر نعت کے سیلِ نور نے بالخصوص مجھے اپنے بہاؤ میں لے لیا۔ نعت تو لکھی جا رہی تھی مگر تنقیدِ نعت کا تصور اس وقت ناپید تھا۔ جب وقت نے اِدھر کو رُخ موڑا، تو تنقیداتِ نعت کے لحاظ سے بھی بے تحاشا لکھا۔ مضامین و مقالات، شخصی مضامین، ہمہ گیر تحریریں، دیباچے، تقاریظ وغیرہ میں نے بارہا سوچا ہے کہ یہ میری فکر یا میرے قلم کا کمال نہیں بلکہ یہ تو عین عطائے خداوندی ہے کہ ہر لحظہ و ہر آن مجھے نوکِ قلم سے فکرِ نعت کے گل و لالہ لٹانے کے مواقع مہیا کرتی رہی۔

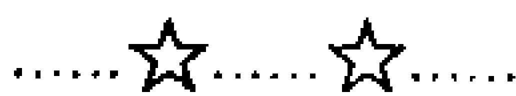
جس وقت ''فروغِ اَدب اکادمی'' کے زیرِ اہتمام میری کتاب ''کاروانِ نعت کے حدی خواں'' شائع ہوئی تو اس وقت تنقیدِ نعت کا شعور نہ ہونے کے برابر تھا۔ آج جبکہ چاروں طرف نعت پر تحقیقی کام ہو رہا ہے تو یہی کتاب ایک ماخذ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اسی سلسلے کی دوسری کڑی قافلہءشوق کے مسافر ہے۔ عزیز مکرم محمد اقبال نجمی (جن میں مجھے اپنے مستقبل کی جھلک نظر آتی ہے) کے زیرِ اہتمام فروغِ اَدب اکادمی سے شائع ہو رہی ہے۔ میرے سرمائے میں تو تنقیداتِ نعت کے حوالے سے اتنا مواد ہے کہ کم از کم درجن بھر کتب شائع ہو سکتی ہیں اور یہ سلسلہ رُکا نہیں بلکہ ممتاز رسائل و جرائد کی بدولت مسلسل پھیلتا جا رہا ہے۔ ویسے بھی کاروانِ نعت نہ کبھی رُکا ہے نہ تھما ہے۔ ہمارا کام تو فقط یہی ہے کہ تائید ایزدی کے سہارے اپنی تمام صبحیں اور شامیں محبوبِ دو عالم علیہ کی لاثانی شخصیات کے محاسن کی نذر کرتے رہیں۔

اس کتاب کی اشاعت کے ضمن میں میرے لیے سب سے زیادہ خوش کن اور یادگار پہلو یہ ہے کہ

اس کا دیباچہ عصرِ حاضر میں نعت کے سب سے بڑے نقیب حفیظ تائب نے لکھا ہے۔ نہایت محبت سے اور نہایت خلوص سے۔ مجھے ان سے یک گونہ تعلق خاطر تھا۔ آپ شرف زیارت بھی بخشتے رہے اور مجھے بھی اپنے دولت خانہ پر حاضری کا شرف عطا کرتے رہے۔ انہوں نے یہ دیباچہ عرصہ پیشتر لکھا مگر یہ کتاب ان کے وصال کے بعد شائع ہو رہی ہے۔ جب یہ دیباچہ لکھ چکے، تو میں نے عرض کی کہ اس میں آپ کے بارے میں بھی ایک مقالہ ہے۔ کہنے لگے پھر تو مجھے دیباچہ سے گریز کرنا چاہئے تھا۔ عرض کیا کہ آپ وہاں ہیں جہاں آپ کے ذکر کے بغیر سلسلہ نعت آگے کو نہیں بڑھتا اور پھر میں یہ مضمون آپ کو دکھاؤں گا بھی نہیں لیکن کتاب کی اشاعت کی تاخیر کی وجہ سے وہ مضمون کئی جرائد کی زینت بن گیا۔ بہر حال جناب حفیظ تائب کے بارے میں میرے احساسات اور محبتیں لفظوں میں نہیں سمٹ سکتیں دعا گو ہوں کہ رب کریم انہیں اس اثاثۂ نعت کی بدولت جو وہ ملت اسلامیہ کی میراث بنا چکے ہیں ہر گام پر بلند درجات عطا کرے اور حضور ﷺ کی شفاعت کریمانہ ان کا مقدر بنی رہے جس کی آرزو میں ان کی شاعری ہر لمحہ حیات کا اعزاز بنی رہی۔

''قافلہءشوق کے مسافر'' آپ کے روبرو ہے۔ قدیم دور اور عصر حاضر کے نعت گوؤں کے تذکار سے آباد۔ دعا ہے کہ ربِ کریم اپنے محبوب ﷺ کے وسیلہ جلیلہ سے حیات مستعار کو مہلت عطا کرتے رہیں تا کہ اوروں کے لیے بھی بدستور لکھتا رہوں اور اپنے بہت بڑے اشاعت کے منتظر اَدبی سرمایہ کی طباعت کا اہتمام بھی کرتا رہوں، سب فیصلے اوپر سے ہوتے ہیں۔ نگاہیں عالم تصور میں گنبد خضریٰ پر لگی ہیں کہ سرکارِ دوعالم ﷺ کی شفقت بے کراں کی بدولت الطافِ خداوندی کا سحاب میری فرصتِ حیات کو حسنِ طوالت کا اعزاز بخشتا رہے تا کہ میں وہ سب کچھ کر سکوں جو میرے دل کا مدعا اور میرے فکر و عمل کا تقاضا ہے۔

دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں اپنے پیارے محمد اقبال نجمی ڈائریکٹر ''فروغ اَدب اکادمی'' کا کہ جن کا اصرار اس مختصر سی تحریر کے لیے مجھے مدتوں ان سے دور رہنے پر آمادہ کرتا رہا۔ خدائے قدوس انہیں خدمتِ فروغِ نعت کا بھرپور صلہ عطا کرے اور اس کے ساتھ بےشمار دعائیں مدیر نعت رنگ صبیح رحمانی اور پیرزادہ حضرت اقبال احمد فاروقی کے لیے کہ جن کا اصرار اس کتاب کی اشاعت کے لیے مسلسل میرے شب و روز کا حصہ بنا رہا۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم.

پیشوائی

محمد اکرم رضا فردِ واحد کا نام نہیں بلکہ وہ ایک متحرک ادارہ ہیں۔ ان کی شخصیت اور فکر و فن کی کئی جہات ہیں اور ربِ صوت و صدا نے انہیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ وہ استاد ہیں، لفظوں پر مضبوط گرفت رکھنے والے خطیب ہیں، ادیب ہیں، شاعر ہیں، محقق ہیں، نقاد ہیں، مدیر ہیں۔ ایک زمانہ ان کی شعری اور تحقیقی صلاحیتوں سے مستفید ہوتا ہے اور نہ جانے ان کے کتنے جوہر ابھی پوشیدہ ہیں۔ وہ گذشتہ چالیس برس سے اپنی تمام تر صلاحیتیں نعت مبارک کے لئے وقف کیے ہوئے ہیں۔ متعدد ادبی و نظریاتی رسائل و جرائد کی ادارت اور سرپرستی، ادبی، سماجی، شعری اور نظریاتی تقاریب کی جان، نعت گوئی کے علاوہ نعت کی تدوین، تحقیق، تنقید اور اس کے اشاعت و فروغ کے لیے تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لانا ان کا اعزاز ہے بلکہ یوں کہنا صحیح ہوگا کہ رب کریم اور ممدوحِ نعت ﷺ کی عطائے خاص ہیں۔ ان کے سینکڑوں تنقیدی مضامین اور مقالات فنِ نعت کے مختلف زاویوں کے حوالے سے قابلِ قدر رسائل و جرائد اور نعت نمبروں کی زینت بن رہے ہیں۔ ان کی متعدد ادبی اور تحقیقی تخلیقات ان کی فکری کاوشوں اور نظریاتی صلاحیتوں کے ارتقاء کی دلیل ہیں۔

فروغِ نعت کے حوالے سے ان کی کتاب ''کاروانِ نعت کے حدی خواں'' دستاویزی اور یادگار حیثیت کی حامل ہے۔ اس کتاب میں نابغۂ روزگار نعت گو شعراء کی نعتیہ کاوشوں کا تنقیدی حوالوں سے بھرپور جائزہ لیا ہے اگرچہ اب اس نوعیت کی دو تین مزید کتب منظر عام پر آ چکی ہیں مگر کسی بھی فکری کاوش کو اس کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے جب پروفیسر محمد اکرم رضا کی یہ تحقیقی کاوش منظرِ عام پر نہیں آئی تھی تو اس وقت اس نوعیت کی کوئی بھی کتاب ماخذ کا درجہ نہیں رکھتی تھی فقط چند نعتیہ انتخاب تھے یا ایک دو تحقیقی مقالات لیکن کاروانِ نعت کے حدی خواں نے نعت کے مشکبو صحراؤں میں واقعی حُدی خوانی کا کردار ادا کیا یہ چراغ جو جلا تو کئی دیئے اور جھلملانے لگے۔ انہیں یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے کئی بھولے بسرے نعت گوؤں کو ماضی کے نہاں خانوں سے نکال کر عہدِ حال کی زینت بنا دیا۔ انکا یہ سلسلہ رکا نہیں بلکہ دوام کی منزلوں کی جانب رواں دواں ہے۔

رضا صاحب بیک وقت ممتاز نقادِ نعت بھی ہیں اور معروف شاعر رسالتمآب ﷺ بھی۔ اگر بنظرِ

غائر دیکھا جائے تو دونوں میدانوں میں ان کا لہجہ مختلف ہوتا ہے۔ تنقید سنجیدگی، تحقیق اور ذوق جستجو سے عبارت ہے جبکہ نعت گوئی وفورِ شوق، عشق کے والہانہ پن اور جذباتِ عقیدت کی ہر ساعت اڑان کا نام ہے۔ محمد اکرم رضا اس لحاظ سے خوش بخت ہیں کہ تنقید اور نعت دونوں سے انصاف کر گئے۔ انہوں نے تنقید رقم کرتے ہوئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پُر تقدس جلوؤں کو مدنظر رکھا ہے اور جب نعت لکھی تو ممدوحِ نعت ﷺ کے تصورات میں ہمہ تن گم رہے۔ تحقیق و تنقید اور نعت و مدحت کی دنیاؤں میں ایک ہی وقت میں سرخروئی سے ہمکنار ہونے کا سبب یہ ہے کہ پروفیسر رضا بنیادی طور پر نعت گو ہیں۔ ایسا نعت گو جو ثنائے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام میں کھوئے رہنے ہی کو حاصل حیات سمجھتا ہے۔

زیر نظر کتاب ''قافلۂ شوق کے مسافر'' بھی نعتیہ تحقیق کے روشن سلسلے کا ایک حصہ ہے۔ یہ وہ جادہ ہے جس پر محمد اکرم رضا ایک مدت سے چل رہے ہیں۔ ایک بڑے علمی اور ادبی گھرانے کے فرد ہونے کے سبب انہیں محبتِ رسول ﷺ آغازِ شعور ہی سے عطا ہوئی۔ ذرا بڑے ہوئے تو قرطاس و قلم سے رشتہ قائم ہو گیا اور پھر نعت بھی لکھی اور نعت نگاروں کے علاوہ اوصافِ نعت پر بھی لکھا۔ جب قلم اور ذہن کو مزید پختگی عطا ہوئی تو اصحابِ ذوق نے ان کی جانب تیزی سے رجوع کیا۔ جملہ اصنافِ سخن میں ان کے ادبی نقوش ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔ راقم کو خوشی ہے کہ یہ میری منزلِ فکر کے راہی ہیں۔ کتنی ہی نعتیہ کتب ان کی توجہ اور راہنمائی سے شائع ہو چکی ہیں۔ مقدمے، دیباچے، تقریظ، فلیپ، تبصرے، شخصی اور موضوعاتی نعتیہ تحریریں، غرض ایک سیلِ نور مدحت پھیلا ہوا ہے۔ ان کی کاوشوں سے سحابِ لطفِ حضور ﷺ کے سبب بادِ خوشگوار کے چلتے رہنے کا گمان ہے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے مجھے ہمیشہ ایسی روحانی مسرت کا احساس ہوتا ہے جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے کما حقہ' بیان نہیں کیا جا سکتا۔

''قافلۂ شوق کے مسافر'' میں ڈیڑھ درجن کے قریب نعت گو شعراء کے فکری محاسن کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کی نثر پر شاعرانہ جمال کا گمان گزرتا ہے۔ نعت نگاروں پر لکھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ جیسے ان کا قلم تحقیق و تنقید کے نام پر نثری نعتیں تخلیق کر رہا ہے۔ انشائے لطیف کی احسن صورت، فقرات ڈھلے ڈھلائے، جملے یوں جیسے تسنیم و کوثر کی پاکیزگی لئے ہوئے ہیں۔ خوبصورت تراکیب و تشبیہات، الفاظ میں پھولوں کی خوشبو، کہیں مسجع مقفیٰ عبارت آرائی اور کہیں اتنے سادہ کہ سادگی پر بھی حسنِ صوت کا گمان گزرے۔ میرے بارے میں بعض حجت کرنے والے بعض اوقات شکوہ کر جاتے ہیں کہ میں مدحت نگار کے تذکرے کے لیے بہتر سے بہترین جملوں کا انتخاب کرتا ہوں اور اس کے لیے ہمیشہ بلندیوں کا تمنائی رہتا ہوں اسی بات کو میں محمد اکرم رضا کی طرف بھی لوٹانا چاہتا ہوں۔ اس کا جواب انہوں نے یہ دیا تھا کہ وصافِ رسول ﷺ کو دنیاوی اور اُخروی بلندیاں تو خدا اور مصطفےٰ ﷺ عطا کر رہے ہوتے ہیں میں تو فقط

ان کے اظہار میں گم ہو کر سامانِ بخشش ڈھونڈتا ہوں۔ عزیز مکرم محمد اکرم رضا کے اسی اظہار مدعا میں مجھے اپنا فلسفہ ''پیشوائی'' جھلکتا نظر آتا ہے۔ آیئے ہم مباحث میں اُلجھنے سے کہیں زیادہ شفاعت سرکار ﷺ کے تمنائی بننے کی آرزو کریں۔

اگر نعتیہ یا شعری تصنیف کے لیے ابتدائی تحریر مقصود ہوتی تو اب تک متعدد اشعار بطورِ مثال پیش کر چکا ہوتا مگر یہ تو تحقیقی کتاب ہے، جس کا جائزہ مصنف کے حسن تحریر کے ساتھ ساتھ تحقیقی شکوہ کو مدنظر رکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے ہم ان کی چند تنقیدی کاوشوں میں شخصیت نگاری کے خدوخال تلاش کرتے ہیں۔ ان کا پہلا مضمون حکیم الامت علامہ محمد اقبال پر ہے۔ ''اقبال ایوانِ نعت میں'' کے عنوان سے اس مضمون میں علامہ محمد اقبال کی محبتِ رسول ﷺ کے پہلو بہ پہلو ان کی نعتیہ خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔ اقبال باقاعدہ نعت گو شاعر نہیں تھے مگر ان کے نعتیہ جواہر نے فکروادب کے دامن کو ابدی دلآویزی عطا کر دی۔ محمد اکرم رضا علامہ اقبال کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''علامہ اقبال کی نعت مروجہ اسالیب سے ہٹ کر ہے۔ ''ارمغانِ حجاز'' کو چھوڑ کر ان کی کتابوں کے عنوانات بھی نعتیہ نہیں ہیں۔ وہ بطور خاص نہیں کہتے مگر نعت ان سے ہو جاتی ہے۔ وہ ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل کا تذکرہ کریں، صحابہ کرام کی قربانیوں کا ذکر چھیڑیں، مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا ماضی یاد دلائیں، توحید خداوندی کو اپنا موضوع بنائیں۔ خودی و خودداری کے اسرار بیان کریں۔ اصحاب محبت کی شاہینی اُڑان کو عنوان شاعری بنائیں۔ خاکِ حجاز کا ایمان آفریں تذکرہ چھیڑیں۔ غازیانِ اسلام کو خراجِ عقیدت پیش کریں۔ اپنی قلبی واردات پر سے پردہ اُٹھائیں یا اپنی روحانی تگ و تاز کو آشکار کریں۔ مسجد قرطبہ پر قلم اُٹھائیں یا اسلام کی عظمتِ رفتہ کا نوحہ اپنی بانگِ درا کا موضوع بنائیں۔ حق یہ ہے کہ اقبال کسی نہ کسی صورت آقائے دو عالم ﷺ کے حضور اپنی جبینِ عقیدت خم کر دیتے ہیں اور محبتِ رسول ﷺ اپنی جلوہ کاری دکھا ہی جاتی ہے۔

مولانا احمد رضا خان مبلغ اسلام اور مفسر تھے۔ بزمِ ہستی ان کے افکار سے مدتوں فیضیاب ہوتی رہے گی۔ ان کے تمام علمی اور دینی کمالات اپنی جگہ مگر ان کی بدولت نعت گوئی کی صنف کو جو مقام ملا ہے اس کا تذکرہ دنیائے عقیدت کا افتخار بنا رہے گا۔ امام احمد رضا فاضل بریلوی جیسے فرزندانِ روزگار صدیوں بعد جنم لیتے ہیں۔ ایک زمانہ ان کے مقام و مرتبہ سے آگاہ ہے۔ محمد اکرم رضا نے ان کی نعت گوئی کو دل کھول کر بیان کیا ہے اور آنے والی نسلوں پر اس عظیم نعت گو کے کمالات کو خوب خوب اُجاگر کیا ہے۔ تاریخی حقائق، اصحابِ نقد و نظر کے حوالے اور پھر اشعار کے انتخاب کی بدولت یہ مضمون اس کتاب کے جملہ مضامین میں خصوصی اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔ فاضل مصنف امام احمد رضا کے تذکرۂ نعت میں یوں قلم

بار ہیں۔

''احمد رضا خان کی نعت عشق وعقیدت کی حسین داستان ہے۔ایسی داستان کہ جس کا ایک ایک لفظ ذوق وشوق کی کیفیات سے بہرہ ور کرتا اور عنایاتِ حضوری علیہ الصلوٰۃ والسلام کا حقدار ٹھہراتا ہے۔نعت میں عشق وعقیدت کو وہی حیثیت حاصل ہے جو پھول میں خوشبو کو، خوشبو پھول کے باطنی حسن کو اُجاگر کرتی اور اس کی حقیقی پہچان بن جاتی ہے۔احمد رضا بہت بڑے محب رسول ﷺ ہیں۔یہی عشق ان کا سرمایۂ حیات ہے۔یہی ادب واحترام ان کا اثاثۂ عمل اور روحانی گداز ان کے لیے ذریعۂ نجات تھا۔''

محمد اکرم رضا نے اس تحقیقی دستاویز میں ڈیڑھ درجن کے قریب نعت گو شعراء کی فکرِ شعر وسخن کو موضوع تنقید بنایا ہے۔ان کی تنقید کا انداز قابلِ تکریم ہے کیونکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس شخصیت کو اپنی تحقیق وتنقید کا مرکز بنا رہے ہیں جس کو وصافِ رسول ﷺ ہونے کا شرف حاصل ہے۔توصیفِ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا شرف حاصل ہوتے ہی شاعر جبریل علیہ السلام کا ہمنوا ہو جاتا ہے۔وہ سیدنا حسان بن ثابتؓ کے اندازِ عقیدت کو اپنے راستے کا نور بنالیتا ہے۔انہوں نے تحقیقی نثر پارے پیش کرتے ہوئے تنقیص یا معائب ڈھونڈنے کا انداز اختیار نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ نعت گو شاعر تو معائب ومعاصی کے پُر آشوب راستوں سے بہت آگے نکل چکا ہوتا ہے۔ہاں یہ بات الگ ہے کہ تمام شعراء کی فکری سربلندی یکساں نہیں ہوتی۔تمام مدحت نگاروں کے ہاں مضامین کی یکسانیت نہیں ہوتی۔بعض تو اس راہِ پرنور پر چند قدم ہی آگے بڑھ پاتے ہیں اور بعض کے کشادہ ذہنوں پر مصحفِ ایمان کے ستارے اترنے لگتے ہیں۔بعض شعراء زبان وبیان کے لحاظ سے قدرے لرزیدہ نظر آتے ہیں اور بعض کے قدموں میں تاریخ ساز استقامت اور راہِ حق میں برق رفتاری سے آگے بڑھنے کا جذبہ نظر آتا ہے۔یہی محمد اکرم رضا کا مقصود ومنتہا ہے۔اسی بنا پر ان کو ہر نعت گو اپنی ذات سے زیادہ قابل توقیر اور بلند رُتبہ نظر آتا ہے۔

پروفیسر رضا نے درجنوں مضامین میں نعت کی تعریف کا تعین کیا ہے۔اس خوش بخت تنقید نگار پر لکھتے ہوئے بہت سے قلم پارے میری نگاہوں کی زینت بنے۔بحمد اللہ حسن معانی اور فصاحت وبلاغت کا ایک دریا ہے جو کناروں سے اُچھل رہا ہے۔جس کی زندگی مدحت نگاروں کی توصیف بیان کرتے ہوئے گزری ہو اس پر قلم قدرت کیوں مہربان نہ ہوگا اور بہترین الفاظ کیوں کر اس کا توشۂ تحریر نہ بنے ہوں گے۔نعت کی تعریف ان کے لفظوں میں ملاحظہ کیجئے۔

''نعت وہ نعمتِ خداوندی ہے جو قدرت کی طرف سے بندگانِ خاص کو عطا ہوتی ہے۔نعت صاحبِ ایمان کا سرمایۂ اعزاز اور ایک مردِ مومن کا افتخار ہے۔جب الفاظ عقیدت کا نم حاصل کرتے ہیں تو نعت ہوتی ہے۔جب تراکیب اور استعارات کو حسنِ آرزو کی چمک عطا ہوتی ہے تو نعت ہوتی ہے۔جب لفظوں

کو مرصع کاری و دیعت ہوتی ہے تو نعت ہوتی ہے۔نعت پلکوں کی جھلملاہٹ، اشکوں کی جلوہ گری اور حضور نبی کریم ﷺ سے رُوحانی وابستگی کا نام ہے۔ جس طرح محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں کیونکہ یہ نغمہ ہر ساز پر گایا نہیں جاسکتا۔اسی طرح نعتِ مصطفیٰ ﷺ کا نزول بھی ہر انسان کے قلب وفکر پر نہیں ہوتا بلکہ نعت منتخب شدہ غلامانِ رسول ﷺ کے دلوں کے مطلعِ فاران سے پھوٹتی اور ان کے احساسات کو معنبر کر جاتی ہے۔"

پروفیسر محمد اکرم رضا نے اس کتاب میں جن شعراء کی کاوش کا تنقیدی جائزہ لیا ہے ان میں سے بہت سے اس دارِ فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔اسکے ساتھ ساتھ انہوں نے عصرِ حاضر میں موجود اور نوجوان نعت گو شعراء کا جائزہ بھی پیش کیا ہے تاکہ احساس ہو سکے کہ نعتیہ تنقید کے خدوخال کسی بھی دور میں مدہم نہیں ہوئے بلکہ ہر آنے والا دور نعت اور اس کے حوالے سے نعتیہ تنقید کی روایات کو بڑی والہانہ باقاعدگی کے ساتھ آگے بڑھا رہا ہے۔دوسرے مدحت نگاروں کا تحقیقی جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر رضا نے محبت کے حوالے سے میری نعت گوئی پر تذکرہ بھی شامل اشاعت کر دیا ہے۔اپنے نام کے حوالے سے پیشوائی رقم کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوئی مگر ایک تو برادر عزیز محمد اکرم رضا کا اصرار اور دوسرے میں نے اپنے بارے میں مضمون کا ابھی تک مطالعہ نہیں کیا۔اس لیے اپنے بارے میں ان کی رائے سے بے نیاز ہو کر یہ سطور رقم کر رہا ہوں۔یہ تعارفی کلمات ہر شاعر پر ناقد کے تاثرات کو سمونے سے قاصر ہیں تاہم دو تین عزیز ومداحانِ رسول ﷺ کے بارے میں ان کی تنقیدی شگفتگی کی اختصاراً جھلک دیکھئے۔

برصغیر کے عظیم خطیب صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ کی نعت گوئی کو انہوں نے ہی دریافت کیا اور ان کی نعتیہ شاعری پر ایک معیاری کتاب مرتب کی۔ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"صاحبزادہ سید فیض الحسن ایک بہت بڑے علمی و روحانی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔گھر میں آنکھ کھولتے ہی علم وادب کا غیر معمولی چرچا دیکھا۔قدرت نے طبع موزوں عطا کی تھی اس لیے چھوٹی عمر میں ہی خوبصورت اشعار کہنے لگے۔"

عابد نظامی کے حوالے سے ان کے تاثرات دیکھئے۔

"عابد نظامی ایک راست فکر ادیب اور شاعر ہیں۔سرکار دو عالم ﷺ کی عظمت وحقانیت پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہیں۔فکری اور روحانی راہنمائی کے لیے ان کی نگاہیں ماسکو یا واشنگٹن کی طرف نہیں اُٹھتیں بلکہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ ان کی نظریاتی منازل ہیں۔"

راجہ رشید محمود کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"ان کا مدعائے عشق نگہ الطاف حضور ﷺ ہے۔ان کے تصورات تجلیات حسن حضور ﷺ سے آباد

ہیں تو احساسات سیرت مصطفےٰ ﷺ کی جلوہ افروزیوں سے جگمگا رہے ہیں۔ یہ اپنے آقا و مولا کی حیاتِ مقدسہ کے ہر پہلو کو حاصل ایمان بنائے ہوئے ہیں۔''

نظیر حسین نظیر لدھیانوی کی بزرگی اور طویل شعری سفر کو سلامِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

''صاحبو! آج انہیں دیکھ لو۔ اپنی نگاہوں میں سمیٹ لو۔ قبل اس کے کہ یہ حسین عہدِ حال پُر ملال ماضی میں تبدیل ہو جائے، نظیر لدھیانوی کی صحبت کو غنیمت جانو۔ کہیں سے آبِ بقائے دوام ڈھونڈ لو۔''

قمر یزدانی روشن ماضی کے پس منظر میں عہد حال کا اعزاز ہیں۔ ان کے لیے یہ تجزیاتی سطور دیکھئے۔

''ان کا ماضی مدحتِ رسول ﷺ کے احساس سے آباد ہے اور ان کا حال ثنائے رسول کی رفعتوں سے بہرہ ور ہے اور مستقبل کا پھوٹتا ہوا سویرا ان کی دینوی و اخروی سرخروئی کی نوید دے رہا ہے۔''

ہم نے فقط ''پیشوائی'' کے تعارفی تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے چند شعراء کے بارے میں مصنف کے قدرے طویل اور انتہائی مختصر اقتباسات پیش کیے ہیں تا کہ اندازہ لگایا جائے سکے کہ محمد اکرم رضا فصاحت کے ساتھ ساتھ بلاغت کے ہنر سے بھی کما حقہٗ آگاہ ہیں کیونکہ جملہ نثری، ادبی اور تنقیدی لوازمات کے پہلو بہ پہلو فصاحت و بلاغت ہم سفر نہ ہوں تو پھر کوئی بھی مصنف اپنے مافی الضمیر کو کہیں بھی روکنے کی قدرت سے محروم ہوتا ہے۔ بحمد اللہ ''قافلۂ شوق کے مسافر'' میں بعض شخصیات پر طویل مضامین بھی ہیں اور بعض پر مختصر بھی اور جن شخصیات کے فکر و فن پر تفصیل سے تبصرہ کیا گیا ہے وہ واقعی اس سے بھی زیادہ زبردست اور سیر حاصل خراجِ تحسین کی مستحق تھیں۔

میری دعا ہے کہ ان کی زیرِ نظر کتاب ''کاروانِ نعت کے حدی خواں'' سے بڑھ کر قبولیت و پذیرائی کی حقدار قرار پائے کیونکہ عصرِ حاضر میں نعت میں تنقیدی رویوں کو فروغ دینے کا جو شعور پیدا ہوا ہے وہ پہلے نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں دعا گو ہوں کہ انہوں نے نثر میں جو بیش بہا نعتیہ تنقیدی سرمایہ منتقل کیا ہے اس کی شایانِ شان اشاعت کا اہتمام بھی ہوتا رہے۔ چھوٹا بھائی سمجھتے ہوئے میرا ان سے یہ محبت آمیز تقاضا بھی ہے۔

بیماری کی یلغار اپنی جگہ مگر فروغِ نعت کے حوالے سے اس کتاب پر تاثراتی تحریر لکھتے ہوئے یک گونہ روحانی مسرت کا احساس ہوا ہے۔ محمد اکرم رضا سے دیرینہ تعلق خاطر اور نعتیہ رفاقت کے حوالے سے میں از خود اس خواہش کا اظہار کر رہا ہوں کہ ان کا مجموعہ نعت جلد از جلد طلوع ہو اور خدا مجھے توفیق دے کہ اس کی پیشوائی کے لیے بھی میرا قلم بارگاہِ رسول ﷺ میں عقیدتوں اور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر سکے۔

پروفیسر حفیظ تائب

......☆......☆......

شاعر مشرق علامہ محمد اقبالؒ

ایوانِ نعت میں

شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کا شمار ان عظیم فرزندانِ اسلام میں ہوتا ہے جنہیں قدرت کسی بڑے مقصد کی تکمیل کے لیے دُنیا میں بھیجتی ہے۔ اس سے عظیم مقصد اور کیا ہو سکتا تھا کہ اُنہوں نے اس وقت اپنی شاعری کے اُجالوں سے ظلمات کے طلسم کو پارا پارا کیا کہ جب ان ظلمتوں کے خاتمے کا تصور کرنا بھی محال تھا۔ فقط برصغیر ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے مسلمان استعماری قوتوں کی یلغار کے سامنے بے بس تھے۔ استعماریت کے اِس طوفان کی یلغار اس قدر وحشت انگیز اور بلاخیز تھی کہ اسلامیانِ عالم نے اپنی غلامی کو نوشتۂ تقدیر سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اقبال کا وجود صحرائے غلامی میں بھٹکنے والے درماندہ رہرووں کے لیے صورِ اسرافیل ثابت ہوا۔ یہ صورِ اسرافیل ان کی انقلاب آفریں شاعری تھی۔ وہ انقلاب آفریں شاعری جو کبھی توحید اور خودی و بے خودی کا تصور بخشتی ہے تو کبھی شاہینی پرواز کا سلیقہ بخشتی ہے، جو کبھی فقر و خودداری کے آداب سکھلاتی ہے اور کبھی خانقاہوں سے نکل کر رسمِ شبیری ادا کرنے والے مردِ مومن کے قالب میں ڈھل جانے کا پیغام دیتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اقبال کا ولولۂ تازہ ہر دلِ پُر درد کی آواز بن گیا۔ اس کا سبب وہ مؤثر لہجہ اور روحانی گداز تھا جو اسے محبتِ رسول ﷺ کے سبب عطا ہوا۔ علامہ اقبال نے محبتِ حضور کو اپنی عقیدت کا نم دیکر اس میں حدی خوانی کی تاثیر پیدا کر دی۔ وہ حدی خوانی کہ جس کی پُر درد لے کاروانِ اسلام کو سوئے حجاز گامزن کرنے کا بہانہ بن گئی۔

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے حجاز می کشم ناقۂ بے زمام را

ناقۂ بے زمام کو سوئے حجاز گامزن کرنے کے لیے اقبال نے عظمت و شانِ رسالت ﷺ کے قدسی نغمے سنائے۔ مدحت و توصیف مصطفیٰ ﷺ سے تاریک دلوں کو جگمگاہٹ عطا کر دی۔ یہ اُن کی پُرسوز نعتِ حضور ہی تھی جو ان کی انقلاب آفریں شاعری کے ہر پہلو کو آفاقیت عطا کر رہی ہے۔ اقبال کے تمام تصورات عظمتِ رسول سے جلا پاتے ہیں۔ خواہ فلسفۂ خودی و بے خودی ہو یا

فقر و شاہینی پرواز کا تخیل۔ ہر مقام پر انوارِ مصطفیٰ کی ضوباری نظر آتی ہے حتیٰ کہ توحیدِ خداوندی کے حقیقی عرفان کے لئے بھی وہ تجلیات مصطفویؐ سے قلب و جان کو جگمگانے کا پیغام دیتے ہیں۔ خدائے کریم نے محبت رسول ﷺ کو اپنی محبت قرار دے کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حاصلِ ایمان قرار دیا ہے۔ علامہ محمد اقبال کا یہ شعر حقیقت میں نعتِ مصطفیٰ کے حوالے سے نبی کریم ﷺ کو حاصلِ ایمان سمجھنے کا دیباچۂ اوّل ہے۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اُوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

علامہ اقبال کی نعت مروجہ نعتیہ اسالیب سے الگ نظر آتی ہے۔ انہوں نے نعت کا عنوان دے کر نعت نہیں کہی۔ انہوں نے مسلسل نعتیہ قصائد نہیں لکھے۔ قافیہ اور ردیف کے التزام سے نعت گوئی کو شعارِ شاعری نہیں بنایا۔ اپنے معاصر شعراء کی طرح کوئی نعتیہ دیوان اپنی یادگار نہیں چھوڑا لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری توصیفِ رسول، محبتِ محبوب خدا اور عشق سرور کائنات ﷺ سے عبارت نظر آتی ہے۔ اُردو شاعری ہو یا فارسی شاعری ہر جگہ سرور کائنات کی عقیدت اور آپ کے پیغام کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ ان کی نعت گوئی کا انداز زمانے بھر سے جدا تھا وہ تو اسلامیانِ عالم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے آئے تھے اور ان کے نزدیک یہ بیداری اس وقت تک ممکن نہیں تھی جب تک عشق حضور ﷺ کو مرکز ایمان سمجھ کر راہوارِ فکر کو اس مرکزِ ایمان کے گرد طواف کرنے پر آمادہ نہ کیا جائے یہی احساس ان کے اشعار کو عشق کی معجز نمائی کا عرفان بخشتا ہے۔ فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کی سیرت اور زندگی کا سب سے زیادہ ممتاز محبوب اور قابلِ قدر وصف جذبہ عشق رسول ﷺ ہے۔ ذات رسالتمآب ﷺ کے ساتھ انہیں جو والہانہ عقیدت تھی اس کا اظہار ان کی چشم نمناک اور دیدۂ تر سے ہوتا تھا کہ جہاں کسی نے حضور ﷺ کا نام ان کے سامنے لیا ان پر جذبات کی شدت اور رقت طاری ہو گئی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ کا نام آتے ہی اور ان کا ذکر چھڑتے ہی اقبال بے قابو ہو جاتے تھے۔"

فقیر صاحب ہی لکھتے ہیں کہ

"ڈاکٹر صاحب کا دل عشق رسول نے گداز کر رکھا تھا۔ زندگی

کے آخری زمانے میں تو یہ کیفیت اس انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ ہچکی بندھ جاتی تھی۔ آواز بھرا جاتی تھی اور کئی کئی منٹ مکمل سکوت اختیار کر لیتے تھے تاکہ اپنے جذبات پر قابو پاسکیں اور گفتگو جاری رکھ سکیں۔''

فقیر سید وحید الدین کی فیملی کو علامہ اقبال سے بہت قربت کا رشتہ بھی رہا ہے اور علامہ بھی اس خاندان کے مختلف افراد سے پیار کرتے تھے۔ فقیر وحید الدین کی تحریر ہمیں شاعرِ مشرق کے اس روحانی گداز سے آگاہ کرتی ہے جو انہیں محبتِ رسول خدا ﷺ کے سبب سے عطا ہوا تھا۔ اسی روحانی گداز نے انہیں فکری اور نظریاتی طور پر سرورِ کائنات سے بے پناہ چاہت عطا کر دی یہی چاہت ان کی مدحت طرازیوں کا اعزاز بن کر جھلکتی نظر آتی ہے۔

علامہ اقبال کی نعت مروجہ اسالیبِ نعت سے ہٹ کر ہے۔''ارمغان حجاز'' کو چھوڑ کر ان کی کتابوں کے عنوانات بھی نعتیہ نہیں ہیں وہ بطورِ خاص نعت نہیں کہتے مگر نعت ان سے ہو جاتی ہے۔ وہ ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل کا تذکرہ کریں۔ صحابہء رسول کی قربانیوں کی داستان چھیڑیں۔ عالم اسلام کے دکھوں کا ماجرا بیان کریں۔ اسلامی مبادیات کا ذکر کریں۔ مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا ماضی یاد دلائیں۔ توحیدِ خداوندی کو اپنا موضوع بنائیں۔ خودی وخودداری کے اسرار بیان کریں۔ اصحابِ ہمت کی شاہینی اڑان کو عنوانِ شاعری بنائیں۔ مردِ مومن کے اوصاف کا تذکرہ کریں۔ اسلامی تہذیب کا باطل اور غیر اسلامی تہذیبوں سے موازنہ کریں۔ عالمی دانشوروں کے افکار کا جائزہ لیں۔ خدائے کریم سے مسلمانوں کی زبوں حالی کا شکوہ کریں یا خود ہی شکوہ کا جواب بھی تحریر کریں۔ خاکِ حجاز کا ایمان آفریں فسانہ چھیڑیں۔ غازیانِ اسلام کو خراجِ عقیدت پیش کریں۔ مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا ماضی یاد دلائیں، اپنی قلبی واردات پر سے پردہ اُٹھائیں یا اپنی روحانی تگ وتاز کو آشکارا کریں۔ تہذیب مغرب کا نوحہ لکھیں یا تاریخ کے حوادث و واقعات کو قلم بند کریں۔ مسجد قرطبہ پر قلم اُٹھائیں یا اسلام کی عظمتِ رفتہ کا نوحہ اپنی بانگِ درا کا موضوع بنائیں ......حق تو یہ ہے کہ اقبال کسی نہ کسی صورت آقائے دوعالم ﷺ کے حضور اپنی جبینِ عقیدت خم کر دیتے ہیں۔ محبت رسول ﷺ اپنی جلوہ کاری دکھلا جاتی ہے۔ یہ اقبال کی دانستہ کاوش کا اثر نہیں بلکہ اس کے پس پردہ وہ جذبہء عقیدت مصطفیٰ ﷺ کارفرما ہے جو زندگی کی آخری سانسوں تک ان کے لیے شمع راہِ عمل بنا رہا۔

اقبال کی نظروں میں مقامِ رسالت کیا ہے اور حضور ﷺ کی انقلاب آفریں ذات اقبال کے احساسات کو کس طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے؟ فرماتے ہیں:

در دلِ مسلم مقامِ مصطفےٰ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ است
طور موجے از غبارِ خانہ اش
کعبہ را بیت الحرم کا شانہ اش
بوریا ممنونِ خواب را حتش
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے اُمتش
در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشمِ او محروم نوم
تابہ تختِ خسروی خوابید قوم
وقت ہیجا تیغ او آہن گداز
دیدۂ اُو اشکبار اندر نماز

علامہ اقبال کے تصورات محبت رسول سے بھرپور ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جہاں جہاں بھی دنیائے رنگ و بو آباد ہے وہ ہمیشہ نورِ مصطفوی سے فیض حاصل کرتی رہے گی۔ ایسا نہیں تو وہ ابھی مصطفیٰؐ کی تلاش میں ہے تا کہ اس مقدس اور برگزیدہ ذات سے اکتسابِ فیض کر سکے۔ علامہ کہتے ہیں:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

اقبال کی نعت گوئی بیشتر مقامات پر متفرق اشعار میں ملتی ہے مگر اس طرح کہ وہ اصل نظم سے جدا نہیں لگتی۔ چونکہ اقبال مقصدیت کے شاعر تھے انہیں قدرت نے گوناگوں صفات سے نوازا تھا۔ یہی صفات ان کے ہر پیغام کو محبت رسول کے حوالے سے دیکھنے کا سلیقہ بخشتی ہیں۔ حکیم سنائی غزنوی کے مزار پر ان کا قلم جذبات کو مقصدیت کے سانچے میں ڈھالتا ہوا یک نعت رسول ﷺ کی خوشبو لٹانے لگتا ہے:

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

''ذوق وشوق'' کا شمار علامہ اقبال کی شہرۂ آفاق منظومات میں ہوتا ہے۔ اس نظم میں اقبال جذب و مستی کی کیفیات میں ڈوب کر امتِ اسلام کو پھر سے اپنے مقصدِ حقیقی کی جانب رجوع کرنے کا پیغام دیتے ہیں۔ اقبال نے اس معروف نظم کا بیشتر حصہ فلسطین میں لکھا جب وہ ۱۹۳۱ء میں موتمر عالم اسلامی کے وفد کے ہمراہ وہاں گئے ہوئے تھے۔ اس نظم میں اقبال زبان و مکان کے تصورات پر بات کرتے ہیں۔ انہیں ہر لحظہ یہی احساس دامن گیر ہے کہ وہ پیغمبروں کی سرزمین کا نظارا کر رہے ہیں۔ اقبال اس نظم میں بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمتوں کو اس شان سے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں کہ ان اشعار کی لطافت اور معنی خیزی آج تک اہل ایمان کے قلوب و اذہان کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ وہ اپنے باطن میں ڈوب جاتے ہیں کبھی خود کلامی کا لہجہ اختیار کرتے ہیں اور کبھی حوادثِ روزگار سے نئی زندگی کا پیغام لیتے ہیں۔ ان کی چشم پھر ان غازیوں، نمازیوں اور کشور کشاؤں کی آرزو مند ہوتی ہے جن کے دم سے ہمارا ماضی درخشندہ تھا اور جن کا وجود آج بھی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا پیغام دے سکتا ہے۔ تمام نظم میں اقبال کے ذوق وشوق کا محور ذاتِ سرورِ کونین ﷺ رہی ہے اور وہ پکار اُٹھتے ہیں:

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو عشق حضور و اضطراب

نعت و توصیفِ مصطفیٰ ﷺ کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہوتا جب تک مدحت نگار اپنے ممدوح کے مقام و مرتبہ سے آگاہ نہ ہو۔ یہاں تو وہ ذاتِ والا صفات ممدوح ہے جو محبوبِ خدا بھی

ہے اور محبوب دو عالم بھی۔ دو عالم جس کی خوشنودی کے لیے تخلیق کیے گئے، جو جانِ بزم کائنات ہے، جس کی خاطر بزم ہستی سجائی گئی، جس کے لیے بزمِ کون و مکاں جگمگائی گئی، جس کے لیے چاند ستاروں کی چادر بچھائی گئی، جس کے لیے رنگ و بو کی خیرات لٹائی گئی۔ علامہ اقبال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقام و مرتبہ سے بخوبی آگاہ ہی نہیں بلکہ انہیں تو عشق حضور کی دولت اپنے والد گرامی سے میراث میں ملی ہے۔ یہی عشق رسول تھا جس نے یورپ کی فضاؤں میں بھی انہیں تہذیب یورپ کی چکاچوند سے محفوظ رکھا بلکہ کفر کی چکاچوند ان کے عشق و عقیدت کے اثاثے کو مزید دلآویزی بخش گئی۔ اسی لیے کہتے ہیں:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

خاکِ مدینہ کا سرمہ ان کی چشم بصیرت کو حیرت انگیز قوت نظارا عطا کرنے کا باعث بن گیا چونکہ آپ کی شاعری انقلابی تھی۔ یہ انقلاب کسی باطل نظریئے کی کوکھ سے پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ اس انقلاب نے تعلیمات حضور سے جنم لیا تھا یہی وجہ ہے کہ آپ کا تمام تر فلسفہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیغام پر مبنی ہے۔ آپ جہاں مقاماتِ مصطفیٰ ﷺ کی تجلیات سے اہلِ ایمان کے دلوں کو ضوبار کرتے ہیں وہاں اس پیغام کو فراموش نہیں ہونے دیتے جو محبتِ رسول کے سبب سے جنم لیتا ہے۔ ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' علامہ اقبال کی معرکۃ الآراء نظمیں ہیں۔ ''جواب شکوہ'' کے اختتام میں تمثیلی انداز میں زبانِ قدرت سے عشاقِ حضور کو پیغام دیتے ہیں۔ اس پیغام میں شانِ رسول ﷺ کی جلوہ گری کا کمال دکھائی دیتا ہے کہ اے امتِ اسلام محبوب دو عالم کی غلامی کر لو کہ اسی میں فلاحِ دارین ہے اور اس میں تمہارے مسائل کا حل ہے:

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں دامان کہسار میں میدان میں ہے
بحر میں، موج کی آغوش میں طوفان میں ہے

111278

چین کے شہر مراکش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے
چشمِ اقوام یہ نظارا ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رَفَعنا لک ذِکرک دیکھے
عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اسی طرح اقبال ''رموزِ بے خودی'' کے آخر میں ۶۵ اشعار میں ''عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمین'' کے عنوان سے ماجرائے عقیدت نذر کرتے ہیں۔ ان اشعار میں وہ محبوب خدا کی عظمتوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ مسلمان کو حق اور باطل کی پہچان عطا کرا دیجئے۔ اپنی مقدس دیوار کے سائے میں مجھے مرقد عطا کیجئے تا کہ اس مقدس سرزمین میں پہنچ کر میرے بے تاب دل کو چین نصیب ہو جائے اور آپ کے سایۂ رحمت میں آنے کے بعد میں آسمان سے اکڑ کر کہہ سکوں گا کہ دیکھ میرا عظیم انجام دیکھ۔ میری یہ بلند اقبالی اور خوش بختی بھی دیکھو:

اے ظہور تو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیر خوابِ زندگی
اے زمیں از بار گاہت ارجمند
آسماں از بوسہ بامت ارجمند
اے بصیری را ردا بخشندۂ
بربطِ سلمٰی مرا بخشندۂ
ہست شانِ رحمت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز
کوکبم را دیدۂ بیدار بخش
مرقدے در سایۂ دیوار بخش

تا بیا ساید دل بے تابِ من
بستگی پیدا کند سیمابِ من
با فلک گویم کہ آرا مم نگر
دیدہ . آغازم انجام نگر

علامہ اقبال نے بعض تاریخی واقعات کو اس حسن تاثر کے ساتھ منظوم کیا ہے کہ عظمتِ رسولِ خدا ﷺ خود بخود ہویدا ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس ضمن میں آپ کی معروف نظم ''بلال'' اپنی جگہ نعت کی کیفیات نور کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ نعت کیا؟ عظمتِ مصطفیٰ ؐ کا اظہار ہے۔ قلم اقبال کا ہے مگر زبان بلال ؓ کی ہے۔ وہ بلال جو سرزمینِ حبش سے امیہ بن خلف کا غلام بن کر مکہ میں آیا۔ قبولیتِ اسلام کی پاداش میں اس پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی مگر یہی بلال ؓ جب سرورِ کائنات کی غلامی کے حلقے میں آتا ہے تو اس کی غلامی پر زمانے بھر کی آزادیاں تصدق ہونے لگتی ہیں۔ اقبال کا معجز رقم قلم بلال ؓ کی شانِ اسلامی کے پسِ پردہ آقائے دو عالم ﷺ کو کس طور خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

چمک اُٹھا جو ستارا ترے مقدر کا
حبش سے تجھ کو اُٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی ہے اس سے ترے غمکدے کی آبادی
تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کے لیے
کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لیے
مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا
ترے لیے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا
ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری
کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی
نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی
خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

نعت صرف لفظوں کی جادوگری یا الفاظ کی ساحری نہیں، نہ ہی لفظ مصرعوں کے روایتی شکوہ سے جنم نہیں لیتی، یہ محض اشعار کے ظاہری محاسن سے عبارت نہیں ہے بلکہ نعت تو لذت عشق حضور عطا کرتی ہے۔ اگر عشق کی لذت نصیب نہ ہو تو نعت کیسی؟ اگر محبت کا گداز میسر نہ ہو تو نعت کیسی؟ اگر نالۂ شوریدہ سر سینہ چاک نہ کر دے تو نعت کیسی؟ اس تناظر میں ''جنگ یرموک کا ایک واقعہ'' محض واقعاتی حسن کا آئینہ دار نہیں بلکہ جوں جوں یہ نعتیہ نظم آگے بڑھتی ہے آنکھیں نمناک ہونے لگتی ہیں۔ سوزِ دروں احساسات کے خلوت کدوں کو درہم برہم کرنے لگتا ہے۔ مکالماتی انداز ہے مگر کمال کا اظہارِ عقیدت ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب جوانانِ اسلام عساکرِ کفر کے خلاف صف بستہ تھے تو ایک شہادت کا متمنی مردِ مسلمان، سپہ سالار حضرت ابو عبیدہؓ سے رخصت کا طلب گار ہو کر یوں گویا ہوا:

جاتا ہوں میں حضور رسالت پناہ میں
''لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام''
بولا امیر فوج کہ وہ نوجواں کہے تو
پیروں پہ تیرے عشق کا لازم ہے احترام
پوری کرے خدائے محمد ﷺ تری مراد
کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام
پہنچے جو بارگاہ رسولِ امیں میں تو
کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام
ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے کیے جو وعدے کیے تھے حضور نے

جس دور میں علامہ اقبال کی شاعری عالمِ اسلام کو بیداریٔ حیات کا پیغام دے رہی تھی، وہ وقت مسلمانوں پہ بے حد کٹھن تھا۔ کوئی بھی اسلامی ملک صحیح معنوں میں آزاد نہیں تھا۔ باطل قوتیں عظمت اسلام کے لٹنے کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ وہ شیر جس نے صحرا سے نکل کر روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا اب بزدلی اور مصلحت کی کچھاروں میں پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ زمانہ ہنس رہا تھا کہ کیا یہ وہی مسلمان ہے جس کے نام کی ہیبت سے روما و ایران کی سلطنتیں لرز جایا کرتی تھیں؟ ایک طرف تو بے حسی اور قومی بے غیرتی اپنی انتہا پر تھی اور دوسری طرف مسلمان احساسِ زیاں سے بھی عاری نظر آتے تھے۔ احساس زیاں سے عاری ہونے کا المیہ اقبال کو زیادہ مضطرب کیے ہوئے تھا۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اقبال جانتے تھے کہ اگر احساسِ زیاں موجود ہو تو منزل کو ترقی میں، ذلت کو عزت میں، پستی کو بلندی میں اور غلامی کو آزادی میں بدلا جا سکتا ہے مگر احساسِ زیاں سے محرومی آزاد قوموں کی رگوں سے حمیت کا جذبہ چھین لیتی ہے۔ اسی اضطراب اور بے چینی میں اقبال اس آقائے رحمۃ للعالمین ﷺ کی درگاہِ بے کس نواز کی جانب رجوع کرتے ہیں جہاں سے غم کے ماروں کو قرار اور بے یقین کو یقین کی دولت عطا ہوتی ہے۔ جہاں ماجرائے غم عرض کرنے کا مقصد رحمت حضور کے بحرِ بے کراں کو جوش میں لانا ہے۔ ان سے قبل کئی شعراء اپنے اپنے ادوار میں رنج والم کی داستانیں سلطانِ دو عالم کو سنا کر مداوائے الم کے لیے شعری عرضداشتیں پیش کر چکے تھے۔ الطاف حسین حالی کی طرح:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دُعا ہے
اُمت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے

امتِ اسلام پر جو کڑا وقت آن پڑا تھا اس نے اقبال کا آرام و سکون لوٹ لیا تھا۔ اُردو اور فارسی منظومات، قطعات اور متفرق اشعار میں وہ اپنی ملتجی نگاہیں گنبدِ خضریٰ کی طلعت باریوں پر جما دیتے ہیں، اس احساس کے ساتھ کہ یہی وہ آخری ڈھارس ہے جو طوفانِ غلامی میں بہنے والوں کو سکون و عافیت کا کنارا عطا کرے گی۔ اقبال کہتے ہیں کہ مجھے فرشتے بزمِ رسالت ؐ میں لے گئے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ اے باغِ جہاں سے پرواز کر کے مجھ تک آنے والے امتی تو ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کر آیا ہے تو اقبال بصد احترام عرض کرتے ہیں:

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو ایک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

بارگاہِ حضور ﷺ میں استغاثہ، امتِ اسلام کے حوالے سے مزید کچھ اشعار نذر قارئین ہیں:

کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری
اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام میرا
قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

....

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی، مرا ایمان زناری

....

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے
وہ لذت آشوب نہیں بحرِ عرب میں
پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد
اس کوہ و بیاباں سے حدی خوان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے رُوح محمد ﷺ
آیات الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

نعت نام ہے عظمت و مقاماتِ حضور ﷺ سے وابستگی کا۔ محبوب کامل سے محبت کا اکمال بھی ہے کہ اس کی سیرت اور اُسوۂ حسنہ کو ہر پہلو سے قبول کیا جائے۔ علامہ اقبال کے زمانے میں کانگریس کے ہمنوا علماء نے اپنے کانگریسی دوستوں کی محبت میں نعرہ لگایا کہ ''قومیں مذہب سے نہیں بلکہ اوطان سے بنتی ہیں۔'' یہ نظریہ سراسر تعلیمات مصطفوی کے خلاف تھا۔ برصغیر میں محمد بن قاسم کی امداد دوقومی نظریہ اسلام کے لیے تھی۔ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، مجدد الف ثانیؒ اور شیخ احمد سرہندی کی تعلیمات کا مرکز یہی نظریہ اسلام تھا کہ قومیں اوطان سے نہیں بلکہ مذہب سے بنتی ہیں۔ اس آزمائش کے وقت میں اقبال نے عشقِ رسول ﷺ کا حق ادا کیا اور اپنی منظومات اور خطبات کے ذریعہ واضح کیا کہ اگر دوقومی نظریہ اسلام کو فراموش کر دیا جائے تو ہمارے پاس ہندو اور انگریز کے خلاف میدانِ عمل میں آنے اور ایک مسلم ریاست کو قائم کرنے کا کیا جواز رہتا ہے؟ اقبال کی دوقومی نظریہ کے حوالے سے اس نظریہ کے دشمنوں اور مخالفین کے خلاف معرکہ آرائی کو ان

کے جذبۂ عشق رسول سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا کیونکہ وہ تو اس نظریہ کی بنیاد ہی محبتِ رسول کو قرار دیتے ہیں:

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

ایک جگہ کہتے ہیں:

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیں ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفویؐ! خاک میں اس بت کو ملا دے

درج ذیل دو اشعار محبتِ رسول کے حوالے سے دو قومی نظریہ کی کیا خوب وضاحت کر رہے ہیں:

سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبر زِ مقامِ محمد ﷺ عربی است
بمصطفیؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو• نہ رسیدی تمام بولہبی است
عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
زِ دیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

ان تمام تصورات کے پس پردہ یہ عقیدہ کارفرما تھا۔

یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو
وصالِ مصطفوی ، افتراق بولہبی
نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمد ﷺ عربی سے ہے عالمِ عربی

ارمغانِ حجاز میں سب سے پہلے جو رباعیاں اور قطعات ہیں انکا عنوان ہے ''حضورِ حق''۔ ان میں دو رباعیاں حضور ﷺ سے جس عقیدت کا اظہار کرتی ہیں وہ بے مثال ہے۔ ایک رباعی میں فرماتے ہیں ''جب یہ عالم اختتام کو پہنچے اور ہر پوشیدہ چیز آشکار ہو جائے اور اعمال کی باز پرس ہونے لگے تو اے رب العزت ہمارے اعمال بد کی پرسش آپ ﷺ کی نظروں سے چھپا کر کیجئے تا کہ آپ ہم عاصیوں کو دیکھ کر پرملال نہ ہوں:

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہ ما را
حسابِ من زِ چشمِ اُو نہاں گیر

اسی طرح اگلی رباعی میں عجب ذوق وشوق کا مظاہرہ کرتے ہیں حضورِ حق میں کہتے ہیں کہ جسم تو یہاں مکہ میں پڑا ہے اور رُوح بے تاب وقرار ہے۔ اس شہرِ پاک کی آرزو میں کہ بطحا (مکہ) بھی جس کی راہ میں ایک منزل ہے تو اے خدا! تو یہیں بے شک مکے میں رہ (کہ تیرا گھر یہی ہے) اور اپنے دوستوں کو قرب کی منزل سے نواز مگر مجھے تو منزلِ دوست (مدینے) پہنچنے کی آرزو ہے مجھ سے یہاں اور زیادہ توقف ممکن نہیں ہے:

بدن وا ماند و جانم در تگ و پوست
سوئے شہرے کہ بطحا در رہِ اوست
تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

ایک اور مقام پر دیکھئے کہ خودی کی خلوت وجلوت کا تصور اجاگر کرتے ہوئے اپنے آقا سے عقیدت کو واضح کرتے ہیں:

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

یہ فطری امر ہے کہ محبوب سے محبت کے سبب سے اس کی ہر چیز عزیز ہوتی ہے اور خاص طور پر محبوب جس زمین میں جلوہ فرما ہوتے ہیں اس کی عظمت کے کیا کہنے۔ چاہنے والے کے لیے تو قیام گاہِ محبوب زمانے بھر سے اعلیٰ مقام رکھتی ہے:

خاکِ یثرب از دوعالم خوشتر است
آں خنک شہرے کہ در وے دلبر است

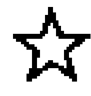
اقبال کے لیے سرزمین طیبہ عشق وعقیدت کی سرزمین ہے۔ جہاں کے ذرے ذرے سے انوارِالٰہی کا ظہور ہو رہا ہے۔ جہاں کی فضائیں سرورِ کائنات ﷺ کی خوشبوئے دل نواز لیے ہوئے ہیں۔ اس سرزمین پر وہ خواب گاہِ مصطفیٰ ؐ ہے کہ جس کا فرشتے بھی طواف کرتے ہیں۔ جہاں پہنچ کر جنیدؒ و بایزیدؒ نفس گم کردہ ہو جاتے ہیں۔ مدینہ جو اہل نظر کے لیے لطف ورحمت کا خزینہ ہے اور انوارِفطرت کا گنجینہ ہے۔ نعت گوشعراء نے مدینہ طیبہ کی تجلیات کو دلوں میں سمو کر اس عظیم ترین شہر کو بہترین لفظوں میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ علامہ اقبال بھی جب اس شہرِ آرزو کا تصور کرتے ہیں تو ان کی کیفیت ہی بدل جاتی ہے۔ اقبال کے اولین سیرت نگار ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی کہتے ہیں:

> ''یورپ سے واپسی پر آپ کے تاثرات نے ''بلادِ اسلامیہ'' مشہور نظم میں ظہور کیا۔ آپ اسلامی شان وشکوہ دولت واقبال، عظمت وشوکت کے ان روشن اور تابناک مرکزی مقامات کو یاد کرتے ہیں اور حسرت وافسوس سے مسلمانوں کے عظمت وجلالِ گذشتہ کا ذکر کرتے ہیں جن کا ظہور دہلی، بغداد، قرطبہ، قسطنطنیہ جیسے عظیم مرکزوں سے صدیوں تک ہوتا رہا اور جو سارے عالم کے لیے علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا خزانہ اور سرچشمہ بنے رہے مگر یہ تمام عظمت وشوکت کے مینار ''خواب گاہِ مصطفیٰؐ'' کے تقدس اور جلال پر قربان ہیں۔''

اس نظم کے آخری بند میں اقبال مدینہ طیبہ کی طلعتوں اور تجلیات کو جس طور خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اس سے محبت رسول کی نئی امنگ دل وجان میں جلوہ گر ہونے لگتی ہے اور عظمت حضور ﷺ سے اسلام کی شوکتِ رفتہ کا تصور ایک نئے انداز سے جلوہ گر ہونے لگتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

وہ زمیں ہے تو مگر اے خواب گاہِ مصطفیٰؐ
دید ہے کعبے کو تیری حجِ اکبر سے سوا
خاتمِ ہستی ہے تو تاباں ہے مانندِ نگیں
اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں

تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی
جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی



نام لیوا جس کے شاہنشاہ عالم کے ہوئے
جانشیں قیصر کے، وارث مسندِ جم کے ہوئے
آہ یثرب دیس ہے مسلم کا تو ماوا ہے تو
نقطہ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو
جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہر شبنم بھی ہیں

کہتے ہیں کہ خوشبو کو دیکھ کر پھول کی دلآ ویزی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کرنیں چاند کی تجلیات اور شعاعیں سورج کی ہمہ گیری کا اظہار ہوتی ہیں۔ اسی طرح محبِ صادق کی طلب صادق، جذبۂ ایثار، قربانی واستقامت اور عشق میں والہانہ پن کو دیکھ کر محبوب کے حسن کی جاذبیت اور تاثر انگیزی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اقبال کا محبوب تو محبوبِ خداو ملائکہ ہے۔ یہ وہ محبوب ہے جس کی خاطر کونین تخلیق ہوئے۔ اسی محبوب دو عالم محمد مصطفیٰ ﷺ کے عشاق اور جانثاروں کو دیکھ کر آپ کی عظمت وتقدیس کا اندازہ ہوتا ہے۔ علامہ اقبال ''غزوہ تبوک'' کا ذکر کرتے ہیں اور حب رسول میں ڈوب جانے والے دوسرے عشاق کے پہلو بہ پہلو عظیم جانثارِ رسول سیدنا صدیق اکبرؓ کا ذکر جس دلآ ویز انداز سے کرتے ہیں اس سے سلطانِ مدینہ کی کشش اور تاثر انگیزی کا حیرت انگیز حد تک خوبصورت اندازہ ہوتا ہے۔ غزوۂ تبوک میں مسلمانوں کے پاس ساز وسامان تھا اور نہ ہی ہتھیار، جنگ ناگزیر تھی۔ سلطانِ مدینہ ﷺ نے امداد کی اپیل کی تو مخیرّ صحابہ اپنا اپنا اثاثہ لے کر بارگاہِ رسول ﷺ میں حاضر ہونے لگے۔ اس نظم کے اختتامی اشعار دیکھیے:

اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آ گیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار
بولے حضورؐ ''چاہیے فکرِ عیال بھی''
کہنے لگا وہ عشق و محبت کا رازدار
''اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولﷺ بس"

اقبال کی متفرق منظومات سے چند نعتیہ اشعار۔ ان منظومات میں سے کسی کا عنوان بھی "نعت" نہیں ہے مگر ہر شعر اپنے اندر بے شمار نعتیہ مضامین کو سموئے ہوئے ہے:

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

....

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبال
اڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے

....

اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

....

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدﷺ سے اُجالا کر دے

....

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفٰی عقل تمام بولہب

محبتِ رسول تقاضا کرتی ہے کہ جس سے محبت کی جائے اس کی کامل اتباع کی جائے۔ محبت صرف لفظی ساحری نہیں ہے۔ یہ محض ایک خوشنما لفظ نہیں ہے بلکہ اس کے پس پردہ ایک مکمل فلسفۂ اطاعت پوشیدہ ہے۔ رب کریم نے اپنے محبوبﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ

من یُطِع الرسول فقد اطاع اللّٰہ

یعنی جس نے اللہ کے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی۔

علامہ اقبال بھی اس حوالے سے نبی کریمﷺ کی غیر مشروط فکری، علمی، نظری اور عملی اطاعت اور اتباع کے قائل ہیں۔ آپ بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ کامل اتباع کے بغیر ملت اسلامیہ کے غموں کا علاج ممکن نہیں۔ اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ترقی کی آرزو ہے تو خدا سے لو لگا کر محمد مصطفٰیﷺ کے راہِ مستقیم پر گامزن ہو جاؤ پھر تمہیں وہ عروج ملے گا جس کا تصور بھی

محال ہے۔

بمنزل کوش مانندِ مہ نو
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو
مقامِ خویش اگر خواہی دریں دہر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رو

وہ اس ضمن میں حضرت بایزید بسطامیؒ کی مثال دیتے ہیں کہ ان کی اتباعِ رسولؐ اور تقلیدِ نبوی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ساری عمر محض اس لیے خربوزہ نہ کھایا کہ انہیں معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ رسولِ خدا ﷺ نے خربوزہ کس طرح کھایا تھا۔

کاملِ بسطام در تقلید فرد
اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد
عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار
تا کمند تو شود یزداں شکار

اسی طرح آپ ایک غزوہ میں حاتم طائی کی بیٹی کے قید ہونے اور حضور نبی کریم ﷺ کا ان کے سر پر ردائے رحمت رکھنے کا پیغام دے کر فرزندانِ اسلام کو اس حوالے سے اطاعت مصطفیٰؐ کا دل نشیں سبق دیتے ہیں۔

در مصافے پیش آں گردوں سریر
دخترِ سردارِ طے آمد اسیر
پائے در زنجیر و ہم بے پردہ بود
گردن از شرمِ حیا خم کردہ بود
دخترک را چوں نبی بے پردہ دید
چادرِ خود پیشِ رُوئے اُو کشید
ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم
پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم
روزِ محشر اعتبارِ ماست اُو
در جہاں ہم پردہ دارِ ماست اُو

یہ سوال ہر صاحبِ نظر کے لبوں پر ابھرتا ہے وہ اقبال جو تمام زندگی عشقِ مصطفیٰ ﷺ کے

آداب سکھاتا رہا، وہ اقبال جس کی شاعری کاروانِ اسلام کو منزلِ حجاز کی جانب گامزن کرتی رہی، وہ اقبال جس کے شب و روز محبتِ رسولؐ کے تذکار سے عبارت تھے۔ وہ اقبال جو محبتِ رسول کے حوالے سے کسی سمجھوتے یا قیل و قال کا قائل نہ تھا۔ وہ اقبال کہ جس کی حضورﷺ سے محبت کسی جواز یا دلیل کی محتاج نہیں تھی جو حضور کے نام پر جیتا رہا اور آخری دم تک محبتِ رسول کے سرمدی نغموں سے سرمست ہی نہیں رہا بلکہ ایک زمانے کو سرمستی کے آداب سکھاتا رہا...... وہ اقبال بارگاہِ رسول میں حاضری سے کیوں محروم رہا؟

مختلف تذکرہ نگاروں نے اس کی کئی وجوہات لکھی ہیں۔ کسی نے کہا کہ وہ نغمۂ عشق کی لَے کو تیز سے تیز تر کرتے گئے اور اسی میں زندگی بیت گئی۔ کسی نے لکھا کہ جب وہ گول میز کانفرنسوں کے سلسلہ میں باہر جاتے ہوئے فلسطین سے بھی گزرے تو خیال آیا کہ حجازِ مقدس کا سفر بطورِ خاص ہونا چاہیے۔ کسی اور سفر کو اس سفر کے لیے وسیلہ نہیں بنانا چاہیے۔ ایک صاحبِ ذوق نے لکھا کہ ان کا عشقِ رسولؐ اس مقام کو پہنچا ہوا تھا کہ اگر وہ وہاں پہنچ جاتے تو پھر وہیں جان دے دیتے۔ ایک اور صاحبِ عشق نے کہا کہ اقبال کی مجبوری ایک زمانے کو لذتِ بخشنے کا بہانہ بن گئی۔ سب کی تاویلات اپنی جگہ بہرحال یہ امر انتہائی مسلمہ اور طے شدہ ہے کہ اقبال کا عشقِ رسولؐ اصحابِ نظر کی آبرو اور اہلِ شوق کے لیے حاصلِ جستجو تھا۔ فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں:

> "جب ڈاکٹر صاحب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے واپس آئے تو والد صاحب مرحوم ان سے ملنے گئے۔ بڑی مدت بعد ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی تھی اس لیے بڑے تپاک سے ملے اور ڈاکٹر صاحب سے ان کے سفر کے تجربات کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ والد صاحب مرحوم نے اثنائے گفتگو میں کہا "اقبال! اگر تم یورپ ہو آئے، مصر اور فلسطین کی بھی سیر کی، کیا اچھا ہوتا کہ واپسی پر روضۂ اطہر کی زیارت سے بھی آنکھیں نورانی کر لیتے۔" یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ چہرے پر زردی چھا گئی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چند لمحے تک یہی کیفیت رہی پھر کہنے لگے فقیر! میں کس منہ سے روضۂ اطہر پر حاضر ہوتا۔"

مرزا جلال الدین بیرسٹر لکھتے ہیں:

> "حضرت علامہ کی طبیعت کا یہ سوز و گداز عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا اور عشقِ رسولؐ میں ان کی سرشاری اور استغراق کمال کے درجے

پر جا پہنچا۔ آخر میں تو یہ حال ہو گیا تھا کہ ذرا حضورؐ کا نام کسی کی زبان پر آیا اور آپ کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ اسی طرح آپ کو فریضۂ حج کی ادائیگی اور روضۂ مبارک کی زیارت کی شدید آرزو تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی جاتی تھی۔ آخر زمانے میں بیماریوں اور ضعف کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل ہو گیا تھا مگر اس وقت بھی یہی لگن تھی کہ شاید طاقت عود کر آئے اور مجھے یہ مقدس سفر نصیب ہو جائے۔''

میر غلام بھیک نیرنگ تحریر فرماتے ہیں:

''اقبال کا قلبی تعلق حضور سرورِ کائناتؐ کی ذاتِ قدسی صفات سے اس قدر نازک تھا کہ حضور کا ذکر آتے ہی ان کی حالت دگرگوں ہو جاتی تھی اگرچہ وہ فوراً ضبط کر لیتے تھے۔ چونکہ میں بارہا ان کی یہ کیفیت دیکھ چکا تھا اس لیے میں نے ان کے سامنے تو کچھ نہیں کہا مگر خاص لوگوں سے بطورِ راز ضرور کہا کہ یہ اگر حضور پاک کے مرقد پر حاضر ہوں گے تو زندہ واپس نہیں آئیں گے۔ وہیں جاں بحق ہو جائیں گے۔ میرا اندازہ یہی تھا اللہ بہتر جانتا ہے۔''

علامہ محمد اقبال دسمبر ۱۹۳۷ء کے ایک خط میں حضرت علامہ مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ کو لکھتے ہیں:

''الحمدللہ کہ آپ خیریت سے ہیں اور حج کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ خدا تعالیٰ آپ کو یہ سفر مبارک کرے اور اس کے فرشتوں کی رحمتیں آپ کے شریک حال ہوں۔ کاش کہ میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتا اور آپ کی صحبت کی برکت سے مستفیض ہوتا لیکن افسوس ہے کہ جدائی کے ایام ابھی کچھ باقی معلوم ہوتے ہیں۔ میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ حضور ﷺ کے روضۂ مبارک پر یاد بھی کیا جاؤں تاہم حضور ﷺ کے اس ارشاد سے جرأت ہوتی ہے کہ فرمایا ''الطالعون لی'' (گنہگار میرے لیے ہیں) امید ہے کہ آپ اس دربار میں پہنچ کر مجھے فراموش نہیں کریں گے۔''

یہ تمام اقتباسات اس حقیقت کی گواہی ہیں کہ اقبال محبتِ رسولؐ میں دیوانہ وار تڑپ رہے

ہیں۔ان کے تخیلات اور تصورات کی دنیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جلوؤں سے آباد ہے۔ان کے افکار کا مرکز اوران کے احساسات کا معدن حبّ رسول ہے۔یہی محبتِ رسولؐ ان سے زندگی بھر عشق وعقیدت کا خراج لیتی رہی۔ان کی شبوں کا گداز،ان کی صبحوں کا نیاز،ان کی شاعرانہ تگ و تاز ان کی عاشقانہ جذباتیت سب کے پس پردہ سلطانِ مدینہ ﷺ کی چاہت جلوہ ریز نظر آتی ہے۔ان کی نظم ''ذوق وشوق'' کا انداز اس امر کی علامت تھا کہ وہ خود کو دربارِ رسولؐ میں حاضری کے لیے تیار کر رہے ہیں۔اقبال جسمانی طور پر تو دیارِ مصطفی ﷺ میں حاضر نہ ہو سکے مگر زندگی کے آخری دور میں انہوں نے ''ارمغانِ حجاز'' کی دنیا آباد کر لی۔انہوں نے تصورات کے دوش پر سفر کرتے ہوئے مدینہ طیبہ کی حاضری کا عزم کر لیا۔

یہ عجیب سفر نور تھا کہ اقبال کا جسم تو لاہور میں تھا مگر ان کے تخیلات شہرِ مدینہ کی جانب رواں دواں تھے۔انہوں نے اپنے عشق وعقیدت کے سہارے تصورات کی دنیا آباد کر کے اس طور سفر کا آغاز کیا کہ اگر کوئی حقیقتِ حال سے آگاہ نہ ہو تو اسے خبر ہی نہیں ہوتی کہ اقبال کا یہ سفر جسمانی نہیں بلکہ سراسر روحانی تھا۔انہوں نے روحانی طور پر خود کو مسافر مدینہ اور زیارت کے لیے شدت کے ساتھ تڑپنے والا زائر تصور کر کے اُن تمام تراکیب،استعارات،اشارات،جذباتی تڑپ،والہانہ کسک،بے تابی و بے قراری،مدہوشی وسرشاری،فکری لگن،روحانی لگاؤ اور والہانہ پن سے کام لیا ہے جو ایک مسافر پر شوق کا خاصہ ہوتی ہیں۔قاری جوں جوں اقبال کا ہمنوا اور فکری طور پر ہمسفر بن کر آگے بڑھتا ہے اقبال جیسی بے قراری اس پر بھی طاری ہونے لگتی ہے۔

''ارمغانِ حجاز'' آپ کی آخری تصنیف ہے جو آپ کی وفات کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی تھی۔اس میں صفحات ۲۵ سے ۷۶ تک جو رباعیات اور قطعات درج ہیں۔ان کا عنوان ہے ''حضور رسالتؐ''۔اقبال اپنی داستانِ شوق کا آغاز کرتے ہیں کہ بڑھاپے اور ضعف کے عالم میں،مَیں نے مدینہ کا سفر اختیار کیا ہے۔میں اس پرندے کی طرح ہوں جو شام کے وقت صحرا میں اپنے گھونسلے میں اترنے کے لیے اپنے پروں کو کھولتا ہے:

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرودِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام
کشاید پر بہ فکر آشیانہ

ایک بند میں اپنے نغمات اور نالوں کے مقامات کا ذکر کرتے ہیں۔میں نے صحرا میں ڈیرا

جمایا ہے تاکہ خلوت کو آباد کر کے اکیلا ہی سلطانِ دوعالم کی مدح سرائی کیا کروں۔

چہ پرسی از مقاماتِ نوایم
ندیماں کم شناسد از کجایم
کشادم رختِ خود را اندریں دشت
کہ اندر خلوتش تنہا سرایم

اب صحرا کی تعریف کرتے ہیں کہ کیا خوبصورت صحرا ہے کہ درود و سلام کے نغمات پیش کئے جارہے ہیں۔ اس صحرا کی گرم گرم ریت پر جبینیں ٹکادو تاکہ یہ سجدے تمہاری پیشانیوں کا اعزاز بن جائیں۔

چہ خوش صحرا کہ در دے کارواں ہا
درودے خواند و محمل براند
بہ رنگِ گرمِ اُو آمد سجودے
جبیں را سوز تا داغ بماند

جوں جوں اقبال کا راہوارِ تخیل سرزمینِ حجاز کی طرف آگے کو بڑھتا ہے نعت کی لے تیز سے تیز تر ہونے لگتی ہے۔ بدن لرزیدہ اور قدم لغزیدہ ہونے لگتا ہے۔ ہر لحہ احترامِ حضور ﷺ دلوں میں اجاگر ہونے لگتا ہے کہ میں کدھر کو جارہا ہوں۔ یہاں تو ملائک بھی خمیدہ سر حاضر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ عرفی شیرازی نے کہا ہے:

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را

اسی کیفیت کو امام احمد رضا خاں یوں بیان کرتے ہیں۔

حرم کی زمیں اور قدم رکھ کے چلنا
ارے سر کا موقع ہے او جانے والے

اقبال بھی اپنے ناقہ سے احتیاط سے قدم آگے کو بڑھانے کو کہتے ہیں کہ اے ناقہ اپنے سوار کی حالت کو مدنظر رکھ اور اس کے اندر احترام و عقیدت کا جو سمندر موجزن ہے اس کو اپنی رُوح میں سمو کر آگے بڑھ۔

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو
کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است

قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی
بپائش ریگِ ایں صحرا حریر است

یہی مضمونِ عقیدت اس رباعی میں بھی نئے انداز سے جلوہ گر ہے۔

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خند است
شبش کوتاہ و روزِ او بلند است
قدم اے راہرو آہستہ تر نہ
چو ماہر ذرۂ او دردمند است

اقبال خود پر غور کرتے ہیں اور امیر کارواں سے اپنے بارے میں پوچھتے ہیں کہ یہ عجمی کون ہے؟ یہ عربی نہ ہو کر بھی اپنے شاداب نغمات سے دلوں کو زندگی کی طراوت عطا کر رہا ہے۔

امیر کاروں آں اعجمی کیست
سرودِ اُو بآہنگِ عرب نیست
زند آں نغمہ کز سیرابیء او
خنک دل در بیابانے تواں زیست

اقبال کہتے ہیں کہ اے ساتھی آ تا کہ ہم دونوں باہم آہ وزاری کریں۔ ہم دونوں کسی کے جمالِ جہاں آرا کے طلب گار ہیں۔ آ کہ ہم دونوں اپنے آقا و مولا کے قدموں سے اپنی آنکھیں ملیں اور دلوں کے درد کا اظہار کریں۔

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم
من و تو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفے او مرادِ دل بگوئیم
بپائے خواجہ چشماں را بمالیم

آگے عرض کرتے ہیں کہ یہاں اہلِ دانش کی حاجت نہیں۔ کیسی خوش قسمتی اور کیسا مبارک زمانہ ہے کہ مجھ فقیر بے نوا کو آستان شاہ پر حاضری میسر آ گئی۔

حکیماں را بہا کمتر نہادند
بناداں جلوۂ مستانہ دادند
چہ خوش بختے، چہ خرم روزگارے
درِ سلطاں بہ درویشے کشادند

اقبال عظمتِ رسول کو گواہ بنا کر بڑے ادب سے عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ کے رسول! مسلمان اگرچہ فقیر ہے مگر کج کلاہی کی شان رکھتا ہے۔اس کا سینہ جل رہا ہے۔اے خدا کے محبوب رسولؐ اس خستہ سامان کو نگاہِ کرم سے نوازیں۔

مسلماں آں فقیرے کج کلاہے
رمید از سینۂ اُو سوزِ آہے
دلش نالد چرا نالد؟ نداند
نگاہے یا رسول اللہ! نگاہے

اقبال بارگاہِ حضور میں اپنی فریاد کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں کی گرمی آپ کے سوزِ غم کی بدولت ہے۔ مجھے ہندوستان میں ایک بھی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو آپ کے نظریات کا سچا پیروکار اور آپ کے اسرار سے آشنا ہو۔

تب و تابِ دل از سوزِ غم تست
نوائے من ز تاثیر دم تست
بنالم زانکہ اندر کشورِ ہند
ندیدم بندۂ کو محرمِ تست

محبت رسول میں گم ہو کر اقبال کو عراقی اور جامی کے نغمہ ہائے عشق محبوب تر ہو جاتے ہیں اور وہ ساربان کے پرشوق نغموں کی حلاوت میں کھو جاتے ہیں۔

گہے شعر عراقی را بخوانم
گہے جامی زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگِ عرب را
شریک نغمہ ہائے سارہانم

سرزمین حجاز کی جانب سفر کرتے ہوئے ساربان سے کہتے ہیں کہ لمبے راستے سے ہو کر چل تاکہ جدائی کا سوز اور بھڑک سکے۔

غم راہِ نشاط آمیز تر کن
فغانش را جنوں آمیز تر کن
بگیر اے سارباں راہے درازے
مرا سوزِ جدائی تیز تر کن

دنیا میں لادینی پھیلی ہوئی ہے۔اقبال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہِ بیکس نواز سے فقر

صدیقؓ طلب کرتے ہیں تاکہ ایمان کو سوز اور حرارت عطا ہو۔

دگر گوں کرد لادینی جہاں را
ز آثارِ بدن گفتند جاں را
ازاں فقرے کہ باصدیق دادی
بشورے آور ایں آسودہ جاں را

اقبال اپنی قوم کا نوحہ حضور کی بارگاہ میں عرض کرتے ہوئے اپنی فکری بے حسی کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ یہ قوم دل تو رکھتی ہے مگر اس میں بسنے والا محبوب نہیں رکھتی۔

شبے پیش خدا بگریستم زار
مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آ نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند محبوبے ندارند

اقبال سرورِ کائنات کو اپنی بے کسی کا ماجرا سناتے ہیں کہ اے شاہ کونین! آپ سے انصاف کا طالب ہوں۔ میرے یاروں نے مجھے غزل خواں سمجھ رکھا ہے مرے کھجور کے درخت سے کسی نے بھی اس کا میٹھا پھل نہیں کھایا۔

بآں رازے کہ گفتم پے نبردند
ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من اے میر امم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

شاعر مشرق کی عاجزی انتہا کو چھونے لگتی ہے کہ یارسول اللہ ہمیں اپنے آستانہ سے نہ دھتکاریئے۔ صبر کے علاوہ جو حکم چاہیں دیں اور صبر ہمارے لیے محال ہے۔ لذتِ حضوری سے بہرہ ور فرمائیں۔

مراں از در کہ مشتاقِ حضوریم
ازاں دردے کہ دادی ناصبوریم
بفر ماہر چہ می خواہی بجز صبر
کہ ما از وے دو صد فرسنگ دارم

علامہ عرض کرتے ہیں کہ ابھی میری آگ میں چنگاری چھپی ہوئی ہے۔ آپ میری آنکھوں پر اپنی

تجلی آشکار فرما کر دیکھیں کہ اس ضعف کے باوجود میرے اندر ابھی تاب نظارا موجود ہے۔

ہنوز ایں خاک دارائے شرر ہست
ہنوز ایں سینہ را آہِ سحر ہست
تجلی ریز بر چشمم کہ بینی
بایں پیری مرا تابِ نظر ہست

ارشادِ مصطفی ﷺ ہے "مَنْ رَآنی فَقَدْ رَایَ الحق" (جس نے مجھے دیکھا اس نے خدا کا دیدار کیا) یہ حدیث پاک اقبال کے تصورات کی دنیا میں عشق و سرمستی کا آفتاب بن کر جگمگا رہی ہے۔ اسی لئے کمال ادب سے عرض کرتے ہیں کہ میری آنکھوں کی روشنی آپ کی عطا کردہ ہے۔ مجھے "من رانی" کی صبح سے فیضیاب فرمائیے کہ میری رات کی ظلمتوں کو کافور کرنے والے چاند کی چاندنی آپ ہی کی آوردہ ہے۔ یہ رباعی نعتیہ مضمون کے حوالے سے انتہائی متاثر کن اور جاذبِ فکر ہے۔

بچشمِ من نگہ آوردۂ پست
فروغِ لا اِلٰہ آوردۂ تست
دو چارم کن بہ صبح مَن رآنی
شبم را تابِ مہ آوردۂ تست

اقبال کہتے ہیں کہ عشق کی دولت آپ کے سینۂ اقدس سے حاصل ہوتی ہے اور مجھے جبریلؑ کی بابت صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ بھی آئینۂ رسالت کے ایک جوہر کا نام ہے۔

جہاں از عشق و عشق از سینۂ تست
سرورش از مئے دیرینۂ تست
جز ایں چیزے نمی دانم ز جبریل
کہ او یک جوہر از آئینۂ تست

شاعر کا جذبۂ عشق اور مچلتا ہے اور کہتا ہے کہ یا رسول اللہ! مرا سوز آپ ہی کا فیضان ہے۔ مرے انگوروں کی بیل کی شراب آپ ہی کے آبِ زمزم سے نکلی ہے۔ مری درویشی سے کسریٰ و جمشید شرماتے ہیں کیونکہ میرا دل آپ ہی کے اسرار کا محرم ہے۔

مرا ایں سوز از فیضِ دمِ تُست
بتا کم موجِ مے از زمزمِ تست

خجل ملکِ جم از درویشی من
کہ دل در سینہ من محرم تُست

آگے جا کر اقبال کی آرزو نیا آہنگ اختیار کرتی ہے اور کہتے ہیں کہ ادب دامنگیر ہے اور بات کو مختصر سے مختصر کرنا چاہتا ہوں۔

حضورِ ملت بیضا تپیدم
نوائے دِل گدازے آفریدم
ادب گوید سخن را مختصر گوے
تپیدم ، آفریدم ، آرمیدم

اقبال اپنے آنسوؤں کو لالہ کے خون میں ملا دینے کی آرزو کرتے ہیں کہ اگر میں حضرت علیؓ کی تلوار بننے کے قابل نہیں ہوں تو مجھے وہ نظر عطا کیجئے جو علیؓ کی طرح تیز ہو۔

گلستانے ز خاکِ من برانگیز
نم چشمم بخونِ لالہ آمیز
اگر شایاں نیم تیغِ علیؓ را
نگاہے دہ چو شمشیرِ علیؓ تیز

اگلی رباعی میں اقبال عشق و سرمستی کی انتہا کو چھونے لگتے ہیں۔ نعت و مدحت کے گلہائے سدا بہار بکھرنے لگتے ہیں۔ عرض کرتے ہیں کہ آپ کے کوچہ میں دل پرسوز کی ایک ہی صدا کافی ہے۔ میرے لئے یہی ابتدا ہے یہی انتہا۔ میں اس رند پاک باز کی جرأت پر آفرین کرتا ہوں اور حیرت زدہ ہوں کہ وہ کیسے بڑے مقام پر تھا جو اس نے خدا سے برملا کہہ دیا تھا کہ ''ہمارے لیے مصطفیٰ کافی ہیں۔'' ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے ظاہر ہے کہ عشق و عقیدت مصطفیٰ کی بلندیوں کو چھونے والا رندِ پاک باز اقبال کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے۔

بکوئے تو گداز یک نوا بس
مرا ایں ابتدا ایں انتہا بس
خرابِ جرأت آں رندِ پاکم
خدا را گفت ''ما را مصطفیٰ بس''

روضۂ رسول ﷺ جانِ قلب ونظر، راحتِ جان و دل ہے۔ نورِ آگہی ہے، جمالِ بزم ہستی ہے۔ مخزنِ انوارِ قدرت ہے، مرکزِ اسرارِ فطرت ہے۔ وہ روضۂ اقدس کہ جس کے حضور تصور سے

ہی پیشانیاں عرق آلود ہو جاتی ہیں کہ یہ اس ہستی کی خواب گاہ ہے جس کی ذات روح کائنات اور جس کا وجود دو عالم میں سرمایۂ نجات ہے۔ روضۂ رسول کی عظمت وجلالت کا احساس شہنشاہوں کے جسموں پر ہی نہیں بلکہ افکار پر بھی کپکپی طاری کر دیتا ہے۔ عشاق پر شہر مدینہ کو دیکھ کر اور روضۂ رسول کی تجلیات کو دلوں میں بسا کر کیا گزرتی ہے اس کا اندازہ سیدنا امام مالکؒ کے جذبۂ احترام کو دیکھ کر ہو جاتا ہے۔ ایک شاعر نے کیا خوب کیا ہے:

نبیؐ کا جس جگہ پر آستاں ہے
زمیں کا اتنا ٹکڑا آسماں ہے

اقبال کے لیے بھی شہر مدینہ اور روضۂ رسول ﷺ قلب ونظر کی معراج کا درجہ رکھتے ہیں۔ دوسرے عشاق کی طرح ان کا دل بھی چاہتا ہے کہ شہر مدینہ کے ذرات ریگزار کو پلکوں سے بوسے دیں۔ روضۂ رسول پر پلکوں سے جاروب کشی کریں مگر ظاہر بین اور تنگ نظر اصحاب کی جانب سے مخالفت کا خدشہ بھی دامنگیر ہے جو محبوب کے حضور فرطِ عقیدت سے جھکنے کو سجدے سے بغیر کر کے ان کے ذوق وشوق کو پابندِ احتساب بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اقبال اس رباعی میں سلطانِ حجاز عبدالعزیز اور دیگر محتسبین تک اپنا قلبی مدعا پہنچاتے ہیں کہ یہ سجدہ ہرگز نہیں سجدہ تو خدا کے علاوہ کسی کو جائزہ نہیں میں تو پلکوں سے محبوب کے در کی جاروب کشی کر رہا ہوں۔

تو ہم آں مے بگیر از ساغرِ دوست
کہ باشی تا ابد اندر برِ دوست
سجودے نیست اے عبدالعزیز ایں
برو بم از مژہ خاکِ درِ دوست

مدینہ طیبہ کی عظمتیں اس حقیقت کا اعلانِ عام ہیں کہ

؎ یہ کوچۂ حبیب ہے پلکوں پہ چل کے آ

یہی حقیقت اقبال کے پیش نظر ہے۔ مدینہ طیبہ کے حوالے سے اقبال کا تصور کہیں سے کہیں جا پہنچتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ مدینہ سلطانِ دو عالم ﷺ کا مسکن ہے جہاں سے زائرین کو ہر پل مژدۂ شفاعت عطا ہوتا ہے۔ مکہ مکرمہ کی عظمت اپنی جگہ۔ وہاں بیت اللہ ہے۔ مقام حج ہے۔ مکہ مکرمہ قبلہ گاہ اسلامیاں ہے مگر اسے قبلہ گاہِ اسلامیاں اس ہستی والا صفات نے بنایا ہے جو آج مدینہ طیبہ کے پرانوار ماحول میں آرام کر رہی ہے۔ احادیث گواہ ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حالتِ نماز میں تھے۔ امامت فرما رہے تھے۔ صحابہ مقتدی تھے۔ دل میں خیال آیا، الٰہی اب بیت

المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کو جی نہیں چاہتا، میرا قبلہ تبدیل کر دے۔ اسی لحہ وحی نازل ہوئی کہ اے محبوب تم جدھر کو رُخ کرو گے وہی تمہارا قبلہ بن جائے گا۔ اس وحی کے ساتھ ہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا رُخ انور بیت اللہ کی طرف کر لیا۔ گویا بیت اللہ کا قبلہ گاہ بننا بھی رضائے مصطفوی ﷺ کا اعجاز ہے اور نعت گو شعراء نے اس مضمون کو اپنے اپنے انداز میں محسوس کیا ہوگا مگر اقبال نے اس سے یہی پیغام لیا۔

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی فرقاں وہی قرآں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

''ارمغانِ حجاز'' میں اقبال عشق و عقیدتِ مصطفیٰ کے حوالے سے اس مضمون کو اس اچھوتے، منفرد اور ایمان افروز انداز میں بیان کرتے ہیں کہ عشاقِ حضور ﷺ کو ہمیشہ کے لیے عظمتِ مصطفوی ﷺ کی لافانی سربلندیوں سے آگاہ کر گئے۔

در آں دریا کہ اُو را ساحلے نیست
دلیلِ عاشقاں غیر از دلے نیست
تو فرمودی رہِ بطحا گرفتم
دگر نہ جز تو مارا منزلے نیست

اقبال کے دل میں عشق و مستی کی شمع فروزاں رہی ہے۔ اس لئے وہ انفرادی اور اجتماعی غم سلطانِ مدینہ کو سناتے ہیں انہیں ایسا لگتا ہے جیسے سناتے سناتے قرار آ گیا ہو۔ قلب مہجور کو تسلی مل گئی ہو اور اُمتِ اسلام کی مشکلات کے آسان ہو جانے کا وقت آ گیا ہو۔ عشق محمد ﷺ ان کے رگ و پے میں اس طرح جاری و ساری ہے کہ ان کے اشعار نعت کے مروجہ اسالیب نہ رکھتے ہوئے بھی کمال درجہ کی نعت معلوم ہوتے ہیں۔ درج ذیل اشعار کا مطالعہ کیجئے اور اقبال کی غایت درجہ محبت رسول ﷺ کی لطافت محسوس کیجئے۔ فرماتے ہیں:

اے تو ما بے چارگاں را ساز و برگ
وار ہاں ایں قوم را از ترسِ مرگ
اے مقام و منزلِ ہر راہ رو
جذبِ تو اندر دلِ ہر راہ رو
ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ
ظلمت آباد ضمیرش بے چراغ

قُم باذنی گوئی و اُو را زندہ کن
در دلش اللہ ہُو را زندہ کُن
شہسوارا! یک نفس در کش عناں
حرفِ من آساں نیاید بر زباں
گردِ تو گردِ حریم کائنات
از تو خواہم یک نگاہِ التفات
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
کشتی و دریا و طوفانم توئی
اے پناہِ من حریم کوئے تو!
من بامیدے رمیدم سوئے تو
چوں بصیری از تو می خواہم کشود
تا بمن باز آید آں روزے کہ بود
مہرِ تو بر عاصیاں افزوں تر است
در خطا بخشی چو مہرِ مادر است

اقبال ایک نظم میں جس کا نام ''ایک حاجی مدینے کے راستے میں'' ہے۔ ایک زائر مدینہ طیبہ کی تڑپ کا حال بیان کرتے ہیں اس دور میں حجازِ مقدس کا سفر غیر محفوظ تھا اور لوگ محفوظ قافلوں کی صورت میں سفر کرتے تھے۔ مگر ایسے جانباز محبِ رسول بھی ہوتے تھے جنہیں سفرِ مدینہ میں کسی حفاظت کی آرزو نہ ہوتی تھی کہ اس مبارک سفر میں اگر وہ قربان بھی ہو جائیں تو یہ ان کے لیے عین سعادت کی بات تھی ایسے ہی ایک مسافر پرشوق کا حال دیکھیے جس کے قافلے کو ڈاکوؤں نے لوٹ لیا اور کئی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اس بخاری نوجواں نے کس خوشی سے جان دی
موت کے زہراب میں پائی ہے اس نے زندگی
خنجرِ رہزن اسے گویا ہلالِ عید تھا
''ہائے یثرب'' دل میں، لب پر نعرۂ توحید تھا
خوف کہتا تھا کہ ''یثرب کی طرف تنہا نہ چل''
شوق کہتا تھا کہ تو مسلم ہے بے باکانہ چل

"بے زیارت سوئے بیت اللہ پھر جاؤں گا کیا
عاشقوں کو روزِ محشر منہ دکھلاؤں گا کیا"
خوف جاں رکھتا نہیں کچھ دشت پیمائے حجاز
ہجرتِ مدفونِ یثرب میں یہی مخفی ہے راز

کچھ ایسی ہی کیفیت معروف نظم "شفاخانہ حجاز" میں نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں مولانا ظفر علی خاں تک یہ اطلاع پہنچی کہ انگریز سرزمین حجاز (مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ) میں انگریزی شفاخانے کھولنے لگے ہیں۔ مولانا فوراً علامہ اقبال کے پاس آئے۔ تمام صورت بتا کر بڑے غمگین لہجے میں کہا کہ ان شفاخانوں کے ساتھ ہی یورپ کی طرف سے الحاد' بے دینی اور بے غیرتی کا سیلاب بھی آئے گا۔ علامہ اقبال نے تسلی دی کہ مطمئن رہیے ایسا نہیں ہوگا۔ وہ چلے گئے تو آپ نے یہ نظم انہیں "زمیندار" میں اشاعت کے لیے بھیج دی۔ یہ نظم دھوم دھام سے زمیندار کے صفحۂ اوّل پر چھپی۔ انگریز نے مسلمانوں کے جذبات سے لرز کر منصوبہ ختم کر دیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب ایک پیشوائے قوم نے مجھے صورت حال سے آگاہ کیا تو میں نے کہا۔

میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات
پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں
تلخابۂ اجل میں جو عاشق کو مل گیا
پایا نہ خضر نے مئے عمرِ دراز میں
اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں
آئے ہیں آپ لے کے شفا کا پیام کیا
رکھتے ہیں اہلِ درد مسیحا سے کام کیا

معراجِ مصطفیٰ (ﷺ) ایک عظیم معجزہ اور تاریخ عشق و ایمان کا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ نعت گو شعراء نے معراجِ حضور کو اپنے اپنے انداز سے دیکھا اور قلم بند کیا۔ شاید ہی کوئی نعت گو شاعر ہو جس نے اپنے اشعار میں معراج کے واقعہ کو موضوعِ نعت نہ بنایا ہو بعض نے تو اس پر طویل نعتیں لکھیں اور بعض نے "معراج نامے" لکھ دیئے مگر اقبال کا اسلوب یہاں بھی منفرد اور بے مثال ہے مختصر مگر انتہائی نتیجہ خیز۔ کہتے ہیں:

اخترِ شام کی آتی ہے فلک سے آواز
سجدہ کرتی ہے سحر جس کو وہ ہے آج کی رات
رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

چونکہ معراج کی عظمت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ملی تو حضور سرور کائنات امت اسلام کے آقا و مولا ہیں۔ اس لیے اقبال معراجِ رسول کے حوالے سے امت اسلام کو ہمت و جرأت اور فلک پیمائی کا پیغام دے رہے ہیں۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

معراجِ نبوی کی عظمت و جلالت دیکھ کر کائنات دنگ ہے۔ جن و ملک، ماہ و انجم سب عالمِ حیرت میں گم ہیں۔

عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

جوں جوں اقبال کی شاعری کا سفر نئی منزلوں کی جانب بڑھتا گیا۔ آپ کے افکار کی وسعتیں بھی اپنی معراج کو چھونے لگیں۔ آپ نے زمانے بھر کے علوم و فنون پڑھے مگر محبتِ رسول کی تجلیات کو کسی بھی بحث یا تاویل کا محتاج نہیں ہونے دیا۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ آپ کی نعت مروجہ اسالیب سے ہٹ کر ہے۔ جہاں تک مقاماتِ رسول کی بلندیوں کا تعلق ہے۔ آپ ان کی رسائی کے لیے کسی بھی محب صادق یا نعت گو شاعر سے آگے نظر آتے ہیں مگر آپ نے نعت کو پیرایۂ اظہار بناتے ہوئے ہمیشہ امت اسلام تک ذاتِ رسول کے حوالے سے کوئی نہ کوئی پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ آپ کی نعتیہ شاعری کے ابتدائی دور میں آپ کے اشعار میں روایتی نعت گوئی کا اثر نمایاں نظر آتا ہے مگر جلد ہی اقبال اس انداز سے گزر گئے اور اپنی آفاقی سوچ کے ذریعے اُردو شاعری میں نعت گوئی کی روایت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اقبال کے ابتدائی اسلوبِ نعت کا جائزہ لینے کے لیے ان کی ایک نعت سے کچھ اشعار پیش ہیں تاکہ علامہ اقبال کے ابتدائی نعتیہ رنگ کی ایک جھلک بھی قارئین کے سامنے آجائے۔

جو تیرے کوچے کے ساکنوں کا فضائے جنت میں دل نہ بہلا
تسلیاں دے رہی ہیں حوریں خوشامدوں سے منا منا کر

لحد میں سوتے ہیں تیرے عاشق تو حور جنت کو اس میں کیا ہے
کہ شورِ محشر کو بھیجتی ہے خبر نہیں کیا سکھا سکھا کر
تری جدائی میں خاک ہونا اثر دکھاتا ہے کیمیا کا
دیارِ یثرب میں آ ہی پہنچے صبا کی موجوں میں مل ملا کر
رکھی ہوئی کام آ ہی جاتی ہے جنسِ عصیاں عجیب شے ہے
کوئی اسے پوچھتا پھرے ہے زرِ شفاعت دکھا دکھا کر
یہ پردہ داری تو پردہ در ہے مگر شفاعت کا آسرا ہے
دبک کے محشر میں بیٹھ جاتا ہوں دامنِ تر میں منہ چھپا کر
ترے ثناگو عروس رحمت سے چھیڑ کرتے ہیں روزِ محشر
کہ اس کو پیچھے لگا لیا ہے گناہ اپنے دکھا دکھا کر
خیالِ راہ عدم سے اقبال تیرے در پر ہوا ہے حاضر
بغل میں زادِ سفر نہیں ہے، صلہ مری نعت کا عطا کر

اس نعت کے تمام اشعار اسی سلوبِ نعت میں لکھے گئے ہیں جو مدتوں سے مروج ہے۔ غزلیہ انداز ہے مگر محبوب وہی ذاتِ مصطفیٰ ﷺ ہے جو تمام زندگی اقبال کے افکار اور محسوسات کا محور بنی رہی اگرچہ نعت قدیم انداز میں ہے مگر مضمون آفرینی کا حسن اپنی جگہ۔ مقطع میں اس قدر عاجزی ہے کہ پلکیں نم آلود ہو جاتی ہیں:

بغل میں زادِ سفر نہیں ہے صلہ مری نعت کا عطا کر

اقبال کوئی بھی پیغام دیتے ہیں۔ خودی یا بے خودی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مردِ مومن یا شاہین کا ذکر چھیڑتے۔ فقر و سرمستی یا آزادی برصغیر کی بات کرتے ہیں، اتحادِ عالمِ اسلام یا تہذیبِ مغرب کے خلاف جہاد کے عزم کا اعلان کرتے ہیں، ان کی ہر گفتگو اور ہر جستجو کا حاصل ذاتِ مصطفیٰ اور نعتِ مصطفیٰ ہی ٹھہرتی ہے۔ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے محبت کی انتہائی پختگی کا ثمر تھا، فقیر سید وحید الدین نے آپ سے پوچھا کہ آپ شعر کیسے کہتے ہیں تو علامہ اقبال نے فرمایا:

"ایک مرتبہ فارمن کرسچن کالج لاہور کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے مجھے بھی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ اجلاس کا پروگرام ختم ہونے کے بعد چائے کا بندوبست کیا گیا۔ ہم لوگ چائے پینے بیٹھے تو ڈاکٹر لوکس میرے پاس آئے اور کہنے لگے چائے پی کے چلے نہ

جانا مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ ہم لوگ چائے پی چکے تو ڈاکٹر لوکس آ گئے اور مجھے اپنے ساتھ ایک گوشے میں لے گئے اور کہنے لگے اقبال مجھے بتاؤ کہ تمہارے پیغمبر پر قرآن حکیم کا مفہوم نازل ہوا تھا اور چونکہ انہیں صرف عربی زبان آتی تھی انہوں نے قرآن حکیم عربی زبان میں منتقل کر دیا یا یہ عبارت ہی اس طرح اتری تھی۔ میں نے کہا یہ عبارت ہی اتری تھی۔ ڈاکٹر لوکس نے حیران ہو کر کہا کہ اقبال تم جیسا پڑھا لکھا انسان اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ عبارت ہی اس طرح اتری ہے۔ میں نے کہا: ڈاکٹر لوکس! یقین ہی نہیں بلکہ میرا تجربہ ہے مجھ پر شعر پورا اترتا ہے تو پیغمبر پر عبارت پوری کیوں نہیں اتری ہوگی۔''

دیکھئے! اقبال کے جواب میں کوئی بحث طلب یا الجھا دینے والی بات نہیں اُنہیں اپنے رسول کریم اور قرآن حکیم پر ایمان و یقین کی پختگی ہی اس طرح عطا ہوئی تھی کہ وہ دوسرا جملہ کہنے کے بھی روادار نہیں ہوئے تھے۔

شاعرِ مشرق کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے غیر معمولی وابستگی کا ثمر یوں عطا ہوا کہ ان کے نعتیہ اشعار بقائے دوام حاصل کر گئے۔ زمانہ صدیوں کی مسافتیں طے کرتا رہے گا مگر اقبال کے نعتیہ کلام کی تب و تاب میں کمی رونما نہیں ہوگی بلکہ ہر آنے والا دور اس سے فیضیاب ہوتے ہوئے فخر محسوس کیا کرے گا۔ مروجہ اسلوب میں باقاعدہ نعت گوئی نہ کرنے کے باوجود بھی علامہ اقبال توصیف مصطفیٰ ﷺ میں اتنا کچھ کہہ گئے ہیں کہ زمانے بھر کے نعتیہ دواوین سے ان کے نعتیہ اشعار کا مقام و مرتبہ اولیٰ تر ہے کیونکہ انہوں نے کوئی بھی نعتیہ کلام نعت برائے نعت کے حوالے سے نہیں لکھا بلکہ ان کی نعت مفاہیم و مضامین کا قلزم بے کنارا اپنے دامن میں لیے ہوئے تھی۔ نئے سے نیا پیغام، نئی سے نئی بات، نئی سے نئی تجلی۔ غرضیکہ تجلیات نعت کی فراوانی نے ان کی نعت کو عالمگیریت عطا کر دی ہے۔

سلطانِ دو عالم ﷺ سے غیر معمولی محبت اور عشق و عقیدت نے انہیں تاریخ اسلام کا مردِ مومن بنا دیا۔ وہ مردِ مومن کہ جس کی عظمتوں کو وقتِ آخر نے یوں سلام کیا تھا:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

اور پھر اقبال کی وہ رباعی جو انہوں نے اپنے وصال سے چند منٹ پیشتر پڑھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ سانس بھی رُک رُک کر چل رہا تھا۔ بعض اوقات آنکھوں کے اشارے اور ہاتھ کی جنبش سے

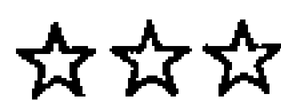
کچھ سمجھاتے تھے۔ آپ کے ایک بزمِ آشنا راجہ حسن اختر صاحب کا بیان ہے کہ علامہ مرحوم نے انتقال سے تقریباً دس منٹ قبل اپنا حسب ذیل قطعہ پڑھ کر وقت آ جانے کا اعلان کر دیا تھا۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمے . از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

بلاشبہ وصال سے قبل اس نوعیت کی رُباعی کہہ جانا اقبال کے لیے بہت بڑا انعام ہے اور یہ مدحتِ مصطفیٰ ﷺ ہی کا صدقہ ہے کہ رب کریم نے اقبال کو وقتِ آخر یہ توفیق بخش دی کہ وہ اپنی مدحت طرازیوں کو ''نسیمے از حجاز آید کہ ناید'' کا نام دے کر محبتِ رسول کی خوشبوئے دل نواز سے زمانے بھر کو مہکانے کا اہتمام کر جائیں۔ اقبال کے قلب ونظر میں، افکار ومحسوسات میں عمر بھر محبتِ رسول ﷺ نے اپنا مقام بنائے رکھا۔ یہی محبت رسول ﷺ ان سے زندگی بھر توصیف وثنا کا خراج لیتی رہی۔ اقبال نے جو سرمایۂ مدحتِ رسول چھوڑا ہے ہم نے اس سے اجمالاً خوشہ چینی کی ہے ورنہ وہاں تو ہر ساعت ''جہانِ دیگر'' کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا ''جہانِ دیگر'' کہ جس میں نعتِ مصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے ہر ورق اور ہر صفحہ پر زمانے بھر کے توصیف نگاروں سے ہٹ کر نئے ہی اسلوب میں نعت اور تعلیمات حضور ﷺ کے ستارے بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ عصرِ حاضر کے اسلوب طرازوں سے کہیں زیادہ رومی، عرفی اور جامی وبصیری کے قافلے کا خوش بخت مسافر تھا۔ اس کی نعت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے غیر معمولی محبت کا والہانہ پن عطا کر رہی ہے اور وہ مردِ مومن کو محبت رسول ﷺ کا آفاقی پیغام دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر تو میری بات پر غور کرے اور حضرتِ صدیق اکبرؓ کی رمز شناس آنکھوں سے دیکھے تو حضور نبی کریم ﷺ تیرے لیے دل وجگر کی قوت بن جائیں گے اور ان کی ذات گرامی خدا سے زیادہ محبوب بن جائے گی۔

معنیٔ حرفم کنی تحقیق اگر بنگری با دیدۂ صدیق گر
قوتِ قلب و جگر گردد نبی از خدا محبوب تر گردد نبی

سیدنا صدیق اکبرؓ کے لیے نبی کریم ﷺ اس لیے محبوب تر تھے کہ انہوں نے اپنے محبوب ﷺ کی سیرت وصورت میں خدا کو دیکھا۔ اقبال کا عشق رسول اور اقبال کی نعتیہ شاعری بھی ہمیں نعتِ رسول ﷺ کے حوالے سے مقاماتِ مصطفیٰ کو پہچان کر خداشناسی کا پیغام دے رہی ہے۔



امام احمد رضا خاں فاضل بریلویؒ

کارواں سالارِ نعت۔ فنی و تحقیقی جائزہ

امام احمد رضا خاں فاضل بریلویؒ کو خدا نے جن لازوال علمی و فقہی کمالات، باطنی و نظری خصوصیات اور علمی و اَدبی خصائص سے نواز رکھا تھا ان میں سے ایک صفت خاص آپ کی منفرد نعت گوئی ہے۔ اگر ایسے اساتذہ فکر و فن کی فہرست تیار کی جائے جنہوں نے اس صدی میں ثنائے مصطفیٰ ﷺ کا پرچم لہرانے والوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا تو ان میں یقیناً سرفہرست حضرت فاضل بریلوی کا اسم گرامی ہوگا کہ جن کی نعت گوئی کا اعتراف اپنوں نے ہی نہیں بلکہ بیگانوں نے بھی کیا ہے۔ بلکہ ان نابغہ روزگار ثنا گویانِ کوچہء مصطفےٰ ﷺ میں سے بیشتر نے انہیں فن نعت کے حوالے سے امام سخن گویاں قرار دیا ہے۔ آپ کی نعتیہ شاعری کا سورج جب ایک بار چمکا تو پھر اس کی روشنی کبھی بھی نہ ماند پڑ سکی، بلکہ ہر آنے والے دور کا شاعر جب مدحت رسول کی خاطر ذہن و فکر کو آمادہ کرتا ہے تو احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے کلام بلاغت نظام سے راہنمائی ضرور حاصل کرتا ہے۔ جب ایشیا کی مساجد سے لے کر یورپ کے اسلامی مراکز تک ہر جگہ ''مصطفےٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام'' کی صورت میں وجد آفریں سلام کی صدائیں اُبھرتی ہیں تو جہاں اصحاب نظر کی پلکیں عشقِ و عقیدت کے آنسوؤں سے نم ہو جاتی ہیں وہاں تصورات کے نہاں خانوں میں نعت گو احمد رضا خاں کا جو روشن سراپا اُبھرتا ہے وہ اس قدر سر بلند اور سرفراز ہوتا ہے کہ ان کے معاصرین اور عصر حاضر کے نعت گو شعراء کا وجود اپنی تمام بلند قامتی کے باوجود اس کے سامنے مختصر محسوس ہوتا ہے۔

اس غیر معمولی مقبولیت، حیرت انگیز مرجعیت، لافانی شہرت اور انمٹ قدر و منزلت کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے نعتیہ شاعری کے لئے قرآن حکیم سے اکتساب فیض کیا ہے۔ قرآن حکیم بذاتِ خود نعت مصطفےٰ ﷺ کا سب سے اہم ماخذ ہے جس کے ہر پارے، سورت اور آیت سے صفت و ثنائے حضور ﷺ کی مہک پھوٹ رہی ہے۔ احمد رضا خاںؒ فقط ایک شاعر ہی نہ تھے۔ نامور عالم دین یگانہ روزگار محدث اور بے مثل مفسر قرآن بھی تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ذوق

وشوق کی کیف آفریں وادیوں میں کھو کر جب قرآن حکیم کا مطالعہ کیا تو انہیں نعت مصطفیٰ ﷺ کی رفعتیں اپنے قلب و جان کا احاطہ کرتی ہوئی محسوس ہونے لگیں قرآن حکیم کے مطالعہ سے آگے بڑھے تو شریعت مصطفوی ان کی خضر راہ بن گئی اور وقت کا یہ عظیم ترین فقیہ نعت کی گلرنگ وادیوں میں سفر کرتے ہوئے بے اختیار عظمتِ کلام خداوندی اور شریعتِ حضور کے حوالے سے پکارا تھا۔

پیشہ مرا شاعری نہ دعویٰ مجھ کو
ہاں شرع کا البتہ ہے جنبہ مجھ کو
مولیٰ کی ثنا میں حکم مولیٰ کا خلاف
لوزینہ میں سیر تو نہ بھایا مجھ کو

احمد رضا خاں چونکہ بہت بڑے عالم دین اور علوم شریعت سے غیر معمولی آگاہی رکھنے والے نعت گو شاعر تھے اس لئے انہوں نے نعت کے حقیقی مقام و مرتبہ کو اُجاگر کیا اس ضمن میں آپ نے نعت کی جو تعریف کی ہے وہ اصحاب ذوق کے لئے شمعِ ہدایت ہے۔

''حقیقتاً نعت شریف لکھنا بڑا مشکل کام ہے جس کو لوگوں نے آسان سمجھ لیا ہے اس میں تلوار کی دھار پر چلنا پڑھتا ہے۔ اگر بڑھتا ہے تو الوہیت میں پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہوتی ہے، البتہ حمد آسان ہے کہ اس میں صاف راستہ ہے جتنا چاہے بڑھ سکتا ہے۔ غرض حمد میں اصلاً حد نہیں اور نعت شریف میں دونوں جانب حد بندی ہے۔'' رضا بریلوی نے نعت کی شرعی حدود وقیود کا پورا پورا پاس کیا ہے۔ ان کا راہوار قلم جب عشق وعقیدت کی جولاں گاہ میں محوِ سفر ہوتا ہے تو ہر گام پر دلوں کے تڑپنے، جذبوں کے مچلنے، تمناؤں کے غنچے چٹکنے کی صدائیں اُبھرتی ہیں، مگر حضرت رضا بریلوی نے عشق وعقیدت کی انتہائی سربلندیوں پر پہنچ کر بھی آدابِ شریعت اور اَدب کے ساتھ احتیاط کو مدنظر رکھا ہے۔ کئی بلند پایہ نعت گو شاعر افراط و تفریط کے معاملہ میں ٹھوکر کھا گئے مگر اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے قرآن حکیم سنتِ مصطفیٰ ﷺ اور اُسوۂ رسول کو خضرِ راہ بنا کر جب نعت کہی تو ایوانِ نعت جگمگا اُٹھا۔

امام احمد رضا کی نعت عشق وعقیدت کی حسین داستان ہے۔ ایسی داستان کہ جس کا ایک ایک لفظ ذوق وشوق کی کیفیات سے بہرہ ور کرتا اور عنایات مصطفوی ﷺ کا حق دار ٹھہراتا ہے۔ نعت میں عشق وعقیدت کو وہی حیثیت حاصل ہے جو پھول میں خوشبو کو حاصل ہے۔ خوشبو پھول کے باطنی حسن کو اُجاگر کرتی اور اس کی حقیقی پہچان بن جاتی ہے۔ احمد رضا بریلوی بہت بڑے عاشق رسول تھے یہی عشق ان کا سرمایۂ حیات اور یہی اَدب واحترام ان کا اثاثۂ عمل اور روحانی گداز ان

کے لئے ذریعہ نجات تھا۔ احمد رضا خاں عشق مصطفیٰ ﷺ کی بارات کس طور سجاتے ہیں اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

لحد میں عشقِ رخِ شہ کا داغ لے کے چلے
اندھیری رات سنی تھی چراغ لے کے چلے
اللہ کی سر تا بقدم شان ہیں یہ
ان سا نہیں انسان وہ انسان ہیں یہ
قرآن تو ایمان بتاتا ہے انہیں
ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ
الٰہی منتظر ہوں وہ خرام ناز فرمائیں
بچھا رکھا ہے فرش آنکھوں نے کمخواب بصارت کا

مضمون آفرینی کو شاعری کی جان کہا جاتا ہے۔ شاعر جتنا بلند مضمون باندھے گا اس کا کلام اتنا ہی زیادہ قبولیت عام اور فکری وفنی شوکت کا مقام حاصل کرے گا۔ اعلیٰ حضرت نے نعت مصطفیٰ ﷺ رقم کرتے ہوئے مضامین آفرینی کی سربلندیوں کو چھوتے ہوئے بھی اَدب واحترام مصطفیٰ ﷺ کو فراموش نہیں کیا کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ کوچۂ ارادت وعقیدت میں معمولی سی ٹھوکر بھی انہیں بلند مقام سے نیچے گرا سکتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ آپ نے خود نعت کے تقدس کو ملحوظ رکھا بلکہ دوسرے شعراء کی بھی راہنمائی فرمائی۔ چنانچہ اُردو کے بلند پایہ شاعر حضرت اطہر ہاپوڑی نے ایک نعت لکھ کر آپ کی خدمت میں بھیجی جس کا مطلع یہ تھا:

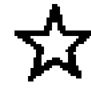
کب ہیں درخت حضرتِ والا کے سامنے
مجنوں کھڑے ہیں خیمۂ لیلیٰ کے سامنے

اعلیٰ حضرت نے سن کر ناراضگی کا اظہار کیا کہ دوسرا مصرعہ مقامِ نبوت کے لائق نہیں ہے۔ آپ نے قلم برداشتہ اصلاح فرمائی۔

کب ہیں درخت حضرتِ والا کے سامنے
قدسی کھڑے ہیں عرش معلّٰی کے سامنے

اعلیٰ حضرت کی اس اصلاح سے اطہر ہاپوڑی کی مضمون آفرینی اور رفعت تخیل کو چار چاند لگ گئے۔ اب ہم اعلیٰ حضرت کے کلام سے مضمون آفرینی تخیل اور شوکت فکر کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

واہ کیا جود و کرم ہے شہِ بطحا تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا
میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب
یعنی محبوب و محبّ میں نہیں میرا ، تیرا



مالک کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں
دو جہاں کی نعمتیں ہیں ان کے خالی ہاتھ میں
مرے کریم گنہ زہر سہی لیکن
کوئی تو شہدِ شفاعت چشیدہ ہونا تھا
پریشانی میں نام ان کا دلِ صد چاک سے نکلا
اجابت شانہ کرنے آئی گیسوئے توسّل کا

حضرت احمد رضا خاں صفت وثنائے حضورﷺ میں اس درجہ محو ہوئے کہ تمام زیست نعت کے علاوہ کسی اور طرزِ سخن کی جانب توجہ نہ کی۔ حضور آقائے دو عالمﷺ تو سلطان اقالیم دو عالم ہیں۔ افتخار آدم و نبی آدم ہیں رحمت پناہِ عاصیاں اور چارۂ بے چارگاں ہیں۔ آپ کا دربار وہ دربارِ معلّٰی ہے جہاں سے گداؤں کو شہنشاہی اور بوریانشینوں کو عشق وعقیدت کے نام پر کجکلاہی عطا ہوتی ہے، اس لئے کون چاہے گا کہ ایک بار اس دربار معلّٰی سے نسبت حاصل کر کے کسی اور دروازے کی طرف دیکھے یا اپنے دور کے کسی سلطان یا امیر کا قصیدہ کہے۔ شاہ احمد رضا کو حضورﷺ سے نسبت پر اس قدر ناز تھا کہ اس کا اظہار ان کے کلام میں جا بجا ملتا ہے:

کروں مدح اہل دول رضا پڑے اس بلا میں مری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا مرا دین پارۂ ناں نہیں

اعلیٰ حضرت نے نعت کو ان بلندیوں پر پہنچا دیا ہے کہ زمانے کو ان کی عظمت تسلیم کرتے ہی بنی۔ نعت مصطفیٰﷺ وہ افتخار ہے کہ نعت گو شاعر بے اختیار اس کے احساس سے اپنے جذبات کو وجد میں لے آتا ہے۔ اس لیے شاہ احمد رضا خاں فرماتے ہیں:

ملک سخن کی شاہی تم کو رضا مسلم
جس سمت آ گئے ہو سکے بٹھا دیئے ہیں

یہی کہتی ہے بلبلِ باغ جناں کہ رضا کی طرح کوئی سحر بیاں
نہیں ہند میں واصف شاہِ ہدیٰ مجھے شوخیٔ طبع رضا کی قسم
گونج گونج اُٹھے ہیں نغمات رضا سے بوستاں
کیوں نہ ہو کس پھول کی مدحت میں وا منقار ہے

حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات گرامی میں قدرت نے ازل سے ابد تک کے تمام محامد ومحاسن جمع کر دیئے ہیں۔ آپ کے ظاہری و باطنی فضائل عقل وخرد سے ماورئی اور آپ کے کمالات ذہنِ انسانی سے کہیں بلند ہیں۔ شاعر کی فکر کمتر کمالات مصطفےٰ ﷺ کا احاطہ کرنے کے لئے آگے بڑھتی ہے مگر بے بس و ناتواں ہو کر اپنی معذوری و مجبوری کا اعتراف کرنے لگتی ہے۔ مولانا احمد رضا خاں کے قلم حقیقت رقم نے حضور نبی کریم ﷺ کے حسن ظاہری اور باطنی تجلیات کو جی بھر کر خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کا یہ خراجِ عقیدت اشعار کا ایک ایسا گلکدہ ہے جس کا ہر پھول سدا بہار اور ہر غنچہ محبت رسول ﷺ سے مشکبار ہے۔ آپ نے اپنے آقا ومولا ﷺ کے حسنِ صورت کو اس شان سے اپنی شاعری کا اعزاز بنایا ہے کہ افقِ شاعری پر عظمت وشانِ مصطفیٰ ﷺ کے نجومِ تاباں ہر لحظہ نئی آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوتے اور اصحابِ نظر کے افکار کو مستنیر کرتے نظر آتے ہیں۔ حسن و جمال مصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حسنِ یوسف پہ کٹیں مصر میں انگشتِ زناں
سر کٹاتے ہیں ترے نام پہ مردانِ عرب

یہ کمالِ حسنِ حضور ہے کہ گمانِ نقصِ جہاں نہیں
یہی پھول خار سے دور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں

سر تا بقدم ہے تن سلطان زمن پھول
لب پھول دہن پھول ذہن پھول بدن پھول

واللہ جو مل جائے مرے گل کا پسینہ
مانگے نہ کبھی عطر نہ پھر چاہے دلہن پھول

ہے کلام الٰہی میں شمس وضحیٰ ترے چہرہ نور فزا کی قسم
قسمِ شب تار میں راز یہ تھا کہ حبیب کی زلف دوتا کی قسم

خامۂ قدرت کا حسنِ دستکاری واہ واہ
کیا ہی تصویر اپنے پیارے کی اتاری واہ واہ
نور کی خیرات لینے دوڑتے ہیں مہر و ماہ
اُٹھتی ہے کس شان سے گردِ سواری واہ واہ

جب اعلحضرت بریلوی حضور سرورِ کائنات ﷺ کے حسنِ باطنی اور جمالِ سیرت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان کا اندازِ بیان دیدنی ہوتا ہے۔ ان کی نگاہوں میں حضور نبی کریم ﷺ کے تمام خصائص وکمالات گھومنے لگتے ہیں۔ حضور ﷺ کی عظمتِ کردار، رفعتِ گفتار، بے پایاں رحمتہ للعالمینی، میدان محشر میں آپ کی شفیع المذنبینی، گنہگار اُمت کے لئے حضور کی گریہ وزاریٔ، خطا کاروں کی بخشش کے لئے رحمت شعاری، جودوکرم کی فراوانی، لطف وعنایات کی فراخ دامانی، اخلاق عالیہ کی رفعت، سیرت وکردار کی عظمت، خدا کی اپنے محبوب پر بے پایاں عنایت اور حضور نبی کریم ﷺ کا اُمت کے لئے ہر آن اُمنڈتا ہوا بحر شفاعت، یہ سب خصائص جب احمد رضا خاں کے قلم میں سماتے ہیں تو ان کے خامۂ عنبر فشاں کو نئی توانائی اور ان کے ذوقِ مدحت کو حیرت انگیز گہرائی عطا ہوتی ہے۔ آپ کے کلام سے چند اشعار نذرِ قارئین ہیں۔

چور حاکم سے چھپا کرتے ہیں یاں اس کے خلاف
تیرے دامن میں چھپے چور انوکھا تیرا
ایک میں کیا میرے عصیاں کی حقیقت کتنی
مجھ سے سو لاکھ کو کافی ہے اشارا تیرا

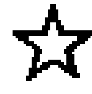


جب آ گئی ہیں جوشِ رحمت پہ ان کی آنکھیں
جلتے بجھا دیئے ہیں روتے ہنسا دیئے ہیں
اللہ کیا جہنم اب بھی نہ سرد ہو گا
رو رو کے مصطفےٰ نے دریا بہا دیئے ہیں



جس کی دو بوند ہیں کوثر وسلسبیل
ہے وہ رحمت کا دریا ہمارا نبیؐ

جس کے تلووں کا دھوون ہے آبِ حیات
ہے وہ جانِ مسیحا ہمارا نبیؐ



پیش حق مژدہ شفاعت کا سناتے جائیں گے
آپ روتے جائیں گے ہم کو ہنساتے جائیں گے
آنکھ کھولو غمزدو، دیکھو وہ گریاں آئے ہیں
لوحِ دل سے نقشِ غم کو اب مٹاتے جائیں گے

شاہ احمد رضا خاں کی نعتیہ شاعری کا وہ حصہ دلوں کو بے اختیار گداز آشنا کرتا ہے جب آپ حرمین الشریفین کی جانب سفر کی تیاری کرتے ہیں۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو دیکھنے کی تمنا ہر صاحبِ ایمان کے دل میں مچلتی ہے اور پھر جب وہ شخصیت اس مبارک سفر پر روانہ ہو رہی ہو، جس نے عمر بھر عشق مصطفےٰ ﷺ کا درس دیا ہو۔ توحید خداوندی کے آداب سکھائے ہوں، احترام وعقیدت رسول کی چمک عطا کی ہو۔ دلوں میں شمع عشق رسول ﷺ جلا کر اُجالا کیا ہو، جس کی اپنی زندگی عشق مصطفوی ﷺ کی تصویر اور محبت رسول ﷺ کی عملی تفسیر ہو۔ جس کے شب و روز بیت اللہ کے طواف اور حرمِ نبوی کی زیارت کے تصور میں گزرتے ہوں تو پھر اس پر کیف سامانی کا آفتاب کس شان سے پرتو فگن ہوگا۔ اس کا تذکرہ بہار آفریں بھی ہے اور روحانی لطف و سرور کا باعث بھی، آیئے ہم بھی احمد رضا خاں کی اس کیف سامانی سے چند اشعار کا عصری حسن مستعار لے کر دلوں کو شادکام کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

شکر خدا کہ آج گھڑی اس سفر کی ہے
جس پر نثار جان فلاح و ظفر کی ہے
اس کے طفیل حج بھی خدا نے کرا دیئے
اصلِ مراد حاضری اس پاک در کی ہے

جب آپ حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کر کے مدینہ منورہ حاضر ہوتے ہیں تو آپ کی کیفیت دیدنی ہوتی ہے اور مدینہ منورہ کا تصور ان سے کس طور خراج عقیدت حاصل کرتا ہے اس کی جھلک ملاحظہ ہو:

حاجیو آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو
کعبہ تو دیکھ چکے کعبے کا کعبہ دیکھو

غور سے سن تو رضا کعبہ سے آتی ہے صدا
مری آنکھوں سے مرے پیارے کا روضہ دیکھو

مدینہ منورہ کے بارے میں احترام وعقیدت کا کس شان سے اظہار کرتے ہیں، انداز دیکھئے:

مدینے کے خطے خدا تجھ کو رکھے
غریبوں فقیروں کے ٹھہرانے والے
حرم کی زمیں اور قدم رکھ کے چلنا
ارے سر کا موقع ہے او جانے والے

اور مدینہ منورہ کی گلیوں میں اس عاشق رسول کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ آنکھیں کس طرح اشکوں کی لڑیاں پروتی ہیں۔ انہیں یہاں ہر گام پر سرکار دو عالم ﷺ کے جلوے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف آپ کی بے قراری ہے اور دوسری طرف آقا و مولا کی نوازشوں کا احساس، اسی احساس سے سرشار ہو کر مدینہ طیبہ کے گلی کوچوں کا طواف کرتے ہیں۔ گنبدِ خضریٰ کی زیارت کرتے کرتے جی نہیں بھرتا، دل مکینِ گنبدِ خضریٰ کی زیارت کے لئے مچلتا رہا، یہی بے قراری رنگ لائی اور حضور ﷺ کی عنایاتِ بے کراں سے نوازے گئے۔ اس کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں
تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں
اس گلی کا گدا ہوں میں، جس میں
مانگتے تاجدار پھرتے ہیں
پھول کیا دیکھوں مری آنکھوں میں
دشتِ طیبہ کے خار پھرتے ہیں

شاہ احمد رضا خاں کا نعتیہ مجموعہ ''حدائق بخشش'' ہے جس کا اولین سال اشاعت ۱۳۲۵ھ ہے۔ رضا بریلوی کے نعتیہ کلام کا ایک دلآویز اور خوبصورت حصہ نعتیہ قصائد پر مشتمل ہے۔ ان میں سے قصیدہ نوریہ، قصیدہ معراجیہ اور آپ کا طویل سلام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ قصیدہ نوریہ میں بطور خاص حضور نبی کریم ﷺ کی ولادت اقدس کے حوالے سے آپ کی صفات عالیہ کو موضوع شاعری بتایا گیا ہے۔ یہ قصیدہ اس قدر جامع اور اثر آفریں ہے کہ بے شمار عشاق مصطفےٰ ﷺ اسے وظیفۂ عقیدت جان کر پڑھتے ہیں۔

صبح طیبہ میں ہوئی بٹتا ہے باڑا نور کا
صدقہ لینے نور کا آیا ہے تارا نور کا
تاج والے دیکھ کر تیرا عمامہ نور کا
سر جھکاتے ہیں الٰہی بول بالا نور کا
تیری نسل پاک سے ہے بچہ بچہ نور کا
تو ہے عینِ نور تیرا سب گھرانا نور کا

''قصیدہ معراجیہ'' میں نبی کریم ﷺ کے سفر معراج کے حوالے سے آپ کی عظمت وفضیلت کا ذکر کیا گیا ہے یہ قصیدہ بذاتِ خود فکر وفن کا شہکار اور کاروان مدحت ونعت کا افتخار ہے۔ طویل بحر میں لکھا گیا یہ قصیدہ تشبیہات استعارات اور برجستہ تراکیب کے حوالے سے اُردو اَدب کے لئے سرمایۂ اعزاز ہے۔ یہ قصیدہ آپ کی جودت وجدتِ طبع کا آئینہ دار ہے۔ ادائیگی وتسلسل اورزبان کی لطافت و پاکیزگی کے اعتبار سے معاصرین کے معراجیہ قصائد میں سب سے بلند ہے۔ اعلحضرت کے ہم عصر مشہور نعت گو شاعر محسن کاکوروی نے انہی دنوں معراج پر قصیدہ ''سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل'' لکھا تھا:

محسن کاکوروی اپنا قصیدہ سنانے کے لئے بریلی میں مولانا احمد رضا خاں کے پاس گئے۔ ظہر کے وقت دو شعر سننے کے بعد طے ہوا کہ محسن کاکوروی کا پورا قصیدہ عصر کی نماز کے بعد سنا جائے، عصر کی نماز سے قبل مولانا نے خود یہ قصیدہ معراجیہ تصنیف فرمایا۔ نماز عصر کے بعد جب یہ دونوں بزرگ اکٹھے ہوئے تو مولانا نے محسن کاکوروی سے فرمایا کہ پہلے میرا قصیدہ معراجیہ سن لو، محسن کاکوروی نے جب مولانا کا قصیدہ سنا تو اپنا قصیدہ لپیٹ کر جیب میں ڈال لیا اور کہا مولانا، آپ کے قصیدے کے بعد میں اپنا قصیدہ نہیں سنا سکتا۔ اس عالمانہ وعارفانہ نکات کے حامل اور شاعرانہ کمالات سے لبریز قصیدے کے چند اشعار سے قارئین بھی اپنے گلشن ایمان کو بہار درکنار کرلیں۔

وہ سرورِ کشورِ رسالت جو عرش پر جلوہ گر ہوئے تھے
نئے نرالے طرب کے ساماں عرب کے مہمان کے لئے تھے
اُدھر سے پیہم تقاضے آنا ادھر سے مشکل قدم بڑھانا
جلال وہیبت کا سامنا تھا جمال و رحمت اُبھارتے تھے

یہ پھوٹ پڑتی تھی ان کے رخ کی کہ عرش تک چاندنی تھی چٹکی
وہ رات کیا جگمگا رہی تھی جگہ جگہ نصب آئینے تھے
ثنائے سرکار ہے وظیفہ قبول سرکار ہے تمنا
نہ شاعری کی ہوس نہ پروا روی تھی کیا کیسے قافیے تھے

مولانا احمد رضا خان کا سلام ہر لحاظ سے اَدب عالیہ کا ایک حصہ ہے۔ اسے فن شاعری کے حوالے سے دیکھیں، یا محبت وعقیدت کے حوالے سے، ثنائے مصطفیٰ ﷺ کی روشنی میں دیکھیں یا الفاظ وتراکیب کی برجستگی کے حوالے سے۔ حسن زبان وبیان کے آئینے میں دیکھیں یا شکوہِ تراکیب واستعارات کی جلوہ گری کے پیمانے سے اس کے فنی وشعری محاسن کا جائزہ لیں یہ سلام دلوں کو محبت رسول ﷺ کی دولت عطا کرتا، پتھر دلوں کو روحانی گداز بخشتا اور اپنے مخصوص صوتی آہنگ میں دلوں کے تار چھیڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کوثر وتسنیم کی دھلی ہوئی زبان، مشک وعنبر سے بسا ہوا قلم، جمال عقیدت سے آباد وسرشار لہجہ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ سلام حضور ﷺ کے نورانی سراپا کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کے ایک ایک عضو پر عقیدت کی مہکبار پتیاں نچھاور کی گئی ہیں۔ قارئین کے ذوق کی جلا کے لئے چند اشعار پیش ہیں۔

شہر یارِ ارم تاجدارِ حرم
نو بہارِ شفاعت پہ لاکھوں سلام
صاحبِ رجعتِ شمس و شق القمر
نائبِ دستِ قدرت پہ لاکھوں سلام
قدِ بے سایہ کے سایۂ مرحمت
ظلِّ ممدود رافت پہ لاکھوں سلام
دور و نزدیک کے سننے والے وہ کان
کانِ لعل کرامت پہ لاکھوں سلام
جس کے ماتھے شفاعت کا سہرا رہا
اس جبینِ سعادت پہ لاکھوں سلام
پتلی پتلی گلِ قدس کی پتیاں
ان لبوں کی نزاکت پہ لاکھوں سلام

غیر معمولی جذبۂ عشق رسول ﷺ علومِ شرعیہ پر مکمل عبور، روحانی سوز وگداز، شدتِ

احساس اور خلوصِ جذبات کی ہم آہنگی نے فاضل بریلوی علیہ الرحمتہ کے کلام کو حسنِ تغزل عطا کر دیا ہے جو آپ سے پہلے کسی نعت گو شاعر میں نظر نہیں آتا، آپ وہ پہلے نعت گو شاعر ہیں جنہوں نے نعت کو غزل کا آہنگ اور لہجہ عربی عطا کیا۔ ردیف اور قوافی کے اہتمام سے نعت جیسی پاکیزہ صنف کو غزل پر فوقیت عطا کر دی۔ آپ نے اس عروسِ سخن کو مجازی محبوب کی دہلیز سے اُٹھایا، شاعری کو غزل کے شبستانِ ہوس سے نکالا اور ایوانِ نعت کے دلکش ماحول میں اس سے چراغِ ہدیٰ کا کام لیا نعت اس وقت تک حسن تغزل سے محروم رہتی ہے جب تک اس میں عشق اپنی انتہا کو نہ چھونے لگے اور سوز و گداز کا پھوٹتا ہوا سرچشمہ آنکھوں سے محبوب کی محبت کے نام پر اشکوں کا خراج نہ لینے لگے۔ حضرت احمد رضا خاں کی نعتیہ شاعری میں تو سوز بلالؓ کی تڑپ تھی، عشق اویسؓ کی جلوہ گری تھی، رومی و جامی کی تڑپ تھی۔ آپ نے اپنے معاصرین کی نعت گوئی کے مقابلے میں کہ جو زیادہ تر مولود ناموں اور نظم گوئی پر مشتمل تھی ایک نیا راستہ نکالا۔ یہ راستہ وہی تھا جس پر سے سیدنا حسان بن ثابتؓ کی قیادت میں پہلا کاروانِ نعت گزرا تھا۔ اس کاروانِ نعت کے قدموں سے اُبھرنے والی گرد کے ایک ایک ذرّے نے بے شمار ستارے تخلیق کیے تھے۔ امام احمد رضا خاں نے اپنی عقیدت کی پلکوں سے ان ستاروں کو چنا۔ فیاضی قدرت نے ان کی شاعری کو وہ حسن تغزل عطا کر دیا کہ ایک زمانہ بیت جانے کے باوجود آپ کا کلام حالات کے ظلمت کدوں میں اسمِ محمد ﷺ کے اُجالے بکھیر رہا ہے۔ حسنِ تغزل کے نام پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نہ آسمان کو یوں سر کشیدہ ہونا تھا
حضورؐ خاک مدینہ خمیدہ ہونا تھا

نعمتیں بانٹتا جس سمت وہ ذیشان گیا
ساتھ ہی منشیٔ رحمت کا قلمدان گیا

دل ہے وہ دل جو تری یاد سے معمور رہا
سر ہے وہ سر جو تیرے قدموں پہ قربان گیا

دل اپنا بھی شیدائی ہے اس ناخنِ پا کا
اتنا بھی مہِ نو پہ نہ اے چرخِ زمن پھول

اہلِ صراط روحِ امیں کو خبر کریں
جاتی ہے اُمتِ نبوی فرش پر کریں

ان کی حرم کے خار کشیدہ ہیں کس لئے
آنکھوں میں آئیں سر پہ رہیں دل میں گھر کریں

چونکہ احمد رضا فاضل بریلوی نامور محدث اور علومِ شریعت کے عالم کامل تھے۔ تاریخ اور سیرت مصطفویﷺ کے روشن ادوار پر آپ کی گہری نظر تھی۔ اس لئے آپ نے جہاں حسنِ تغزل کی بہار بکھیرتے ہوئے اپنے آقا و مولاﷺ کے لامتناہی فیوض و برکات کا تذکرہ کیا ہے وہاں آپ نے اپنے علمی کمالات اور علوم دینیہ پر گہری گرفت رکھنے کی بنا پر بہت سے ایسے واقعات اور معجزات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن سے عظمت و شانِ رسولﷺ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ان کی قرآن فہمی اور احادیث نبوی پر عبور نے انہیں بہت مدد دی ہے۔ بعض نعتیہ اشعار تو آیات قرآنی اور احادیث نبوی کا منظوم ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے قرآنی آیات اور احادیث کو اس خوبی سے اپنی نعتوں میں سمویا ہے کہ ہر صاحب فکر کو ان کی قدرت فن کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ بعض نعتوں میں تو عربی کے الفاظ اس طرح جگہ پا چکے ہیں کہ مستقل طور پر انہی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان نعتوں میں عربی الفاظ کی آمیزش نے کس طرح ان نعتوں کے حسن کو دوبالا کیا ہے اس کی بہترین مثال ان کی یہ شہرۂ آفاق نعت ہے

لَم یَاتِ نَظِیرُک فِی نظَرِ مثلِ تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سر سو ہے تجھ کو شہ دوسرا جانا

اب چند مثالیں خصائص نبوی اور معجزات و کمالات مصطفیﷺ کے حوالے سے پیش ہیں۔

تیری مرضی پا گیا سورج پھرا اُلٹے قدم
تیری انگلی اُٹھ گئی مہ کا کلیجہ چر گیا
تیری رحمت سے صفی اللہ کا بیڑا پار تھا
تیرے صدقے سے نجی اللہ کا بیڑا تر گیا
تیری آمد تھی کہ بیت اللہ مجرے کو جھکا
تیرے ہیبت تھی کہ ہر بت تھرتھرا کر گر گیا
کیوں جناب بوہریرہ تھا وہ کیسا جامِ شیر
جس سے ستر صاحبوں کا دودھ سے منہ پھر گیا
ترے خلق کو حق نے عظیم کیا ترے خلق کو حق نے جمیل کیا
کوئی تجھ سا ہوا ہے نہ ہوگا شہا ترے خالق حسن وادا کی قسم

مولا علی نے واری تری نیند پر نماز
اور وہ بھی عصر سب سے جو اعلیٰ خطر کی ہے
صدیق بلکہ غار میں جان اس پہ دے چکے
اور حفظ جاں تو جان فروض غرر کی ہے
ہاں تو نے ان کو جان انہیں پھیر دی نماز
پر وہ تو کر چکے تھے جو کرنی بشر کی ہے
کھائی قرآں نے خاک گزر کر قسم
اس کفِ پا کی حرمت پہ لاکھوں سلام

امام احمد رضؔا کی حیثیت اس صدی کے نعت گو شعراء میں میرِ کارواں کی ہے۔ آپ کی نعتوں نے فقط آپ کے دور کو نہیں بلکہ آنے والے ادوار کو بھی متاثر کیا۔ فقہی اور شرعی امور میں آپ سے شدید اختلاف رکھنے والے حضرات بھی جب نعت مصطفےٰ ﷺ کا تذکرہ کرتے ہیں تو تمام تر تعصب کے باوجود انہیں بھی ایوان نعت کی سب سے سربلند مسند پر حضرت رضؔا بریلوی کو ہی جگہ دینی پڑتی ہے۔ ایک مضمون کہ جہاں صفحات کی تنگ دامانی راہوار قلم کو آگے بڑھنے سے روک رہی ہو بھلا آپ کے تمام تر شعری اوصاف کا کس طور احاطہ کر سکتا ہے۔ آج فاضل بریلوی کی اثر آفریں نعت گوئی اپنی تاثر انگیزی کی گرفت کو اس قدر مضبوط کر چکی ہے، کہ فقط برصغیر میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے مسلم ممالک میں آپ کی شخصیت اور کلام پر تحقیقی کام کا سلسلہ جاری ہے۔ اس ضمن میں شفیق بریلوی کی کتاب ارمغانِ نعت کے حوالے سے کراچی میں ۱۹۷۵ء میں منعقد ہونے والی تعارفی تقریب میں مولانا کوثر نیازی کی یہ رائے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

"بریلی میں ایک شخص پیدا ہوا جو نعت گوئی کا امام تھا اور احمد رضا خاں جس کا نام تھا۔ ان سے ممکن ہے بعض پہلوؤں میں لوگوں کو اختلاف ہو۔ عقیدوں میں اختلاف ہو، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عشق رسول ﷺ ان کی نعتوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔"

مولانا احمد رضا خاں نے نعت گوئی میں قرآن حکیم سے بھرپور راہنمائی لی۔ اس ضمن میں ان کے فتاویٰ رضویہ بخوبی شاہد ہیں کہ وہ نعت گوئی کے تقاضوں کو کس درجہ سمجھتے تھے اور نعت گو شعراء سے کس درجہ احتیاط اور ادب کی توقع رکھتے تھے۔ قرآن حکیم اور اپنی شعر گوئی کے حوالے سے کہتے ہیں۔

ہوں اپنے کلام سے نہایت محظوظ
بے جا سے ہے المنۃ للہ محفوظ

قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی
یعنی رہے احکام شریعت ملحوظ

شاعری میں ان کے پیش نظر مداح رسول ﷺ سیدنا حسان بن ثابتؓ کی ذات گرامی مشعل راہ تھی اور موجودہ دور کے شعراء میں مولانا کفایت علی کافی کی نعت گوئی سے متاثر تھے۔ اکابر کے ہاں جس قدر اَدب واحتیاط کا غلبہ تھا۔ ویسا ہی منظروہ ہر دور کے نعت گوشعراء کے ہاں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

توشہ میں غم و اشک کا ساماں بس ہے
افغانِ دلِ زار و حدی خواں بس ہے
رہبر کی رہِ نعت میں گر حاجت نہ ہو
نقشِ قدم حضرتِ حساںؓ بس ہے

احتیاط اور اَدب کا یہ عالم تھا کہ ایک صاحب نے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنے اشعار سنانے کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا میں اپنے چھوٹے بھائی حسن میاں یا حضرت کافی بدایونی کا کلام سنتا ہوں (اس لیے کہ ان کا کلام میزان شریعت پر تلا ہوتا ہے) اگر چہ حضرت کافی کے ہاں لفظ ''رعنا'' استعمال ہوا ہے لیکن اگر وہ اپنی غلطی پر آگاہ ہو جاتے تو یقیناً اس لفظ کو بدل دیتے۔ پھر خیال خاطر احباب کے پیش نظر ان صاحب کو کلام سنانے کی اجازت عطا کر دی۔ ان کا ایک مصرعہ یوں تھا۔

شانِ یوسف جو گھٹی ہے تو اِسی در سے گھٹی

آپ نے فوراً اس شاعر کو ٹوک دیا اور فرمایا حضور اکرم ﷺ کسی نبی کی شان گھٹانے کے لیے نہیں بلکہ انبیائے کرام کی شان وشوکت کو سر بلند سے سر بلند کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ مصرعہ یوں بدل دیا جائے۔

شان یوسف جو بڑھی ہے تو اِسی در سے بڑھی

یہ احکامِ شریعت کو حد درجہ ملحوظ رکھنے ہی کا کمال تھا کہ مصرعہ کی تبدیلی سے مضمون انتہائی جاندار اور شریعت کے تقاضوں کے عین مطابق ہو گیا۔

رضا بریلوی کا دور مسلمانوں پر انتہائی مصیبت اور ابتلا کا دور تھا۔ حکومت تو ہاتھوں سے چھن چکی تھی۔ بد قسمتی سے مسلمان احساسِ زیاں سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ غیر مسلم قوتیں ان پر اپنے نظریات ٹھونس رہی تھیں اور دوسری طرف نیشنلسٹ مسلم زعماء وعلماء جبہ ودستار اور منبر ومحراب کے

وارث ہونے کے باوجود اسلامی نظریات کی شوکت دیرینہ کے تصور کو بھی پاش پاش کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ایسے عالم میں احمد رضا کا ذہن جاگ رہا تھا۔ ان کی نظریاتی سوچ بلندیوں کو چھو رہی تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کے نظریاتی اعتقادات سے بغاوت کرنے والی ہر قوت کو للکارا اور انہیں پیغام دیا۔

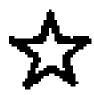
سونا جنگل رات اندھیری چھائی بدلی کالی ہے
سونے والو جاگتے رہیو چوروں کی رکھوالی ہے
آنکھ سے کاجل صاف چرالیں یاں وہ چور بلا کے ہیں
تیری گٹھڑی تاکی ہے اور تو نے نیند نکالی ہے

اور یہ نعت مصطفے علیہ السلام کا عملی فیضان ہی تھا کہ آپ کی آواز تاریخ کے سب سے بڑے حدی خوان کی صدائے دردناک بن کر برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں گھر کر گئی۔ آپ کو دشنام طرازیوں اور طعنوں کے طوفان سے گزرنا پڑا مگر آپ کی نظم اور نثر نے حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا۔ وہ محبت رسول میں کسی سمجھوتے کے قائل نہیں تھے اور اس سلسلہ میں انہیں اپنے قلم کی قوت اور سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و کرم کا پورا پورا احساس تھا۔

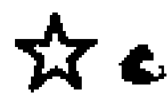
وہ رضا کے نیزے کی مار ہے کہ عدو کے سینے میں غار ہے
کسے چارہ جوئی کا وار ہے کہ یہ وار وار سے پار ہے

اور اس حقیقت میں کلام نہیں کہ رضا کے نیزے کی مار نے کتنے ہی اسلام دشمنوں کے عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ دوقومی نظریہ کے دشمنوں سے مثالی جنگ لڑی۔ گاندھی اور سبھاش چندر بوس کو راہنما بنانے والوں کا تعاقب کیا۔ پاکستان دشمنوں کو بے نقاب کیا۔ اس ضمن میں انہوں نے بڑے بڑے رہنماؤں کی پروا نہیں کی اور ان کو سرِ عام للکارا۔ ان کی نعت گوئی نے ایک موثر ہتھیار کا کردار ادا کیا۔ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اپنی شاعری سے کفر کے خلاف شمشیر و سنان کا کام لینے کا مشورہ دیا تھا اور واقعی انہوں نے ایسا ہی کر دیا۔ اسی طور پر رضا بریلوی نے اپنی نعت گوئی سے ایک زبردست نظریاتی حصار قائم کر دیا۔ اس سلسلہ میں ان کی زبان دانی فصاحت و بلاغت، تراکیب و تشبیہات، ضائع بدائع پر بھرپور گرفت اور اسلام سے غیر متزلزل وابستگی نے اہم کردار ادا کیا۔ رضا بریلوی کی زبان شستگی اور روانی میں اپنے سے پہلے کے ادوار اور اپنے دور کے اساتذۂ فن میں کسی سے کم نہیں بلکہ بعض حوالوں سے سبقت لے جاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

دل ہے وہ دل جو تری یاد سے معمور رہا
سر ہے وہ سر جو ترے قدموں پہ قربان گیا
لے خبر جلد کہ غیروں کی طرف دھیان گیا
میرے مولیٰ میرے آقا ترے قربان گیا
جان و دل ہوش و خرد سب تو مدینے پہنچے
تم نہیں چلتے رضا سارا تو سامان گیا



ہے لب عیسیٰ سی جاں بخشی نرالی ہاتھ میں
سنگ ریزے پاتے ہیں شریں مقالی ہاتھ میں
مالک کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں
دو جہاں کی نعمتیں ہیں ان کے خالی ہاتھ میں



کس کے جلوے کی جھلک ہے یہ اُجالا کیا ہے
ہر طرف دیدۂ حیرت زدہ تکتا کیا ہے
محمد ﷺ مظہرِ کامل ہے حق کی شانِ عزت کا
نظر آتا ہے اس کثرت میں کچھ انداز وحدت کا

ممتاز نقاد نیاز فتح پوری آپ کے علم و فضل اور شعری محاسن پر آپ کی بھرپور گرفت کے قائل تھے۔ انہوں نے فاضل بریلوی کو قریب سے بھی دیکھا اور ان کی شخصیت کا مشاہدہ کیا تھا ان کا کہنا ہے کہ "اُردو نعت کی تاریخ میں اگر کسی فردِ واحد نے شعرائے نعت پر سب سے زیادہ گہرے اثرات مرتسم کئے ہیں تو وہ بلاشبہ مولانا احمد رضا کی ذات ہے۔" اسی حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے مزید کہتے ہیں۔

"تبحرِ علمی" زور بیان اور وابستگی و عقیدت کے عناصر ان کی نعت میں یوں گھل مل اور رچ بس گئے ہیں کہ اُردو نعت میں ایسا خوشگوار امتزاج کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا...... اُردو نعت کی ترویج و اشاعت میں ان کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ کسی ایک شاعر نے اُردو نعت پر وہ اثرات نہیں ڈالے جو مولانا احمد رضا خاں کی ذات نے۔ اُنہوں نے نہ صرف یہ کہ اعلیٰ معیاری نعتیں تخلیق کیں بلکہ ان کے زیر اثر نعت کے ایک منفرد دبستان کی تشکیل ہوئی۔"

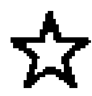
شاہ احمد رضا خاں نے مدحت سرکار ﷺ کے جس دبستان کی بنیاد ڈالی تھی اس کی بدولت آج ایک زمانہ ان کا ہمنوا نظر آتا ہے اور ہر دور میں ان کے ہمنواؤں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ فاضل بریلوی کو اوّل و آخر مدحتِ سرکار ﷺ سے سروکار تھا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد اسحٰق قریشی کے یہ جملے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

''نعت کے مشمولات میں خصائل وشمائل کا ذکر ہر نعت گو کے ہاں مرغوب رہا ہے۔ اس لیے کہ ان کا شمار ہی عظمت کا احساس دلاتا ہے۔ فاضل بریلوی کے ہاں خصائص میں وجہ تخلیق ہونا، سراپا نور ہونا، قاسم عطایا ہونا، سب سے افضل ہونا، سرتابقدم شانِ حق ہونا، جانِ ایمان ہونا، کائنات ہست و بود کی رونق و جلا ہونا اور مرکز عقیدت و محبت ہونا بہت نمایاں ہیں۔ یہ خصائص ان کے ایمان کا حصہ ہیں۔ اسی لیے ردیف اور قافیہ کے تنوع کے باوجود تذکرہ انہی کا ہوتا رہا۔''

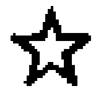
(نعت رنگ، ۱۸)

اسی حوالے سے دیکھیں تو رضا بریلوی مداحیٔ حضور ﷺ میں لہجہ بدل بدل کر نئے نئے مضامین کے پھول کھلاتے نظر آتے ہیں۔

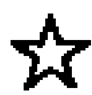
وہی نورِ حق وہی ظلِ رب، ہے انہی کا سب ہے انہیں سے سب
نہیں ان کی ملک میں آسماں کہ زمیں نہیں کہ زماں نہیں



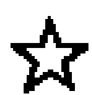
پردہ اس چہرۂ انور سے اُٹھا کر اک بار
اپنا آئینہ بنا اے مہِ تاباں ہم کو



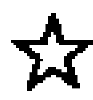
وہ جو نہ تھے تو کچھ نہ تھا وہ جو نہ ہوں تو کچھ نہ ہو
وہ جاں ہیں دوجہان کی جان ہے تو جہان ہے



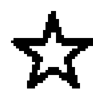
شہا کیا ذات تیری حق نما ہے فردِ امکاں ہے
جلتے بجھا دیئے ہیں روتے ہنسا دیئے ہیں



رضا پل سے اب وجد کرتے گزریئے
کہ ہے رَبِّ سَلِّم صدائے محمد ﷺ



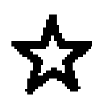
شفاعت کرے حشر میں جو رضا کی
سوا تیرے کس کو یہ قدرت ملی ہے



فریاد اُمتی جو کرے حالِ زار پر
ممکن نہیں کہ خیر بشر کو خبر نہ ہو

مدعا طلبی یا طلبِ شفاعت شعرائے نعت کا خاص جزو رہا ہے۔ استغاثہ اور پھر توسل انہیں اپنے ممدوح کی عظمت کے اظہار اور اپنی بے کسی و بے بسی کے اقرار کا قرینہ بخشتا ہے۔ اگر مدعا طلبی شاہانِ دنیا سے ہو تو یہاں بڑے سے بڑا قصیدہ بھی پست نظر آتا ہے لیکن اگر مدعا طلبی محبوب دو عالم ﷺ سے ہو تو پھر نعت گو کی ہر فکری کاوش اَدب عالیہ کی بلندیوں کو چھوتی نظر آتی ہے۔ نعت میں بات فقط قوافی و اوزان کی نہیں بلکہ یہاں تو توسل اور شفاعت طلبی کے لیے شاعر کی بلند خیالی بطور خاص مدنظر رکھی جاتی ہے۔ فاضل بریلوی کے ہاں یہ مضمون ہر بار نئے انداز اور نئے حسن سے جلوہ گر نظر آتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مرکز و محور ہی حضور ﷺ کی رحمتِ بے کراں کا حصول ہے۔ فاضل بریلوی کے ہاں علم شریعت، قرآن و حدیث اور سچے جذبوں کا توازن ہے۔ وہ استغاثہ بھی پیش کرتے ہیں تو آقا و مولا ﷺ کی سیرت نگاری کو بھی مدنظر رکھتے ہیں' کہتے ہیں۔

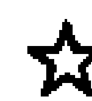
عرش سے مژدۂ بلقیس شفاعت لایا
طائر۔ سدرہ نشیں مرغِ سلیمانِ عرب



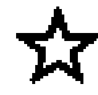
مجرم ہوں اپنے عفو کا ساماں کروں شہا
یعنی شفیع روزِ جزا کا کہوں تجھے



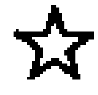
سنتے ہیں کہ محشر میں صرف اُن کی رسائی ہے
گر اُن کی رسائی ہے لو جب تو بن آئی ہے



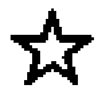
اَنت فیہم نے عدو کو بھی لیا دامن میں
عیشِ جاوید مبارک تجھے شیدائی دوست



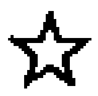
مجرم کو بارگاہ عدالت میں لائے ہیں
تکتا ہے بے کسی میں تری راہ لے خبر



اہلِ عمل کو ان کے عمل کام آئیں گے
میرا ہے کون تیرے سوا آہ لے خبر



مانگیں گے مانگے جائیں گے منہ مانگی پائیں گے
سرکار میں نہ ''لا'' ہے نہ حاجت اگر کی ہے



لب وا ہیں آنکھیں بند ہیں پھیلی ہیں جھولیاں
کتنے مزے کی بھیک ترے پاک در کی ہے
منگتے کا ہاتھ اُٹھتے ہی داتا کی دین تھی
دوری قبول و عرض میں بس ہاتھ بھر کی ہے

جب ہم اُمت اسلام پر بپا ہونے والے صدمات اور مصائب کا ذکر کرتے ہیں تو الطاف حسین حالی کی یہ مناجات ہر عہد کی ترجمانی کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

اے خاصہء خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

یہ استغاثہ یا نوحہ اُمتِ اسلام سقوطِ بغداد سے لے کر سقوط ڈھاکا تک ہر عہد اور ہر زمانے میں زوال آمادہ مسلمانوں کے رنج والم کا ترجمان ہے۔ حالی کے اس استغاثے نے اُردو اَدب میں باقاعدہ استغاثہ نگاری کی بنیاد رکھی اسی کیفیت کی ترجمانی کرتی ہوئی رضا بریلوی کی صدائے غمناک اُبھری۔

البحر علا والموج طغےٰ مَن بے کس وطوفاں ہوش ربا
منجدھار میں ہوں بگڑی ہے ہوا، موری نیا پار لگا جانا

پُر شکستہ لمحات میں غم کے ماروں کی نگاہیں سوئے مدینہ ہی اُٹھتی ہیں۔ یہاں فاضل بریلوی کے آنسو بارگاہِ رسول ﷺ میں شرحِ غم بیان کر رہے ہیں۔

نعت کہتے ہوئے فاضل بریلوی کہیں بھی یاس وقنوطیت کا شکار نہیں ہوتے۔ان کا حضورﷺ سے عشق وارادت کا رشتہ اس قدر مضبوط، غیر متزلزل اور مستحکم ہے کہ وہ راہ حیات سے لے کر میدانِ حشر تک کہیں بھی مایوس و نا اُمیدی کو قریب نہیں آنے دیتے۔وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے جس ذاتِ والا صفات کو اپنا رہبر و راہنما مانا ہے وہ محبوب دو عالم اور ممدوحِ خدا و ملائکہ ہے۔یہ وہ ذات ہے جس کے سر اقدس پر شفاعت کا نور آفریں تاج جگمگا رہا ہے۔جس کے ماتھے پر عفوو درگزر اور لطف و کرم کا جمال اپنی بہار دکھا رہا ہے۔اس سلسلہ میں ڈاکٹر سلام سندیلوی کی رائے ملاحظہ کیجئے۔

''جہاں تک امام احمد رضا خاں کی شاعری کا تعلق ہے وہ رسمی یا روایتی نہیں۔آپ کو مذہب سے زبردست علاقہ تھا۔آپ کو بزرگانِ دین سے عقیدت تھی۔آپ حُبِ رسول ﷺ میں غرق تھے۔اس لیے آپ کی شاعری میں صداقت موجود ہے۔آپ کی شخصیت اور شاعری کے درمیان فاصلہ نہیں ہے بلکہ آپ کی شخصیت آپ کی شاعری ہے اور آپ کی شاعری آپ کی شخصیت، شخصیت اور شاعری میں اس قدر ہم آہنگی اُردو کے بہت کم شعراء کے یہاں نکلے گی۔''

(المیزان، امام احمد رضا نمبر ص ۴۶۶)

اسی بات کو آگے بڑھانے میں سید شان الحق حقی کی رائے کا مطالعہ کیجئے۔

''میرے نزدیک مولانا کا نعتیہ کلام اَدبی تنقید سے مُبرا ہے۔اس پر کسی اَدبی تنقید کی ضرورت نہیں ہے۔اس کی مقبولیت اور دل پسندی ہی اس کا سب سے بڑا اَدبی کمال اور مولانا کے مرتبے پر دال ہے۔''

(خیابانِ رضا ص ٦٦)

ان دونوں آراء کو دیکھئے تو ہماری متذکرہ بالا رائے کو تقویت ملتی ہے کہ رضا بریلوی کی روحانی اور فقہی شخصیت اور آپ کی شاعری ایک دوسرے میں گم ہو گئی تھیں۔حضورﷺ کی رحمت بے کراں پر آپ کا بھروسہ فقط آپ کی شاعری کا خاصہ ہی نہیں تھا بلکہ آپ اپنی شخصیت اور نظریات کے لحاظ سے اس پر کامل ایمان بھی رکھتے تھے۔حضورﷺ کی نگاہِ عنایت بے کراں پر آپ کا کس قدر بھروسہ تھا اس کو آپ نے مکالماتی اسلوب میں بیان کیا ہے۔کمال کی روانی ہے۔غضب کا لسانی خرام ہے کہ پڑھنے والا آپ کی فکر کی بلند پروازی کے ساتھ ساتھ محو پرواز نظر آتا ہے۔

بے بسی ہے جو مجھے پرسشِ اعمال کے وقت
دوستو کیا کہوں اس وقت تمنا کیا ہے

کاش فریاد مری سن کے یہ فرمائیں حضورؐ
ہاں کوئی دیکھو! یہ کیا شور ہے! غوغا کیا ہے
کون آفت زدہ ہے؟ کس پہ بلا ٹوٹی ہے
کس مصیبت میں گرفتار ہے صدمہ کیا ہے
کس سے کہتا ہے کہ للہ خبر لیجئے میری
کیوں ہے بے تاب یہ بے چینی کا رونا کیا ہے
یوں ملائک کریں معروض کہ اک مجرم ہے
اس سے پرسش ہے بتا تو نے کیا کیا کیا ہے
سامنا قہر کا ہے دفتر اعمال میں پیش
ڈر رہا ہے کہ خدا حکم سناتا کیا ہے
آپ سے کرتا ہے فریاد کہ یا شاہِ رسل
بندہ بے کس ہے شہا رحم میں وقفہ کیا ہے
سن کے یہ عرض مری بحرِ کرم جوش میں آئے
یوں ملائک کو ہو ارشاد ٹھہرنا کیا ہے
پھر وہ آیا مرا حامی مرا غم خوار اُمم
جانِ تن بے جاں میں یہ آنا کیا ہے

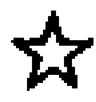
اب یہاں احمد فاضل بریلوی کی روح بے قرار کو قرار آنے لگتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

پھر مجھے دامنِ اقدس میں چھپا لیں سرور
اور فرمائیں ہٹو اس پہ تقاضا کیا ہے
بندہ آزاد شدہ ہے یہ ہمارے در کا
کیسے لیتے ہو حساب اس پہ تمہارا کیا ہے
صدقے اس رحم کے اس سایۂ دامن پہ نثار
اپنے بندے کو مصیبت میں بچایا کیا ہے
اے رضا جانِ عنادل ترے نغموں کے نثار
بلبلِ باغ مدینہ ترا کہنا کیا ہے

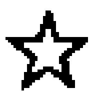
چھوٹی زمینوں میں دل نشیں اشعار کہنا بہت مشاق شاعر کا کام ہے۔ اس میں زبان بہت

آسان اختیار کرنی پڑتی ہے۔ کم از کم لفظوں میں بڑے سے بڑے مضمون کو قلم بند کرنا ہوتا ہے۔ اساتذہ فن کے ہاں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جو چھوٹی زمینوں میں کہے گئے مگر قبولیت دوام پا گئے۔ رضا بریلوی نے چھوٹی زمینوں میں نہایت آسان زبان میں کامیاب نعتیں کہی ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار درج کئے جاتے ہیں تا کہ آپ کی قادر الکلامی کا یہ پہلو بھی سامنے آسکے۔

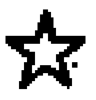
غم ہوگئے بے شمار آقا
بندہ تیرے نثار آقا
مجبور ہیں ہم تو فکر کیا ہے
آقا آقا سنوار آقا



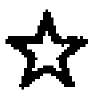
عاصیو تھام لو دامن ان کا
وہ نہیں ہاتھ جھٹکنے والے
ارے یہ جلوہ گہِ جاناں ہے
کچھ ادب بھی ہے پھڑکنے والے



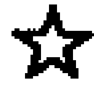
دل کو ان سے خدا جدا نہ کرے
بے کسی لوٹ لے خدا نہ کرے



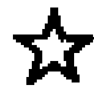
لطف ان کا عام ہو ہی جائے گا
شاد ہر ناکام ہو ہی جائے گا
بے نشانوں کا نشاں مٹتا نہیں
مٹتے مٹتے نام ہو ہی جائے گا



زہے عزت و اعتلائے محمد ﷺ
کہ ہے عرش حق زیر پائے محمد ﷺ
محمد ﷺ برائے جناب الٰہی
جناب الٰہی برائے محمد ﷺ



حرزِ جاں ذکر شفاعت کیجئے
نار سے بچنے کی صورت کیجئے
آپ ہم سے بڑھ کے ہم پر مہرباں
ہم کریں جرم آپ رحمت کیجئے



مصطفیٰ خیرالوریٰ ہو
سرورِ ہر دوسرا ہو
ہم وہی ننگِ جفا ہیں
تم وہی جانِ وفا ہو



انبیاء کو بھی اَجل آنی ہے
مگر ایسی کہ فقط آنی ہے
پاؤں جس خاک پہ رکھ دیں وہ بھی
پاک ہے روح ہے نورانی ہے



وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں
تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں

مولانا احمد رضا خاں کی شاعری کو وہ کمال حاصل ہوا کہ آج تک اس کی مقبولیت و دل پسندی میں کمی واقع نہیں ہوسکی بلکہ تمام اصحابِ تنقید و تاریخ کے مطابق ہر آنے والا دور اُن کی نعتیہ شاعری کی مقبولیت و ہردلعزیزی میں اضافہ کر رہا ہے صرف آپ کی نعت گوئی پر ہی ڈاکٹریٹ اور ایم فل کی ڈگریوں کے علاوہ یونیورسٹیوں کے مقالہ جات کا شمار کرنے بیٹھیں تو عقل محو حیرت ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید نے آپ کی نعتیہ شاعری کا احاطہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔

''کسی ایک نعت گو نے اُردو نعت پر وہ اثرات نہیں ڈالے جو مولانا احمد رضا خاں کی نعت گوئی نے، انہوں نے نہ صرف یہ کہ اعلیٰ معیاری نعتیں تخلیق کی ہیں بلکہ ان کے زیر اثر ایک منفرد دبستان کی تشکیل ہوئی۔''

ان کی نعت گوئی کی مقبولیت اور شہرت نے دوسرے شاعروں کو نعت گوئی کی ترغیب دی۔ سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ عاشقانِ رسول ﷺ کے لیے آج بھی ان کا کلام ایک موثر تحریک نعت کا درجہ رکھتا ہے۔" جوں جوں ہم رضا بریلوی کی نعتیہ شاعری کی گہرائیوں میں اُترتے ہیں ان کا وجود ایک رجحان ساز شاعر کی حیثیت سے سامنے آتا ہے انہوں نے برصغیر پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ کے باطنی جذبات کو اپنی قلبی واردات سے ہم آہنگ اور مربوط کر کے صنفِ نعت کو نئے تخلیقی امکانات سے روشناس کرایا۔ قلبی تطہیر، ذہنی طہارت، ایمان افروزی کی بدولت ان کی نعتیں دنیائے شعروسخن کے نعتیہ اَدب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ بہت سے تذکرہ نگاروں نے انہیں اپنی ذات میں ایک پوری کائنات اور نعت کا ایک مکمل دبستان تسلیم کیا ہے۔ بلاشبہ "حدائق بخشش" فن کا معجزہ اور سرچشمہ فیض ہے۔ حدائق بخشش میں حضرت رضا بریلوی نے بعض مشہور اساتذۂ فن کی زمینوں میں بھی طبع آزمائیاں کی ہیں اس سے ان کا مقصد تفاخرِ فن کا اظہار نہیں تھا بلکہ وہ توصیف رسول ﷺ کے حوالے سے ہر رنگ اور ہر پیرایہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ اسد اللہ خاں غالبؔ نے "کیوں" کی ردیف میں ایک غزل کہی جبکہ امام احمد رضا نے اس ردیف میں دو نعتیں کہی ہیں۔ کالی داس گپتا رضا نے غالب اور رضا بریلوی کے ایک ایک شعر کے حوالے سے موازنہ پیش کیا ہے۔

غالب

ہاں نہیں وہ خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

رضا

پھر کے گلی گلی تباہ ٹھوکریں سب کی کھائے کیوں
دل کو جو عقل دے خدا تیری گلی میں جائے کیوں

کالی داس گپتا رضا لکھتے ہیں۔ مولانا نے "میں" "کو" "سے" سے بدل کر نعت کہنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ نعت اور غزل کو یک جان کرنا اسی کو کہتے ہیں۔ (سہ و سراغ، المیزان کا امام احمد رضا نمبر)

ان کا موازنہ ایک اور شعر میں دیکھئے۔

غالب

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

رضا

یادِ حضور کی قسم غفلتِ عیش ہے ستم
خوب ہیں قیدِ غم میں ہم کوئی ہمیں چھڑائے کیوں

دونوں کے ہاں اسلوب کا بانکپن خوب ہے لیکن غالب کے یہاں قنوطیت ہے اور رضا کے ہاں رجائیت دوسری نعت کے دو تین اشعار میں اسلوب کا بانکپن دیکھئے۔

یادِ حرم ستم کیا دشت حرم ہے لائی کیوں
بیٹھے بیٹھائے بد نصیب سر پہ بلا بٹھائی کیوں
کس کی نگاہ کی حیا پھرتی ہے میری آنکھ میں
نرگسِ مست ناز نے مجھ سے نظر چرائی کیوں

اس طرح غالب کی ایک غزل ''کہ یوں'' کی ردیف میں ہے۔ یہ نہایت مشکل ردیف ہے جس سے غالب جیسا بلند فکر ہی عہدہ برآ ہوسکتا تھا مگر یہاں بھی امام احمد رضا کا قلم اپنے فنِ نعت گوئی کی جولانیاں دکھاتا نظر آتا ہے۔

قصر دنیٰ کے راز میں عقلیں تو گم ہیں جیسی ہیں
روحِ قدس سے پوچھیے تم نے بھی کچھ سنا کہ یوں
دل کو ہے فکر کس طرح مُردے جلاتے ہیں حضور
اے میں فدا لگا کر ایک ٹھوکر اسے بتا کہ یوں

اسی طرح آپ کی بعض نعتیں امیر مینائی، داغ دہلوی کی زمین اور ردیفوں میں بھی ملتی ہیں۔ جن میں آپ نے اسلوب کے بانکپن سے اشعار کے ایسے ایسے گل وسمن کھلائے ہیں جن سے ان کی معنی آفرینی اندازِ بیان، سربلند تخیل اور لطافت خیال کا اظہار ہوتا ہے ورنہ جہاں تک تقابل کا تعلق ہے تو نہ وہ امام احمد رضا کے پیش نظر تھا اور نہ ہی ہمارا موضوع ہے۔

سراپا نگاری ہر دور کے شعراء کے پیشِ نظر رہی ہے۔ عربی، فارسی، اُردو اور پنجابی سمیت تمام زبانوں کے شعراء نے اپنے اپنے انداز فکر کے مطابق حضور ﷺ کے سراپائے اقدس کے بارے میں اشعار رقم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُردو میں محسن کاکوروی کی شاعری اس کی روشن مثال ہے۔ لیکن اس ضمن میں جو کمال امام احمد رضا کے حصے میں آیا وہ کسی اور کا مقدر نہیں بن سکا۔ متفرق نعتیہ اشعار اپنی جگہ' ان کی نعتوں میں تو بعض مقامات پر سراپا نگاری کے حوالے سے مسلسل اشعار جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ قصیدہ سلامیہ میں تو سراپا نگاری کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اس ضمن

میں چند ایسے اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن میں حضور ﷺ کے سراپائے مبارک کی نورانی جھلکیاں دلوں کے ایوانوں کو جگمگاتی محسوس ہوتی ہیں۔ محبوبانِ مجازی کا سراپا لکھتے ہوئے مبالغہ آرائی اپنی بلندیوں کو چھونے لگتی ہے مگر نعت میں تو مبالغہ آرائی بھی پابندِ شریعت ہو کر رہ جاتی ہے اور پھر امام احمد رضا کا قلم جو شریعت کی حدود سے لحہ بھر بھٹکنے کو بھی تیار نہیں ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

سر تا بقدم ہے تنِ سلطانِ زمن پھول
لب پھول دہن پھول ذقن پھول بدن پھول
دندان و لب و زلف و رخِ شہ کے فدائی
ہیں دُرِ عدن لعلِ یمن مشکِ ختن پھول
کیا غازہ ملا گردِ مدینہ کا جو ہے آج
نکھرے ہوئے جوبن میں قیامت کی پھبن پھول
دل اپنا بھی شیدائی ہے اس ناخنِ پا کا
اتنا بھی مہِ نو پہ نہ اے چرخِ کہن پھول
دل بستہ و خوں گشتہ نہ خوشبو نہ لطافت
کیوں غنچہ کہوں ہے مرے آقا کا دہن پھول

☆

حسن کھاتا ہے جس کے نمک کی قسم
وہ ملیحِ دل آرا ہے ہمارا نبی

☆

گلزارِ قدس کا گلِ رنگیں کہوں تجھے
درمانِ دردِ بلبلِ شیدا کہوں تجھے

☆

نارِ دوزخ کو چمن کر دے بہارِ عارض
ظلمتِ حشر کو دن کر دے نہارِ عارض
میں تو کیا چیز ہوں خود صاحبِ قرآن کو شہا
لاکھ مصحف سے پسند آئی بہارِ عارض

ہم تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے فقط یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ ”حدائق بخشش“ کے

دوسرے درجنوں اشعار کے ساتھ ساتھ آپ کے قصیدہ سلامیہ کے پہلے حصے کا بغور مطالعہ کیا جائے قصیدہ سلامیہ کے اشعار میں آپ کے سر اقدس کے گیسوؤں سے لے کر آپ کے پائے اقدس کے ناخنوں تک کو شعری حسن عطا کیا گیا ہے۔

لیلۃ القدر میں مطلع الفجر میں
مانگ کی استقامت پہ لاکھوں سلام
جس کے سجدے کو محراب کعبہ جھکی
ان بھوؤں کی لطافت پہ لاکھوں سلام
جس طرف اُٹھ گئی دم میں دم آ گیا
اس نگاہِ عنایت پہ لاکھوں سلام

غرضیکہ اس حوالے سے بھی امام احمد رضا کی شاعری کا مطالعہ کریں تو یہاں بھی ایک حیرت کدہ نظر آتا ہے کہ آپ کے قلم نے جدھر بھی رخ کیا اپنی قادر الکلامی اور شعری سرفرازی کے سکے بٹھا دیئے۔ آپ نے سراپا نگاری میں اگرچہ تشبیہات و تراکیب اور دوسرے صنائع بدائع کا استعمال کیا ہے مگر دامانِ شریعت کو کہیں بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا یہاں بھی آپ کی انفرادی احتیاط پسندی شعریت اور شریعت کے امتزاج کا خراج لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ امام احمد رضا نے قصائد بھی رقم کیے مگر شاہان عجم کے نہیں۔ قصیدہ ایک مشکل صنفِ سخن ہے جو بہت سے لوازمات کا تقاضا کرتی ہے مگر احمد رضا تو بہت پہلے ہی یہ اعلان کر چکے ہیں۔

کرے مدح اہلِ دول رضا پڑے اس بلا میں مری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا مرا دین پارۂ ناں نہیں

آپ کی فضیلت اَدبی اور علمی مقام و مرتبہ کو دیکھتے ہوئے کئی ریاستوں کے اُمرا اور سلاطین نے آپ سے اپنے ہاں آنے کی درخواست کے ساتھ ساتھ ہی یہ استدعا بھی کی کہ وہ آپ کے علمی اشغال کے تسلسل کے لیے مستقل اعزازی وظائف بھی مقرر کریں گے مگر جو محبت مصطفیٰ ﷺ بازارِ حسنِ حضور ﷺ میں بک چکا ہو وہ کسی اور خریدار کی طرف کیا دیکھے۔ آپ نے بصد خلوص انکار فرما دیا یہ کہتے ہوئے کہ میرے رب کریم نے اپنے حبیب کریم ﷺ کی جانب سے اتنا کچھ عطا کر رکھا ہے کہ اب کسی اور جانب نظر ہی نہیں اُٹھتی...... شاہان عجم اور سلاطین ہند کی پیش کشوں کو آپ نے پائے استحقار سے ٹھکرا دیا اور پھر جب سلطان عالم ﷺ کی قصیدہ نگاری کی جانب متوجہ ہوئے تو انوار کی برسات ہونے لگی۔ کس کس قصیدہ کا ذکر کیجئے ہر جگہ ہی عقیدت اور محبت و وارفتگی کا حسن

پھیلا ہوا ہے۔ چند قصائد کے مطلع پیش نظر ہیں۔

قصیدہ نوریہ

صبح طیبہ میں ہوئی بٹتا ہے باڑا نور کا
صدقہ لینے نور کا آیا ہے تارا نور کا

قصیدہ سلامیہ

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

قصیدہ معراجیہ

وہ سرورِ کشورِ رسالت جو عرش پر جلوہ گر ہوئے تھے
نئے نرالے طرب کے ساماں عرب کے مہمان کے لیے تھے

قصیدہ درود

کعبہ کے بدر الدجیٰ تم پہ کروڑوں درود
طیبہ کے شمس الضحیٰ تم پہ کروڑوں درود

ان طویل قصائد کے علاوہ آپ نے حضرت صدیق اکبرؓ حضرت فاروق اعظمؓ، حضرت علی المرتضیٰؓ، سیدہ خاتون جنت اور سیدہ عائشہ صدیقہؓ کی شان میں بھی مختصر قصائد کہے ہیں۔ ان قصائد کے علاوہ آپ نے ایک قصیدہ ''اصلاحات ہیئت'' بھی کہا ہے۔ یہ بھی نعتیہ قصیدہ ہے جس میں تمام تر علم ہیئت اور علم نجوم کی اصطلاحات ہیں۔ پورا قصیدہ ۱۵۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس قصیدہ کی بدولت جہاں آپ صنف قصیدہ پر غیر معمولی دسترس رکھتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں علم ہیئت اور علم نجوم آپ کے افکار کی کاسہ گدائی کرتے نظر آتے ہیں۔ سچ ہے کہ

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

آپ کی علمی وفقہی اور شعری سربلندیوں کے حوالے سے فکرِ رضا کے عظیم نقاد اختر الحامدی کی رائے ملاحظہ ہو۔

''آپ کا مجموعہ نعت حدائق بخشش نہ صرف عشق حبیب کی شعری تصویر ہے بلکہ نعت حبیب کا وہ مشرق ہے جس سے آفتاب عرب کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں جو آنکھوں کے راستے دل میں اُتر کر کائنات حیات کو منور کر دیتی ہیں۔ سوز و درد اور جذب واثر نے الفاظ کو گویا زبان دے دی ہے اور وہ کوئے حبیب کی حدیثِ عشق سنا رہے ہیں۔ یہ خصوصیت یہ انداز بیان، یہ سلیقہ

نعت آپ کے علاوہ اور کسی کے ہاں نظر نہیں آتا۔ آپ نے الفاظ میں عشق حبیب کا وہ طلسم پھونک دیا ہے کہ مفاہیم کی پرت پرت کھولتے چلے جایئے مگر شاعر کے جذبے کی گہرائی ہاتھ نہیں آنے پاتی۔"
(معارف رضا سالنامہ ۱۹۸۶ ص ۱۶۷)

جس سلیقہ نعت کا اختر الحامدی نے تذکرہ کیا ہے اسے اسلوب کی انفرادیت اور بیان کی یکتائی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے مدد سے شاعر اپنے حسنِ تخیل اور حقائق کے امتزاج سے زبان و بیان کا حسن بکھیر کر اس انداز میں بات کہہ جاتا ہے کہ پڑھنے والا حیرت میں گم ہو جائے۔ ایک حقیقت کو شاعری کا ملبوس عطا کر دینا یا ایک مسلمہ بات کو اسلوب کی ندرت کی بدولت ایسے بیان کرنا کہ کسی اور کو سوجھی ہی نہ ہو۔ طرزِ ادا کی یہی رنگینی اور طرفگی ہی رضا بریلوی کے کلام کو دوام بخشش رہی ہے۔ شاہ احمد رضا نے اپنے علم و فضل زبان و بیان کی مہارت شعری حرکت اور ان سب پر مستزاد محبت رسول ﷺ کی حدت و شدت کو بروئے کار لا کر اپنی شاعری کا بانکپن بخشا ہے۔

عرش جس خوبیٔ رفتار کا پامال ہوا
دو قدم چل کے دکھا سروِ خراماں ہم کو
جس تبسم نے گلستاں پہ گرائی بجلی
پھر دکھا دے وہ ادائے گلِ خنداں ہم کو
تنگ آئے ہیں دو عالم تیری بے تابی سے
چین لینے دے تپ سینۂ سوزاں ہم کو

حضور ﷺ کی ختم المرسلینی اُمت اسلام کا مسلمہ ایمان ہے۔ رضا بریلوی کے ہاں یہ مضمون ایک نئے انداز میں دیکھئے۔

نہ رکھی گل کے جوشِ حسن نے گلشن میں جا باقی
چٹکتا پھر کہاں غنچہ کوئی باغِ رسالت کا

درج ذیل شعر دیکھئے کہ آپ نے امتناع النظیر کے مشکل مسئلہ کو کس ادا سے آسان اور زود فہم بنا دیا ہے۔

ترا قد تو نادرِ دہر ہے کوئی مثال ہو تو مثال دے
نہیں گل کے پودوں میں ڈالیاں کہ چمن میں سروِ چماں نہیں

فاضل بریلوی اپنی دلی کیفیت اور قلبی واردات کا اظہار طرز ادا کی کس رنگینی اور بانکپن سے کرتے ہیں۔ ایک نظر دیکھئے۔

دل کو ان سے خدا جدا نہ کرے
بے کسی لوٹ لے خدا نہ کرے
دل کہاں لے چلا حرم سے مجھے
ارے تیرا برا خدا نہ کرے

حسین تشبیہات اور استعارات کے ساتھ اسلوب بیان کا انوکھا پن دیکھئے۔ زمین بھی مشکل ہے اور یہ اشعار وصف گیسوئے رسول میں کہے گئے ہیں۔

کعبہ جاں کو پہنایا ہے غلافِ مشکیں
اُڑ کے آئے ہیں جو ابرو پہ تمہارے گیسو
سلسلہ پا کے شفاعت کا جھکے پڑتے ہیں
سجدۂ شکر کے کرتے ہیں اشارے گیسو
مژدہ ہو قبلہ سے گھنگھور گھٹائیں آئیں
ابروؤں پر وہ جھکے جھوم کے پیارے گیسو

امام احمد رضا کی اسی قادر الکلامی اور زبان و بیان کی ندرت کے لحاظ سے معروف محقق شمس بریلوی کی اس رائے کو پیش نظر رکھیے۔

''جناب رضا قدس سرہٗ خاصانِ بارگاہ مصطفوی ﷺ میں بہت ممتاز تھے۔ آپ کے یہاں منزل عشق کے تمام مدارج موجود ہیں۔ آپ نے اس راہ کو بڑی احتیاط سے طے فرمایا ہے۔ آپ نے فراق کا بیان بھی ملاحظہ فرمایا اور فراق کی ستم رانیوں کا ذکر بھی سنا۔ دیار محبوب کا اشتیاق بھی ہے اور درِ محبوب پر عرض بھی فرما رہے ہیں لیکن تقدیس و تکریم کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا اور یہی وہ خصوصیت ہے جو جناب رضا کو تمام نعت گو شعراء میں اسی طرح ممتاز کرتی ہے جس طرح علم شریعت و طریقت میں آپ کا مقام دیگر علمائے کرام سے بہت ارفع و اعلیٰ تھا۔''

(علامہ شمس بریلوی حدائق بخشش کا ادبی جائزہ ص ۲۲۵)

گویا تمام محققین اور صاحبانِ اسرارِ تحقیق اس امر پر متفق ہیں کہ حضرت احمد رضا خاں کے مضامین میں غیر معمولی تنوع پایا جاتا ہے۔ انہوں نے نعت کے میدان کو چنا اور اس میں ہر قسم کے مضامین بیان کر کے ثابت کر دیا کہ نعت ہر قسم کے تخیلات کو شعری جامہ پہنانے کی قوت رکھتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ صنف نعت کے تقدس اور پاکیزگی کو کسی لمحہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے اور ممدوحِ نعت ﷺ کے مقاماتِ عالیہ کے انوار سے دل و جاں کو ہر آن بسا کر رکھا جائے۔

احمد رضا خاں کی شعری بلندیوں کا کیا کہنا۔ آپ نے تو پامال سے پامال مضامین کو بھی محبت رسول ﷺ کے حوالے سے تروتازہ اور حاصل اَدب بنادیا ہے۔

یہاں ہم احمد رضا خاں کے چند ایسے اشعار درج کر رہے ہیں جو ان کے فکری شکوہ کی علامت ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حسنِ بیان نے مضمون کو کیا سے کیا بنا دیا۔ آپ نے حضور ﷺ کی آمد کا تصور نگاہوں میں بسا رکھا ہے۔

الٰہی منتظر ہوں وہ خرامِ ناز فرمائیں
بچھا رکھا ہے فرش آنکھوں نے کم خوابِ بصارت کا
رضائے خستہ جوشِ بحرِ عصیاں سے نہ گھبرانا
کبھی تو ہاتھ آجائے گا دامن اُن کی رحمت کا

اور یہاں بھی رحمت مصطفےٰ ﷺ کا تصور دیکھئے۔

بیچ ہے آگ کا دریا حائل
قصد اس پار ہے کیا ہوتا ہے
کیوں رضا کڑھتے ہو ہنستے اُٹھو
جب وہ غفار ہے کیا ہوتا ہے
عرش جس خوبیء رفتار کا پامال ہوا
دو قدم چل کے دکھا سروِ خراماں ہم کو
جس تبسم نے گلستان پہ ہے گرائی بجلی
پھر دکھا دے وہ ادائے گُلِ خنداں ہم کو

پھر تکوین عالم پر یہ اشعار دیکھئے

انہی کی بو مایۂ سمن ہے انہی کا جلوہ چمن چمن ہے
انہی سے گلشن مہک رہے ہیں انہی کی رنگت گلاب میں ہے
وہ گل ہیں لب ہائے نازک ان کے ہزاروں جھڑتے ہیں پھول جن سے
گلاب گلشن میں دیکھے بلبل یہ دیکھ گلشن گلاب میں ہے

خدا بھی کریم ہے اس نے اپنے محبوب ﷺ کو ہمہ تن کرم بنایا ہے۔ خدا تو خالق کائنات ہے۔ محمد رسول ﷺ محبوبِ شش جہات، رب دو عالم نے اپنے محبوب کو عظمتوں کی وہ بلندیاں عطا کیں کہ انسانی عقل ان کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ حضور ﷺ تمام تر نورانی اور بشری سرفرازیاں حاصل کر

کے بھی کمال عجز سے خود کو خدا کے سامنے شکر گزار بندہ تصور کرتے ہیں۔ نعت میں افراط و تفریط کی گنجائش نہیں بڑے بڑے صاحبانِ فکر فرطِ عشق میں جادۂ حق سے بھٹک گئے اور حمد و نعت میں قدرے شوخ بیانی کا مظاہرہ کر گئے مگر یہاں تھے اُمت اسلام کے سب سے بڑے فقیہ اور شریعت پر حد درجہ دسترس رکھنے والے احمد رضا خاں جو اپنے اشعار اور نثر میں زمانے بھر کو حمد و نعت کا امتیاز سکھا رہے ہیں آیئے ہم اس ایمان آفریں ماحول کا ایک جلوہ دیکھنے کے لیے ان کے تین چار اشعار پیش کرتے ہیں۔

سرور کہوں کہ مالک و مولا کہوں تجھے
باغِ خلیل کا گلِ زیبا کہوں تجھے
اللہ رے تیرے جسمِ منور کی تابشیں
اے جانِ جاں میں جانِ تجلا کہوں تجھے
تیرے تو وصف عیبِ تناہی سے ہیں بری
حیراں ہوں میرے شاہا میں کیا کیا کہوں تجھے
گلزارِ قدس کا گلِ رنگیں ادا کہوں
درمانِ دردِ بلبلِ شیدا کہوں تجھے

اس طویل نعت کا یہ مقطع ہمیں شاہ احمد رضا خاں کی زبان سے آدابِ عبدیت سکھا جاتا ہے۔

لیکن رضا نے ختم سخن اس پہ کر دیا
خالق کا بندہ خلق کا مولا کہوں تجھے

تاریخ نعت گوئی کا مطالعہ جہاں ہمیں امام احمد خاں فاضل بریلوی کے شعری کمالات سے آگاہی بخشتا ہے۔ وہاں یہ احساس بھی عطا کرتا ہے کہ احمد رضا خاں کو یہ شعری مقبولیت اور تاریخ میں ہر دلعزیزی کس طور عطا ہوئی اگر ہم اس حقیقت کا سراغ لگانے کے لیے آگے بڑھیں تو صاف نظر آتا ہے کہ فاضل بریلوی کی جملہ شعری خوبیوں کا حقیقی ماخذ ان کی قرآن فہمی تھی۔ آپ قرآن حکیم کے مترجم ہی نہیں مفسر بھی تھے' زندگی بھر قرآن حکیم کی تجلیات سے ظلمت زدہ دلوں کو منور کرتے رہے۔ قرآن حکیم کے مطالعہ نے ہی کمال درجہ کی احتیاط پسندی سکھائی یہ آپ ہی کا کمال ہے کہ حد درجہ احتیاط پسندی کے باوجود آپ کا کلام مقبولیت عام کی آخری منازل کو چھو رہا ہے اور تحدیث نعمت کے طور پر اس حقیقت کا اظہار فرما رہے ہیں۔

رہا نہ شوق کبھی مجھ کو سیرِ دیواں سے
ہمیشہ صحبتِ اربابِ شعر سے ہوں نفور
نہ اپنے کاموں سے تضیعِ وقت کی فرصت
نہ اپنی وضع کے قابل کہ اس میں ہوں مشہور
رہی وبال سے اس کے مجھے سبک دوشی
کہ ویسے ہی ہے سر پہ گراں بار جرم و قصور
مگر جو ہاتفِ غیبی مجھے بتاتا ہے
زباں تک اسے لاتا ہوں میں بمدحِ حضور

یہ ہاتفِ غیبی ہی ہے جو ان سے ایسی نعتیہ شاعری لکھوا رہا ہے جس کا ہر شعر دوام کا حامل ہے کس حسنِ بیان سے اپنی نعت گوئی کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

گونج گونج اُٹھے ہیں نغماتِ رضا سے بوستاں
کیوں نہ ہو کس پھول کی مدحت میں وامنقار ہے

قرآن حکیم سے آگے بڑھے تو شریعت مصطفوی ﷺ نے دامانِ نور کشادہ کر دیا۔ قرآن حکیم اور قرآن ناطق جدا جدا تو نہیں ہیں۔ ایک قرآن تیس پاروں کی صورت میں انوارِ کرم لٹا رہا ہے جبکہ قرآن ناطق حضور ﷺ قرآن مجید کی شرح روشن ہیں۔ فاضل بریلوی نے قرآن حکیم اور صاحب قرآن ﷺ کی تعلیمات قدسیہ سے بھرپور روشنی اور راہنمائی لی اور تمام زندگی اس پر نازاں رہے کہ انہیں نعت نگاری کی بدولت ہی قرآن اور تعلیمات حضور ﷺ کو عوام الناس تک پہنچانے کی سعادت عطا ہوئی ہے لیکن یہاں بھی عاجزی اور فروتنی پیش نظر ہے اور زمانے بھر سے بے نیاز ہو کر مدح رسول ہی میں فنا ہو جانا چاہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

کس منہ سے کہوں رشکِ عنادل ہوں میں
شاعر ہوں فصیح بے مماثل ہوں میں
حقا کہ کوئی صنعت نہیں آتی مجھ کو
ہاں یہ ہے کہ نقص میں کامل ہوں میں

آج تمام نعت گو حضرت فاضل بریلوی کو ''امام سخن گویاں'' قرار دیتے ہیں۔ آپ کی نعتیہ شاعری کا سورج جب ایک بار چمکا تو پھر اس کی روشنی کبھی بھی ماند نہ پڑ سکی بلکہ ہر آنے والے دور کا

شاعر جب مدحتِ رسول ﷺ کی خاطر ذہن وفکر کو آمادہ کرتا ہے تو احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے کلام بلاغت نظام سے راہنمائی ضرور حاصل کرتا ہے۔ جب ایشیا کی مساجد سے لے کر یورپ کے اسلامی مراکز تک ہر جگہ ''مصطفٰے جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' کی صدائیں اُبھرتی ہیں تو جہاں اصحاب نظر کی پلکیں عشق وعقیدت کے آنسوؤں سے نم ہو جاتی ہیں وہاں تصورات کے نہاں خانوں میں نعت گو احمد رضا خاں کا جو روشن سراپا ابھرتا ہے وہ اس قدر سر بلند اور سرفراز ہے کہ اُن کے معاصرین اور عصرِ حاضر کے نعت گو شعراء کا وجود اپنی تمام تر بلند قامتی کے باوجود اس کے سامنے سرعقیدت خم کرتا نظر آتا ہے۔ آپ نے زندگی بھر عشق رسول ﷺ ہی کو حاصل ایمان سمجھے رکھا اور خدا گواہ ہے کہ اس سے بڑی حقیقت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اسی موضوع سے متعلق آپ کے اس جاوداں جاوداں شعر پر اس تحریر کا اختتام کر رہے ہیں۔

انہیں جانا انہیں مانا نہ رکھا غیر سے کام
للہ الحمد میں دنیا سے مسلمان گیا

☆☆☆

مہر عالم تاب نعت

سیّد پیر مہر علی شاہ گولڑوی

نعت بلا شبہ وہ نعمت خداوندی ہے جو قدرت کی طرف سے بندگانِ خاص کو عطا ہوتی ہے۔
نعت صاحب ایمان کا سرمایۂ اعزاز اور ایک مردِ مومن کا افتخار ہے۔ جب الفاظ عقیدت کا نم حاصل کرتے ہیں تو نعت ہوتی ہے۔ جب تراکیب اور استعارات کو حسنِ آرزو کی چمک عطا ہوتی ہے تو نعت ہوتی ہے۔ جب لفظوں کو مرصّع کاری ودیعت ہوتی ہے تو نعت ہوتی ہے۔ نعت پلکوں کی جھلملاہٹ، اشکوں کی جلوہ گری اور حضور نبی کریم ﷺ سے روحانی وابستگی کا نام ہے، جس طرح محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں کیوں کہ یہ نغمہ ہر ساز پر گایا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح نعت مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا کا نزول بھی ہر انسان کے قلب و فکر پر نہیں بلکہ نعت مصطفیٰ ﷺ دل کے کوہِ فاران سے پھوٹتی ہے تو مشامِ جان معنبر ہو جاتے ہیں۔

کوچۂ نعت میں ایک انتہائی سربلند لہجہ سرزمینِ گولڑہ کے تاجدار قبلۂ عالم سیدنا پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔ سرکار گولڑوی نامور عالم دین، جلیل القدر محدث، عظیم دانائے راز اور معرفت و تصوف کے انوار بکھیرنے والی شخصیت تھے۔ ایک زمانہ برسوں آپ کے گلستان علومِ معرفت سے خوشہ چینی کرتا رہا۔ آپ نے باطل نظریات کے خلاف جہاد کیا۔ آپ وہ رجلِ رشید تھے جن کے لیے بزمِ ہستی مدتوں محو دعا رہتی ہے۔ آپ وہ بطل جلیل تھے جن سے مسندِ ارشاد کو اس کا حقیقی حسن عطا ہوتا ہے۔ آپ وہ رہبر یگانہ تھے کہ جن کی جنبش لب، تقدیر خداوندی کا پرتو ہوتی ہے، آپ وہ نابغۂ روزگار تھے کہ جن کا ہر قول، قولِ فیصل ہوتا ہے، آپ اسلام کی آبرو اور کاروانِ زندگی کا کمالِ جستجو تھے۔ صورت و سیرت میں شوکتِ اسلاف کا عکس جمیل، غرضیکہ آپ اپنے علمی و فقہی کارناموں، نظریاتی کاوشوں اور مخلوق خدا کو معرفتِ الٰہی سے آشنا کرنے کے حوالے سے اپنے ہی اس شعر کا مصداق معلوم ہوتے ہیں۔

از لطفِ خلّاقِ زماں داریم ممتاز از جہاں
وضع دگر طرزے دگر، ذوقے دگر شوقے دگر

حضرت قبلۂ عالم گولڑوی کی تمام صفات کا تذکرہ بجا مگر یہ حقیقت ہے کہ آپ کی تمام فکری رفعتوں اور روحانی بلندیوں کا مرکز و محور ذاتِ محمد مصطفےٰ ﷺ ہے۔ سرکار ابد قرار ﷺ سے آپ کی محبت ان رفعتوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جہاں تک عام آدمی کے تصور کی پرواز بھی ممکن نہیں۔ یہی محبت جب شاعری کے پیرائے میں جلوہ گر ہوتی ہے تو پھر نعتِ رسول ﷺ کے زمزمے پھوٹتے ہیں۔ مدحتِ مصطفےٰ ﷺ کے ترانے اُبھرتے ہیں۔ توصیفِ حضور ﷺ کے گلاب کھلتے ہیں اور پھر آپ کی نعت نگاری کے ذریعے عشقِ رسول ﷺ کے ایسے ایسے روحانی اسرار منکشف ہوتے ہیں کہ قاری بحرِ حیرت میں گم ہو جاتا ہے۔

محبت رسول ﷺ کی یہی شدت تھی جو انہیں باطل قوتوں کا مقابلہ کرتے کرتے سلطنت انگلشیہ کے خود کاشتہ پودے مرزا غلام احمد قادیانی کی خانہ ساز نبوت کے مقابلے پر لے آئی۔ بزمِ آرائی سے رزم آرائی کی جانب سفر تھا۔ تحریری مقابلے تو مدت سے جاری تھے۔ مناظرے بھی ہو رہے تھے کہ یکا یک مباہلہ تک نوبت آ پہنچی تو یہ سید زادہ اپنے جدِ اعلیٰ حضور محمد ﷺ کی سنت تازہ کرتے ہوئے مباہلہ کے میدان میں ڈٹ گیا۔ برصغیر کے تمام مسالک کے علما نے اور جملہ مشائخ کرام نے آپ کی علمی فضیلت اور روحانی سرفرازی کو دیکھتے ہوئے آپ کو اسلام کا نمائندہ قرار دے دیا۔ آپ اس شانِ مرتضویؓ کے ساتھ میدانِ عمل اُترے کہ مرزا غلام احمد قادیانی اس مباہلہ میں آ جاتا تو قہرِ خداوندی سے ہلاک ہو جاتا۔

اسی طرح جب ایک مرتبہ غلام احمد قادیانی نے آپ کو تحریری مقابلہ کی دعوت دی تو آپ نے اس مقابلہ کو قبول کرتے ہوئے یہ تاریخی کلمات فرمائے:

''علمائے کرام کا اصل مقصود تحقیقِ حق اور اعلائے کلمۃ اللہ ہوتا ہے فخر و تعلّی مقصد نہیں ہوتا۔ ورنہ جناب نبی کریم ﷺ کی اُمت میں اس وقت بھی ایسے خادمِ دین موجود ہیں کہ اگر قلم پر توجہ ڈالیں تو وہ خود بخود کاغذ پر تفسیر قرآن لکھ جائے۔''

ظاہر ہے اس سے آپ کا اشارا اپنی جانب تھا۔ چناں چہ بعد میں اس چیلنج کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ ''میں نے یہ دعویٰ از خود نہیں کیا تھا بلکہ عالم مکاشفہ میں جناب نبی کریم ﷺ کے جمالِ باکمال سے میرا دل اس قدر قوی اور پختہ ہو گیا تھا کہ مجھے یقین کامل تھا کہ اگر اس سے بھی بڑا دعویٰ کرتا تو اللہ تعالیٰ مجھے ضرور سچا ثابت کر دیتا۔''

ظاہر ہے کہ جب عشقِ مصطفوی پیر سید مہر علی شاہ کے ہر بن مو سے اُبھر رہا تھا تو پھر آپ کا جملہ جوشانِ رسول ﷺ میں کہا گیا نعت مرصّع کی صورت نظر کیوں نہ آتا۔ آپ کی یہ مشہور زمانہ

نعت ایک عرصہ سے بے شمار اہل ایمان کے لیے وظیفۂ عشقِ حضورﷺ بنی ہوئی ہے۔

''اج سک متراں دی ودھیری اے''

یہ نعت اس قدر خوب صورت اور معانی و مفاہیم کے لحاظ سے اس قدر جامع ہے کہ جب بھی نعت خواں خوش الحانی سے اس نعت کو محفل میں پڑھتا ہے تو سننے والے بے خود ہو جاتے ہیں اور پلکوں پر آنسوؤں کے موتی جھلملانے لگتے ہیں۔ اس نعت کی تاریخ ساز مقبولیت کے پس پردہ ایک داستانِ ایمان آفریں پوشیدہ ہے۔ ہم اس کا کچھ حصہ اصحابِ نظر کی نذر کرنا چاہیں گے۔ آپ فرماتے ہیں۔

مدینہ عالیہ کے سفر میں بمقام وادی ءحمراڈاکوؤں کے حملہ کی پریشانی کی وجہ سے عشا کی سنتیں مجھ سے رہ گئیں۔ مخلصی فی اللہ مولوی محمد غازی مدرسہ صولتیہ میں مشغلہ تعلیم و تدریس چھوڑ کر حسنِ ظن کی بنا پر بغرض خدمت اس مقدس سفر میں میرے شریک ہوئے تھے۔ ان رفقا کی معیت میں قافلہ کے ایک طرف سو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سرور عالمﷺ سیاہ عربی جبہ زیب تن فرمائے تشریف لا کر اپنے جمال با کمال سے مجھے نئی زندگی عطا فرماتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ میں ایک مسجد میں بحالتِ مراقبہ دوزانو بیٹھا ہوں۔ آنحضورﷺ نے قریب تشریف لا کر ارشاد فرمایا کہ ''آلِ رسول کو سنت ترک نہیں کرنا چاہیے۔'' میں نے اس حالت میں آنجنابﷺ کی ہر دو پنڈلیوں کو جو ریشم سے بھی زیادہ لطیف تھیں اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر نالہ و فغاں کرتے ہوئے۔ الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ کہنا شروع کیا اور عالمِ مدہوشی میں روتے ہوئے عرض کیا ''حضور کون ہیں۔'' جواب میں وہی ارشاد ہوا کہ آلِ رسولﷺ کو سنت ترک کرنا نہیں چاہئے۔ تین بار یہی سوال و جواب ہوتے رہے۔ تیسری بار میرے دل میں ڈالا گیا جب آپ ندائے یا رسول اللہ سے منع نہیں فرما رہے تو ظاہر ہے کہ خود آنحضرتﷺ ہیں اگر کوئی اور بزرگ ہوتے تو اس کلمہ سے منع فرماتے۔ اس حسن و جمال با کمال کے متعلق کیا کہوں۔ اس ذوق و مستی و فیضانِ کرم کے بیان سے زبان عاجز ہے اور تحریر لنگ البتہ بادہ خوارانِ عشق و محبت کے حلق میں ان ابیات سے ایک جرعہ اور اس نافۂ مشک سے ایک نفحہ ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(اقتباس از ''مہر منیر'' تصنیف فیض احمد فیض، ص ۲۳۱، ۱۹۶۹ء)

حضرت گولڑوی کی یہ تحریر اور ابیات اس وقت کی سعادتِ عظمٰی کی کیفیات کی بہت حد تک عکاسی کرتے ہیں۔ تحریر بالا سے واضح ہوتا ہے کہ آپ وصالِ نبوی کے مراتبِ عالیہ سے مشرف ہو

چکے تھے۔ آپ اس وقت جس کیفیت نور سے دوچار ہوئے اور حسنِ عقیدت کے انعام کے طور پر جلوہ ہائے محبوب سے جس طور نوازے گئے ان کی حلاوت آفریں صدائے بازگشت ''اج سک متراں دی ودھیری اے'' کی صورت ہی میں سنائی دے سکتی تھی۔ حضرت قبلہ کی طبیعت میں تواضع اور اخفائے راز کا غلبہ تھا۔ اس قسم کے واقعات کو شاذ و نادر ہی ظاہر فرماتے تھے اور وہ بھی کسی خاص مصلحت کے تحت، ورنہ ان انعامات بے کراں کا جو اس دربار گوہر بار سے مرحمت ہوئے یا ان نوازشات بے پایاں کا جو خانۂ خلاقِ جہاں میں عطا ہوئیں ایک شمہ تک بھی کہیں ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وادیٔ حرا میں پیش آنے والی کیفیات سرمدی میں انہیں جو لطف و سرور عطا ہوا اس کی جھلک اس شہرۂ آفاق نعت کے علاوہ کئی دوسری نعتوں میں بھی نظر آتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہ نوازشیں بھلائی بھی تو نہیں جا سکتیں۔

سوارۂ بگذشتی و ما ہنوز از شوق
نہادہ روئے بخاکِ سم سمند تو ایم

اس نعت میں اتنا لوچ اور طرزِ بیان میں اتنی تاثر انگیزی ہے کہ دل و جان بہ یک وقت اس کی کیفیات میں ڈوب ڈوب جاتے ہیں۔ پوٹھوہاری زبان کی دل کشی و رعنائی اُوپر سے عشق و عقیدت کی بہتات کی بدولت یہ نعت رگ و پے میں سمانے لگتی ہیں اور قاری اس کیف آگیں تاثر میں اس طور غرق ہو جاتا ہے کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں کی مالائیں پرونے لگتی ہے۔ اتنی حلاوت، اتنی موسیقیت، اللہ اللہ، یوں لگتا ہے جیسے انسان نہیں بلکہ خود قدسی شانِ محبوب میں نغمہ پیرا ہوں۔ اس کی تاثر انگیزی کے حوالے سے مولانا فیض احمد فیض جو کہ سرکار گولڑوی کے تذکرہ نگار ہیں اپنی تصنیف لطیف مہر منیر میں ایک واقعہ یوں درج کرتے ہیں۔

متذکرہ بالا نعت کی عالم گیر اثر پذیری اب محتاجِ بیان نہیں رہی۔ پنجابی کلام سے لطف اندوز ہونے والی محفلوں میں ہمیشہ پڑھی جاتی ہے اور لوگوں کی فرمائش کے پیش نظر ریڈیو پر بار بار آتی ہے جب کبھی یہ نعت پڑھی جا رہی ہو تو شدتِ شوق و فراق سے ہر آنکھ اشک بار ہوتی ہے اور کیفیات کا نور و سرور سامعین کے قلوب میں موجزن ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جن دنوں علامہ اقبال میکلوڈ روڈ پر رہتے تھے۔ شام کے دھندلکوں میں کوئی شخص اس نعت کا پہلا شعر ترنم سے کہتا جا رہا تھا۔ علامہ نے اپنے ملازم کو دوڑ کر اس گزرنے والے کو بلوا کر ساری نعت سنی اور جب مقطع میں:

سبحان اللہ ما اجملک، ما احسنک ما اکملک
کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا گستاخ اکھیاں کتھے جا اڑیاں

میں حضرت قبلہ عالم قدس سرہ کا نام سنا تو کہا کہ اب معلوم ہوا کہ اس کلام میں اتنا بے پناہ درد واثر کیوں ہے۔ (''مہر منیر'' از فیض احمد فیض، صفحہ ۱۲۳، ۱۹۶۹ء)

شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کا سرکار گولڑوی کو یہ خراجِ عقیدت اس سبب سے تھا کہ وہ ان کی شخصیت کے روحانی اور دینی کمالات سے بخوبی واقف تھے۔ اس ضمن میں علامہ محمد اقبال کا حضرت گولڑوی کے نام مکتوب درج ہے۔ اس مکتوب کو کئی تذکرہ نگاروں اور محققین نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ اس مکتوب میں علامہ اقبال نے پیر صاحب سے اپنی ارادت مندی کا ذکر کرتے ہوئے وحدت الوجود کے حوالے سے ان سے راہنمائی کی استدعا کی ہے۔ ہم اس مکتوب کی ابتدائی سطور قارئین کی نذر کر دیتے ہیں۔ مقصود فقط علامہ اقبال کی پیر گولڑوی سے ارادت مندی کا اظہار ہے۔

لاہور ۱۸ اگست ۱۹۳۳ء

مخدوم ومکرم حضرت قبلہ السلام علیکم، اگر چہ زیارت اور استفادے کا شوق ایک مدت سے تھا تاہم اس سے پہلے شرفِ نیاز حاصل نہیں ہوا۔ اس محرومی کی تلافی اس عریضے سے کرتا ہوں گو مجھے اندیشہ ہے کہ اس خط کا جواب لکھنے یا لکھوانے میں جناب کو زحمت ہوگی۔ بہر حال آپ کی وسعتِ اخلاق پر بھروسا کرتے ہوئے یہ چند سطور لکھنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان بھر میں کوئی اور دروازہ نہیں جو پیش نظر مقصد کے لیے کھٹکھٹایا جائے...... میں نے سنا ہے کہ جناب نے درس وتدریس کا سلسلہ ترک فرما دیا ہے۔ اس لیے مجھے یہ عریضہ لکھتے ہوئے تامل تھا، لیکن چوں کہ مقصود خدمتِ اسلام ہے، مجھے یقین ہے کہ اس تصدیعہ کے لیے جناب معاف فرمائیں گے اور جواب باصواب سے ممنون فرمائیں گے۔ التماس دعا۔ مخلص محمد اقبال

(نام ونسب از نصیر الدین نصیر گولڑوی، ۱۹۸۹ء درگاہ گولڑہ شریف)

بات ہو رہی تھی سید مہر علی شاہ گولڑوی کی نعت گوئی کی حکیم الامت علامہ اقبال بہت بڑے عاشقِ رسول ﷺ اور دانائے راز تھے۔ وہ بھلا ایسی عظیم شخصیت سے کیوں کر اجنبی رہ سکتے تھے جس کی زبان اور قلم نے برصغیر کی فضاؤں میں محبتِ رسول ﷺ کی لازوال مہک بکھیر دی ہو۔ اقبال لاہور میں رہتے تھے اور پیر گولڑوی کی تبلیغی سرگرمیوں کا بہت بڑا مرکز لاہور ہی تھا۔ یہ لاہور ہی تھا جہاں سرکار گولڑوی نے شاتمانِ رسول کے خلاف جہاد کیا۔ گستاخانِ بارگاہ نبوت کا پوری قوتِ ایمان کے ساتھ مقابلہ کیا۔ باطل نظریات کے خلاف سدِّ سکندری بن گئے۔ غیر مسلم قوتوں کا مقابلہ کیا اور سب سے بڑھ کر حکومتِ انگلشیہ کے خود کاشتہ پودے قادیانیت کے خلاف جس غیرتِ

ایمانی کا مظاہرہ کیا اس کی صدائے بازگشت صدیوں تک وقت کے ایوانوں میں محسوس ہوتی رہے گی۔ علامہ اقبال کا آپ کے مقام و مرتبہ سے آگاہ ہونا کوئی حیرت انگیز امر نہیں بلکہ حیرت تو تب ہوتی اگر علامہ آپ کی علمی فکری اور فقہی سربلندیوں سے بے خبر ہوتے۔ علامہ اقبال کا یہ فرمانا کہ:

''اب معلوم ہوا کہ اس کلام میں اتنا درد کیوں ہے۔'' اسی باخبری کی روشن دلیل ہے۔

''اج سک متراں دی ودھیری'' ایسی نعت تھی جو آپ کے قلم گوہر بار سے ٹپکی تو اہل شوق کا وظیفہ بن گئی۔ زبان موثر، لہجہ حلاوت آفریں اور انداز دل نشیں تھا کہ دلوں میں اُترتی چلی گئی۔ اس نعت کو اس قدر سوز گداز اس لیے حاصل ہوا کہ اس کے پس منظر میں زیارتِ رسول کے جلوے مچل رہے ہیں۔ خوش بخت ہیں وہ آنکھیں جنھوں نے رخِ محبوب کو دیکھا اور سعید بخت ہے وہ قلم جسے حسن محبوب کو شاعری کی زینت بنانے کی سعادت عطا ہوئی۔ اگر پیر گولڑوی کی اسی ایک نعت پر بات کی جائے تو داستانِ شوق بے اختیار پھیلتی چلی جائے گی۔ ایک صاحب دل نے خوب لکھا تھا کہ اگر پیر گولڑوی فقط یہی لکھ جاتے اور مزید کچھ نہ لکھتے تو یہی ایک نعت انہیں شہرتِ دوام عطا کرنے کا باعث بن سکتی تھی۔

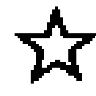
یہ نعت کیا ہے؟ صحیفۂ شوق ہے، جمالِ ذوق ہے۔ کمالِ آرزو ہے، حسن گداز ہے، فکر کی بلند پروازی ہے۔ جذبوں کی سرفرازی ہے۔ عشقِ رسول کی آتش شوق میں پگھل جانے کا نام ہے۔ حاصل سوز و گداز کے نام پر اپنے وجود کو بقائے دوام سے ہم کنار کرنے کا پیغام ہے۔ الفاظ کی پرشوق لے ہے۔ خم کدہ وارفتگی کی زندگی بخش لے ہے۔ بلاغت کی جلوہ افروزی ہے۔ دل کا ترانہ ہے، حسن بیان کا فسانہ ہے۔ آنکھوں کا نم ہے۔ جب رسول ﷺ سے مہکتے ہوئے پھولوں پر رحمتِ مصطفویٰ کی برستی ہوئی شبنم ہے۔ خاموش لبوں کا نذرانہ ہے۔ مچلتے اشکوں کا پیمانہ ہے۔ جیسے کوئی ساربان وقت کے صحرا میں گم گنبدِ خضریٰ کا تصور کر کے اس صدائے شوق کے ساتھ اپنا راستہ تلاش کر رہا ہے۔

اج سک متراں دی ودھیری اے
کیوں دلڑی اُداس گھنیری اے؟
لوں لوں وچ شوق چنگیری اے
اج نیناں لائیاں کیوں جھڑیاں

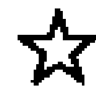
یہ نعت مسافر کی کوک ہے۔ شمعِ عشقِ حضور میں جل جانے والے پروانے کی ہوک ہے۔ اس نعت کے بے شمار فکری اور اَدبی محاسن اور صوتی کمالات اپنی جگہ، یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ نعت

بجائے خود سراپائے رسول علیہ کا حسن لیے ہوئے ہے۔ ہر بند میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسم معطر کے کسی نہ کسی عضو نورانی کا تذکرہ ہے اور ایسا کیوں نہ ہو۔ جن آنکھوں میں وادیٔ حمرا میں عطا ہونے والی حضو علیہ کی لمعہ افشانیاں بس رہی ہیں وہ تو ایسے ہی اشعار کا حسن لٹائیں گی۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔

مکھ چند بدر شعشانی اے
متھے چمکے لاٹ نورانی اے
کالی زلف تے اکھ مستانی اے
مخمور اکھیں ہن مدھ بھریاں



دو ابرو قوس مثال دین
جیں توں نوکِ مژہ دے تیر چھٹن
لباں سرخ آکھاں کہ لعلِ یمن
چٹے دند موتیاں دیاں ہن لڑیاں



اس صورت نوں میں جان آکھاں
جان آکھاں کہ جانِ جہاں آکھاں
سچ آکھاں تے رب دی شان آکھاں
جس شان توں شاناں سب بنیاں

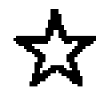
امام احمد رضا فاضل بریلوی نے بھی کچھ ایسی ہی کیفیت کو قلم بند کیا ہے۔

اللہ کی سر تا بہ قدم شان ہیں یہ
ان سا نہیں انسان وہ انسان ہیں یہ
قرآن تو ایمان بتاتا ہے انہیں
ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ

پیر گولڑوی کی اس نعت میں تشبیہات وتراکیب کی کثرت ہے مگر کوئی ترکیب بھی ذہن پر بوجھ نہیں بنتی بلکہ دل ودماغ کو روحانی فرحت عطا کرتی ہے۔ حضور اکرم علیہ کے سراپائے اقدس

کے حوالے سے ان کے اشعار آیاتِ قرآنی اور احادیث مقدسہ کی ترجمان ہیں۔ جوں جوں نعت آگے بڑھتی ہے آپ پر ذوق وشوق کا غلبہ ہونے لگتا ہے۔ اور آپ کا سرِ عقیدت بارگاہِ محمدیت میں بصد نیاز خم ہونے لگتا ہے کیوں کہ اسی بارگاہ سے انہیں انوار احدیت عطا ہوتے ہیں، فرماتے ہیں:

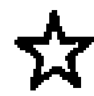
ایہہ صورت ہے بے صورت تھیں
بے صورت ظاہر صورت تھیں
بے رنگ دِسے اس مورت تھیں
وچ وحدت پھٹیاں جد گھڑیاں



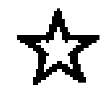
دسے صورت راہ بے صورت دا
توبہ راہ کی عین حقیقت دا
پر کم نئیں بے سوجھت دا
کوئی وِرلیاں موتی لے تڑیاں

توصیفِ مصطفےٰ ﷺ میں لفظوں کے گلاب بکھیرتے بکھیرتے ان پر رقت طاری ہونے لگتی ہے۔ دیدارِ حضور کی تمنا پھر سے جاگنے لگتی ہے۔ جلوۂ رسول ﷺ سے دل وجان کو ضوبار کرنے کی آرزو پھر سے سر اُٹھانے لگتی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انوار کے بحرِ بے کنار میں غوطہ زن ہونے کا احساس پروان چڑھنے لگتا ہے اور پکار اُٹھتے ہیں:

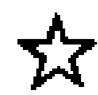
لاہو مکھ توں مخطط بردِ یمن
من بھانوری جھلک دکھاؤ سجن
اوہا مٹھیاں گالیں الاؤ مٹھن
جو حمرا وادی سن کریاں



حجرے توں مسجد آؤ ڈھولن
نوری جھات دے کارن سارے سکن
دو جگ اکھیاں راہ دا فرش کرن
سب انس و ملک حوراں پریاں



انہاں سکدیاں تے کرلاندیاں تے
لکھ واری صدقے جاندیاں تے
انہاں بردیاں مفت وکاندیاں تے
شالا آون دت بھی اوہ گھڑیاں



یُعطِیکَ رَبُّکَ داس تساں
فترضیٰ تھیں پوری آس اساں
لج پال کریسی پاس اساں
واشفع تشفع صحیح پڑھیاں

اور پھر حضرت گولڑوی کی نعت کا وہ مقطع آتا ہے جو سرکارِ دو عالم کی عظمتوں کا امین اور محبتِ صادق کی تڑپ کا راز دار ہے۔ آپ کو ایک طرف سلطانِ دو عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بے پناہ عظمتوں اور بلندیوں کا احساس ہے اور دوسری طرف اپنی کم مائیگی پر تڑپ تڑپ اُٹھتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اس نعت کے مقطع تک پہنچتے پہنچتے قاری کو کئی مرتبہ کیف آفریں وارداتِ روحانی سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اس نعت کا آخری شعر فقط شعری رعنائیاں ہی نہیں بلکہ قلوب غم زدہ کی تمام تر آرزوؤں کی کسک اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ شاعر محبوب حقیقی کی شانِ محبوبیت اور اپنی بے چارگی کا تقابل کرتا ہے کہ کہاں وہ ممدوحِ دو عالم محبوب عرب وعجم، فخرِ آدمؑ و نبی آدم ﷺ اور کہاں مجھ ساختہ حرماں مگر اس کے ساتھ ہی اس کے اندر اُمید کے چراغ بھی جھلملا رہے ہیں کہ میں جس سے مخاطب ہوں وہ سراپا رحمت وعطا ہے کہ حضرت گولڑوی اس شعر کی بدولت بے شمار الم رسید گانِ ہستی کو سکون وقرار کی دولت عطا کر جاتے ہیں۔

سبحان اللہ ما اَجملکَ
ما اَحسنکَ ما اَکملکَ
کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا
گستاخ اکھیں کتھے جا اڑیاں

حضرت گولڑوی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو نعت کو نمودِ فن کا ذریعہ نہیں بناتے۔ آپ تو

خلوت گزینی اور حجرہ نشینی کو ترجیح دیتے تھے۔ مگر جس طرح خوش بو کبھی بھی خلوت کدوں میں محبوس نہیں ہو سکتی اور اس نے زمانے بھر میں پھیلنا ہوتا ہے اسی طرح آپ کے فکر ونظر پر فیضانِ حضور ﷺ کی برسات اس طرح برس رہی تھی کہ آپ فنافی الرسول ﷺ ہو گئے تھے۔ آپ کا ظاہر و باطن عشقِ حضور سے آباد تھا۔ اس لیے آپ کی خلوت گزینی بالآخر اس طرح روحانی بزم آرائی میں تبدیل ہوئی کہ آپ ہر شاتم رسول کے لیے شمشیر برہنہ اور ہر گستاخ و بے اَدب کے لیے برقِ اجل بن گئے۔ آپ کو رب کریم نے زبان وبیان کا حسن عطا کیا تھا۔ کئی زبانوں پر عبور تھا مگر زندگی بھر فخر و تعلّی سے دور رہے۔ عجز و انکسار کو اپنی فکر کا محور بنائے رکھا۔ یہی عاجزی انہیں بارگاہِ رسول ﷺ میں قبولیت کا شرف عطا کر گئی۔ ہم پہلے ''سفر حمرا'' کا ذکر کر چکے ہیں کہ اس مبارک سفر میں آپ کو کس طرح زیارتِ رسول ﷺ نصیب ہوئی اور آپ کس شان سے نوازے گئے۔ ایک اور مقام پر اپنی خوش بختی کا اظہار کرتے ہیں:

مدینے میں بلا بھیجو قریب وادئ حمرا
تڑپ کر ڈال لوں میں ہاتھ پھر سیمین ساقن میں

اس شعر میں ''سیمین ساقن'' کو ہاتھوں سے چھونے کی سعادت کی طرف اشارہ ہے۔ آگے آپ کا لہجہ عجز و انکسار میں ڈھل گیا ہے اور بارگاہِ رسول ﷺ میں فریاد کناں ہونے لگتے ہیں:

حریف ساغر و مے ہوں غریق بحرِ عصیاں ہوں
سہارا ہے فترضٰی کا مجھے محشر مکانن میں
مجھے کیا غم ہے محشر کا، مرا حامی ہے جب وہ شاہ
کہا لولاک وطٰہٰ ومزمل جس کی شانن میں
دلا مت رو غلام ہو کر تو محی الدین جیلیؒ کا
مریدی لاتخف بس ہے سہارا ہر دو کونن میں

سرکار گولڑویؒ ایسی شخصیت تھی کہ جس کا وجود پورے زمانے کا اعزاز ہوتا ہے۔ آپ علوم دینیہ پر کمال درجے کی دسترس رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے نعتیہ اشعار میں سرکار دو عالم ﷺ کی عظمت وفضیلت کے اعلیٰ سے اعلیٰ نکات ملتے ہیں۔ جملہ عشاقِ سرورِ کونین کا عقیدہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نور خدائے کریم نے ہر چیز سے قبل تخلیق کیا۔ آپ نے فرمایا ''اول ما خلق اللہ نوری'' کہ خدا نے سب سے پہلے میرے نور کو اپنے نور سے تخلیق کیا اور یہ نور اس

وقت تخلیق ہوا جب زمان ومکاں نہیں تھے۔ زمین وزمان نہیں تھے۔ لوح وقلم اور کرسی وعرش کا وجود نہیں تھا۔ جب چاند سورج ستارے نہیں تھے۔ جب بحر وبر، شمس وقمر اور شجر وحجر کا وجود نہیں تھا۔ جب زندگی اپنے احساس اور کائنات اپنے ادراک سے محروم تھی تو اس وقت رب العالمین نے اپنے محبوب مصطفیٰ ﷺ کے نورِ مظہر کو جلوہ گر کیا اور پھر اسی نور سے بزمِ ہستی سجائی گئی۔

اس محبوب اور مرغوب موضوع کو بہت سے شعرا نے اپنے نعتیہ کلام میں قلم بند کیا ہے۔ جیسا کہ امیر خسرو فرماتے ہیں:

نمی دانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم
بہر سو رقص بسمل بود شب جائیکہ من بودم
خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسروؒ
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائیکہ من بودم

یہی مضمون ظفر علی خاں کے ہاں یوں نظر آتا ہے۔

پھوٹا جو سینۂ شبِ تارِ الست سے
اُس نورِ اوّلین کا اُجالا تمہی تو ہو

یا پھر امام احمد رضا خاں کی تخلیل پرواز ملاحظہ کیجئے۔

زمین وزماں تمہارے لیے، چنیں وچناں تمہارے لیے
مکین ومکاں تمہارے لیے، بنے دو جہاں تمہارے لیے
دہن میں زباں تمہارے لیے، بدن میں ہے جاں تمہارے لیے
ہم آئے یہاں تمہارے لیے اُٹھیں بھی وہاں تمہارے لیے

اور پھر ایک اور صاحبِ نظر کے ہاں اسی مضمون کا حسن ملاحظہ کیجئے:

فصل اللہ علیٰ نورِ کزو شد نور ہا پیدا
زمیں ازحبِ او ساکن فلک در عشقِ او شیدا

غرضیکہ نورِ مصطفوی ﷺ کی تخلیق کے بارے میں عربی، اُردو، فارسی اور پنجابی زبانوں کے شعرا صدیوں سے نعت کی صورت میں اظہار خیال کر رہے ہیں مگر جب مہر علی شاہ گولڑوی اس مضمون کو بیان کرتے ہیں تو بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ سرکار گولڑویؒ کے فکرِ معجز نما کی پرواز سمندر کو کوزے میں سمونے کا نظارا پیش کرتی ہے۔ آپ کی فکرِ رسا عشق رسول ﷺ کی

بلندیوں کو اس شان سے چھوتی ہے کہ پڑھنے والا فرطِ عقیدت سے جھوم جھوم اُٹھتا ہے۔آپ نے خلقتِ نورِ محمدی ﷺ کے مضمون کو اپنے نعتیہ اشعار میں اس شان سے باندھا ہے کہ دلوں کو نورِ محمدی ﷺ کی تخلیق کے فلسفے تک پہلی مرتبہ رسائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔سید مہر علی شاہؒ چند مصرعوں میں وہ کچھ بیان کر گئے ہیں جو بعض اوقات شاعر طویل نعتیہ مثنوی میں بیان کرنے سے قاصر رہتا ہے اور پھر سرکارِ گولڑوی کی انفرادیت یہ ہے کہ نورِ محمدی ﷺ کی اولیت کا تذکرہ کرتے کرتے اپنے والہانہ پن اور بےخودی و سرشاری کو بھی حاصلِ شوق بنا گئے ہیں۔آپ کا نعتیہ انداز ملاحظہ کیجئے اور لطف و سرور کی کیفیات میں ڈوب جایئے ،فرماتے ہیں:

کن فیکون تاں کل دی گل اے اساں اگے پریت لگائی
توں میں حرف نشان نہ آہا جدوں وِتی میم گواہی
اجے وی سانوں اوہ پئے دسدے بیلے بوٹے کاہی
مہر علی شاہ رل تاہیوں بیٹھے جداں سک دوہاں نوں آہی

حضور سیدنا مہر علی شاہ کے نعتیہ اشعار میں ''سک'' کا لفظ بہت سے مقامات پر استعمال ہوا ہے۔''سک'' کا مطلب ''طلب ،چاہت اور آرزو'' ہے۔آپ کے نعتیہ اشعار کے حسن کے طفیل یہ لفظ بذاتِ خود اتنا حسین ،دلآویز اور جامع نظر آتا ہے کہ نعت کا لازمی جزو دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہ لفظ آپ سے پہلے بھی استعمال ہوتا تھا مگر چوں کہ آپ کے نعتیہ کلام نے غیر معمولی شہرت حاصل کی اس لیے یہ لفظ بھی آپ کی دل نواز نعت نگاری کے صدقے اس قدر مقبول ہو گیا کہ دورِ حاضر کے کئی شعرا کے نعتیہ مجموعوں کے ناموں کا حصہ بن گیا۔اسی لیے'' کلام الامام امام الکلام''یعنی'' امام کا کلام زمانے بھر کے کلام کا امام ہوتا ہے۔'' کا مقولہ آپ پر صادق آتا ہے۔

آپ کو فارسی زبان پر کمال درجے کا عبور حاصل تھا۔چوں کہ آپ کے دور میں فارسی علماء فضلا کی زبان تھی اور تمام دینی سرمایہ عربی اور فارسی میں ہی موجود تھا اس لیے آپ کی نظم اور نثر فارسی زبان کے حسن استعمال کے لحاظ سے بہت اعلیٰ وارفع نمونہ ہے۔ہم فارسی زبان میں آپ کے چار ایسے اشعار نقل کر رہے ہیں جن میں مقاماتِ مصطفےٰ ﷺ کے حوالے سے حسنِ تغزل کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں:

بستہ شد اندر ازل خاطر بداں شورِ جہاں
کز نسیم تاب زلفش نوریاں پیچد ہے

الحل العینین املح و ازج الحاجبین
سرمہ گیں چشمے ، کماں ابرو ملیحے ارجے
روئے تاباں والضحیٰ واللیل مویش ذا سجی
وز فتحنائش لوا یٰسین از تبسمے
دوش در گوشم رسیدہ از سگانِ کوئے دوست
مہر را کے سز دہر خود پرستے بے غمے

فارسی زبان پر قبلۂ عالم گولڑوی کو کمال عبور تھا۔ آپ کے نعتیہ کلام میں حسنِ تغزل بصد شان کارفرما ہے۔ حسنِ تغزل کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ حسنِ تغزل لفظوں کی گل کاری اور جذبات کی سحر کاری کا نام ہے۔ یہ جذبوں کی تپش اور دلِ شوریدہ کی خلش ہے۔ اس میں طالب بہت کچھ کہہ کر بھی یہی محسوس کرتا ہے کہ جیسے کچھ بھی نہیں کہا۔ حسنِ تغزل میں لفظوں کے پھول کھلتے ہیں اور افکار کی کلیاں چٹکتی ہیں۔ ہر شعر بلاغت کا آئینہ دار اور نور و نکہت کا حسنِ پُر وقار نظر آتا ہے۔ سید مہر علی شاہ گولڑویؒ عام روایتی شاعر نہیں تھے جو کسی وقتی مجبوری کے تحت نعت و مدحت کے کوچے میں جمالِ باکمال کو تصور میں رکھتے ہیں۔ انہیں کی یادیں انہی کی باتیں۔ انہی کے لیے جیتے اور انہی کے ناموس پر مر مٹنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ آپ نے تو اپنے محبوب ﷺ کے جمالِ جہاں آرا کا نظارا بھی کر رکھا ہے اور بار بار دیکھنے اور دیکھتے رہنے کی آرزو انہیں مسلسل بے قرار کیے ہوئے ہے۔ یہی بے قراری و اشک باری ان کے نعتیہ اشعار کو حسنِ تغزل کی معراج بخش دیتی ہے اس ضمن میں ان کی ایک اور نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو آپ کی روحانی وارداتِ قلبی کے غماز ہیں:

صبا زِ طرۂ شبرنگِ مہوشِ طناز
کشود نافۂ مشکیں بروئے اہلِ نیاز
کیم گدائے درِ مفلسی و کوتاہ دست
کجا ایں غالیہ عطری و قصہ ہائے دراز
توئی کہ ذرہ صفت را بآسماں بردی
چگو نہ شکرِ تو گوید کمینہ بندہ نواز
غرض ادائے نیاز است ورنہ حاجت نیست
کمالِ حشمتِ محمود را بعجزِ ایاز

رہینِ ساقیِ چشمم کہ جرعہ بخشاند
ز جامِ چہرۂ ترکانِ مہو شانِ حجاز
بہ بزمِ بادہ فروشاں بہ نیم جو نہ خرند
متاعِ زاہد طماع چہ حج و صوم و نماز
مزار پیر مغاں راز ہائے سر بستہ است
فغاں زِ واعظِ خودبیں کجا است محرم راز؟
اگرچہ حسنِ تو از مہر غیر مستغنی است
من آں نیم کہ ز ایمانِ خویش آیم باز

سید مہر علی شاہ گولڑویؒ جب پنجابی زبان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو آپ کے قلم معجز رقم میں اور ہی والہانہ پن سما جاتا ہے۔ زبان کی مٹھاس، لہجے کی چاشنی، برمحل الفاظ کا استعمال، دل نشیں تراکیب برمحل بولتے ہوئے مصرعے، آنسو بہاتے ہوئے جذبے، خیالات کی روانی، احساسات کی طغیانی، افکار کا بحرِ بے کنار اُچھلتا ہوا، معانی کا آہوئے تاتاری مچلتا ہوا۔ ان میں بعض تراکیب ایسی ہیں جو آپ کے اپنے علاقے سے مخصوص ہیں مگر آپ کے لہجے کی مٹھاس نے انہیں ایسا حلاوت آفریں بنا دیا کہ قلب و جان کو بوجھ نہیں بلکہ روحانی فرحت کا احساس ہوتا ہے۔ آپ کے کہے ہوئے مناقب میں بھی بہت سے اشعار نعتیہ ہیں اور آپ کی منظومات میں بھی نعتِ رسول ﷺ کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ آپ نے پنجابی زبان میں جو بھی لکھا وہ حاصلِ کلام ٹھہرا اور ایسے قبولیتِ عام کی خلعت عطا ہوئی۔ آپ نے نعتیہ ماہیا بھی لکھا۔ نعتیہ ڈھولا بھی لکھا اور باقاعدہ نعت بھی لکھی غرض جو بھی لکھ دیا عوام و خواص کی نظروں میں محبوب و مقبول ٹھہرا۔

ایک جگہ آپ حضرت جامیؒ کی ''یوسف زلیخا'' کی طرز میں پنجابی نعتیہ اشعار رقم فرماتے ہیں۔ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ کا رخ سلطان دو عالم ﷺ کی جانب ہے اور آپ شہر مدینہ کی جدائی میں بے قرار ہیں اور جانِ مدینہ ﷺ کے دیار کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ اس نعت کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

نسیما قاصدانہ ویس لائیں
لوجہ اللہ ماہی دے دیس جائیں
اَدب سیتی دیویں بوسہ زمیں نوں
تے آکھیں اس طرح اُس نازنیں نوں

مدت ہوئی نہ ملیا یار پیارا
کدیں منزل کرے سوہنا اُتارا
کے ہوسی جا نوازیں گولڑویؒ نوں
زیادہ نہ کریں گل تھوڑی نوں
ہو واں میں سگ مدینے دی گلی دا
ایہو رتبہ ہے ہر کامل ولی دا
دلا سمجھا توں اکھیاں روندیاں نوں
جگر دا خون بھر بھر کھوندیاں نوں
رہی سمجھاتے آون باز ناہیں
رون دھوون تے دسن راز ناہیں

اسی نعت میں ان کا گدازئی بلندیوں کو چھوتا ہے اور عشق جور سمیات سے غیر آ گاہ ہوتا ہے یکا یک اَدب کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے کیوں کہ آپ باخبر ہیں کہ یہ ایسا محبوب ہے جو دو عالم ہی کا محبوب نہیں بلکہ اپنے خالق کا بھی محبوب ہے اور یہاں عشق کے نام پر معمولی سی شوخی بھی نامہٗ اعمال کو سیاہ کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔ اس حوالے سے اس طویل نعت سے مزید کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

بہانواں کول آ کھاں بول وے ڈھول
ترے بولن اُتوں عالم کراں گھول
وچھوڑا ناں کسے دے پیش آوے
کسے دا یار ناں پردیس جاوے
کویں پردیسیاں نوں یاد کرنا
غریب الوطن دا دل شاد کرنا
کوئی ہووے سیو کشتی جہاناں
اساں سر پر سجن سے دیس جاناں

پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ آج کے لفظوں میں باقاعدہ شاعر نہیں تھے۔ آپ کی شاعری نمود ونمائش یا شہرت کے حصول کا ذریعہ نہیں تھی اور نہ ہی آپ کے لیے شاعر کہلانا بہت بڑا اعزاز تھا۔

اس کے لیے آپ نے بہت کم لکھا مگر جو لکھا خوب لکھا۔ آپ کے نعتیہ اشعار اور مناقب پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے دل اور جگر کے ٹکڑے قرطاس کی زینت بنا دیے ہیں۔ اس تناظر میں ہم دیکھتے ہیں تو آپ کے بہت سے نعتیہ اشعار طویل مناقب سے بھی دستیاب ہیں۔ اپنے مرشدِ اعلیٰ کا ذکر کرتے ہیں تو راہوارِ قلم کا رخ بے اختیار گنبدِ خضریٰ کی طرف مڑ جاتا ہے اور محبتِ رسول ﷺ کے گل و لالہ نوکِ قلم سے ٹپکنے لگتے ہیں۔

مشہور سماجی شخصیت مولوی محرم علی چشتی کے لڑکے مولوی قائم علی گولڑہ شریف کے درسِ دینیات میں داخل ہوئے تو سیدنا مہر علی شاہ کی نگاہِ کرم کے فیضان سے علوم دین میں یکتا ہو گئے اور حضرتِ اعلیٰ سے ''فاضل لاہوری'' کا لقب پایا حالاں کہ تمام اساتذہ مولوی قائم علی کے علمی مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے۔ ایک روز یہی فاضل لاہوری فارسی میں نظم کہہ کر لائے تو سرکار گولڑوی نے انہیں یہ نعت فی البدیہہ لکھوادی:

آشفتۂ مہروئے پر ناز و ستم گارم
من کشتۂ ابروئے آں دلبر عیارم
بریادِ سیہ چشمے ہمہ روز سیاہم شد
وز ناوکِ مژگانش صد خار بہ دلِ دارم
از زلفِ پریشانش شد خانہ بدوشِ من
وز مصحفِ روئے او آیاتِ خدا دارم
عشق آمد و شد ساری چوں بو بگلاب اندر
او در من و من در وے سریست زِ اسرارم
بیروں نہ زدم قدمے ویں طرفہ تماشا بیں
پر آبلہ شد پایم عمریست کہ سیارم
قد کان ومامعہ ماکانَ من الاکوان
الان کما کان مشہودِ دلِ زارم
تایافتہ ام خبرے از بابِ علومِ دل
دلدادہ بمہر آں شہ حیدرؓ کرارم

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ سرکار گولڑوی کی شاعری ان کی وارداتِ قلبی کی غماض

ہے۔انہوں نے بادشاہوں اور سلاطین کے قصائد نہیں لکھے۔نوابوں اور حکمرانوں کے درباروں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا بلکہ نوابین اور امرا تو آپ کی نگاہِ کرم کے ملتجی رہا کرتے تھے۔ آپ کی نگاہوں میں تو جمالِ سید الکونین ﷺ حاصلِ زندگی بن کر بسا ہوا تھا۔بعض اوقات اصحابِ ذوق کی فرمائش پر فی البدیہہ اس شان سے اشعار کہے کہ حاصل کلام بن گئے۔بعض اوقات آستانہ عالیہ کے ترنم ریز غلاموں کی فرمائش پر قوالی کے انداز پر نعتیہ اشعار لکھے جنہیں شہرت عالم اور بقائے دوام کی سند خاص عطا ہوئی اس ضمن میں ان کی لکھی ہوئی ایک نعتیہ قوالی کے دو بند پیش خدمت ہیں:

جب سے لاگے تورے سنگ نین پیا
نیند گئی آرام نئیں ساری ساری رین پیا
دکھ آئے سکھ بھاگ گئے
سب عیش مٹا سارا چین پیا
تن من دھن سب تجھ پہ واروں
وار دیوں کونین پیا
جیا تڑپت ہے درسن دیجو
صدقۂ حسنؓ حسینؓ پیا
وصل علیٰ کیا شانن ہے
لامتلک فی الدارین پیا
مہرعلی ہے حب نبی اور حب نبی ہے مہرعلی
لحمک لحمی جسمک جسمی فرق نئیں مابین پیا

سید مہرعلی شاہ گولڑوی نظریۂ وحدت الوجود کے زبردست عالم بلکہ مبلغ بھی تھے۔اس سلسلے میں آپ گھنٹوں گفتگو فرمایا کرتے تھے۔نامور علما سے جو اس نظریے کے حامی نہیں تھے ان کے مناظرے بھی ہوئے۔اس نظریے کے مخالف نامور صوفیا نے بھی نظریہ وحدت الوجود کو ایک مقام پر جا کر درست کہا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ اسے بازیچۂ اطفال نہیں بننا چاہیے۔جیسا کہ سیدنا جنید بغدادیؒ سے یہ قول منسوب ہے کہ: ''منصور نے انا الحق درست کہا تھا مگر حق یہ تھا کہ اسے ضبط کیے رکھتا۔شریعت تو ظاہری لوازم کو ہی مدنظر رکھے گی۔''

سید مہر علی شاہ گولڑویؒ کی نثریہ تحریروں اور شاعری میں اس عظیم نظریے کی جلوہ گری خوب خوب محسوس ہوتی ہے۔ ان کی نسبت قادریہ کے ساتھ ساتھ چشتیہ بھی تھی۔ شمس الدین سیالویؒ کے دامانِ طریقت سے وابستہ ہوئے تو دنیا ہی بدل گئی۔ اپنے گھر سے بہت کچھ عطا ہوا تھا، سرکار سیالوی کے روحانی فیوضات نے مستغنی کر دیا۔ انہوں نے سرکار سیالویؒ سے اتنی محبت کی کہ فنافی الشیخ کے درجے پر فائز ہو گئے۔ ادھر سرکار سیالویؒ کو بھی اس مردِ کامل سے غایت درجہ محبت تھی اگر دیکھے ہوئے عرصہ گزر جاتا تو فوراً بلوا لیتے بعض اوقات تو ایسا ہوتا کہ ادھر شیخ کے دل میں طلب جاگی اور ادھر سرکار گولڑویؒ، سیال شریف کی نورانی فضاؤں میں جلوہ گر ہو جاتے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ پیر اور مرید سچ مچ کے عاشق و معشوق تھے۔ دلوں کی زبان سے گفتگو کرتے اور پیغام رسانی کا ہنر جانتے تھے۔ سید مہر علی شاہ کا نعتیہ کلام اور غزلیات گولڑہ شریف کے علاوہ سیال شریف میں بھی قوال بڑے ذوق و شوق سے پیش کرتے۔ سرکار گولڑوی کے لکھے ہوئے مناقب ان کی خواجہ شمس الدینؒ سے محبت کی دل نشیں اور نہایت موثر تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان مناقب میں عشق و عقیدت کی سرفرازی بھی ہے اور اپنے مرشد سے محبت کا والہانہ پن بھی۔ اس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ مجھ سے علمی لحاظ پر جو کچھ ہو سکا ہے وہ اسی شمس نورانی (خواجہ شمس الدین سیالویؒ) کے نورِ معرفت کی بدولت ہوا ہے۔ اپنی کتاب ''سیف چشتیائی'' میں تحریر کرتے ہیں۔

''اس وقت میں محسوس کر رہا ہوں کہ گویا شیخ میرے پاس موجود ہیں اور اپنی توجہ سے وہی قادیان کے جواب میں یہ دلائل میرے قلب میں القا فرما رہے ہیں۔'' اشعار کا حسن ملاحظہ ہو:

شمس نورانی۔ کہ نورِ مطلق است
در ہمہ آفاق نورش مطبق است
گشت خورشیدے نہاں در ذرۂ
شیر نزدر پوستین برہ
دیں عجب کاں شمس از نورِ قدم
ناتواں روبود خود صاحب علم
گر نہ دادے نام پاکت دست را
کس نہ دیدے در جہاں این مست را
نام پاکت ساختہ وردِ زباں
مہر تورا در دلش کردہ نہاں

ہر دو عالم در ہوائش باختہ
پائے از دیدہ براہش ساختہ
سیّما آں سرو بستانِ خدا
شاہباز قدس آں شمس العلےٰ
طلعت رو از تجلی فی الخیال
مدرکہ با ناطقہ گردند لال
بس کن اے دل قصہ بے انفصام
السلام اے بدرِ شمسم والسلام

چوں کہ ان اشعار کا انداز نعتیہ ہے۔ تراکیب کے پیمانے میں نعت کا حسن لیے ہیں اس لیے تذکرہ نگاروں کی جانب سے ٹھوکر کھا جانے کا احتمال ہے اور بعض تو ان اشعار کو سرکار گولڑوی کی نعت گوئی کے پلڑے میں ڈال بھی چکے ہیں مگر جب شاعر بقلم خود ان اشعار میں اپنی عقیدت کا مرجع اپنے پیر و مرشد کو قرار دیتا ہے تو کسی اور کو ان اشعار کو نعتِ سرورِ کونین علیہ السلام سے منسوب کرنے کی کیا حاجت ہے۔ یہ امر بہر حال طے ہے کہ جب پیر خواجہ شمس الدین سیالوی جیسا بایزید ثانیؒ ہو اور مرید سید مہر علی شاہ گولڑویؒ جیسا جنید وقت ہو اور اس کے ساتھ ساتھ وحدت الوجود کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہو تو ارادت مندی ایسی ہی لازوال خوش بو بکھیرتی ہے۔

صوفیائے کرام کا قدیم دور سے ایک شیوۂ شاعری یہ رہا ہے کہ یہ حمد یا نعت کا عنوان نہیں باندھتے۔ اپنی وارداتِ قلبی بیان کیے جاتے ہیں اور آنے والے دور کا خوشہ چین حمد و نعت اور پند و نصائح کے جواہر پاروں کو علاحدہ علاحدہ خانوں میں تقسیم کرتا چلا جاتا ہے۔ سید مہر علی شاہ کے ہاں روحانی واردات کی بہتات ہے۔ انتہائی علم و فضیلت نہایت گہرا مطالعہ، بے پناہ مشاہدہ اور سب سے بڑھ کر عمل کا حسن، ان سب عناصر نے ان کی شاعری کو پڑھنے والوں کے دلوں میں بے پناہ قریب کر دیا ہے۔ ''روز الست'' صوفیائے کرام اور درویش صفت شعرا کا محبوب موضوع ہے۔ اور پھر وہ ساعتیں جب خدائے کریم نورِ محمد علیہ السلام سے کرسی، عرش، لوح و قلم، زمین و آسمان، ملائکہ و جنت سمیت تمام کائنات تخلیق کر رہا تھا۔ یہ ساعتیں صوفی شعرا کو روحانی واردات اور فکری تگ و تاز کی بدولت اپنے مشاہدہ کا حصہ محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ دراصل غیر معمولی مطالعہ، باعمل زندگی، احترام شریعت اور محبتِ خدا اور رسول علیہ السلام کی کرشمہ کاری ہے کہ مطالعہ مشاہدہ کا روپ اختیار

کر لیتا ہے جو کچھ ہم نے اُوپر بیان کیا ہے اسکے پس منظر میں حضرت گولڑوی کے یہ اشعار دیکھئے:

اجے وی اوہ پیاں دسدیاں سانوں ماہی والیاں ٹاہلیاں
نال خوشیاں دے رل مل جتھے راتاں کالیاں جالیاں
اُرے تھیں اوہ ہے اُریرے، پریرے پرے تھیں
بے شک آپے آپ ہے اساں سبھے جھوکاں بھالیاں
رات وچ وینہوں ویکھ سمجھے کل شی ہالک
کجھ نہ وچ سب کجھ ہے ڈھڑا ایہ بیرنگی چالیاں
جے آکھاں توں دسدا ناہیں تیرے بن پھر کون ہے
روپ کس دا میں دساں دیویں جو توں ہی وکھالیاں
ہے جو تنزیہہ عین تشبیہہ جمع حق مشہود ہے
کرم کیتا غوث الاعظم اپنے سردیاں والیاں

خدا سے باتیں کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ حضرت گولڑوی محبوب خدا کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ان کا اولین مصرع:

''اجے بھی اوپیاں دسدیاں سانوں ماہی والیاں ٹاہلیاں''

صاف عظمتِ مصطفےٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کر رہا ہے جب ذات خداوندی تمام انبیا و رسل کی ارواح سے حضورِ مصطفےٰ علیہ السلام کی رسالت پر ایمان لانے کا وعدہ لے رہی تھی۔ان اشعار کے ساتھ جوں جوں یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے سرکار گولڑوی کی بے چینی انتہا کو چھونے لگتی ہے اور وہ دیدارِ مصطفےٰ علیہ السلام کی تمنا کرنے لگتے ہیں۔دیدار مصطفوی کی دولت پہلے ہی ان کا مقدر بن چکی ہے۔اس تناظر میں ان کی بے قراری دیکھئے:

پا کے گل وچ پیچیاں زلفاں دے میں روندی وتاں
ساوی پیلی ہو رہیاں گیاں سرخیاں تے لالیاں
رہندیاں پل پل سکاں دم دم اڈیکاں تیریاں
کنڈ ولا کے ٹرگیوں سجناں پریتاں نہ پالیاں
جھات پا کے دل گیوں سانبڑی رین گزری روندیاں
نین برسن زار رم جھم جیویں بدلیاں کالیاں

دل دا ویہڑا خانہ اکھیاں دا دوہاں نوں انتظار
قدم پاویں جیونداں جیوندیاں تد ہوون خوش حالیاں
ویکھ لو رج رج کے اکھیو کجھ وسائیں دم دا
پھر بھی پیاں ویکھن کوئی خوش نصیباں والیاں

حضرت گولڑوی اپنی نعتوں میں وہ لب ولہجہ اختیار کرتے ہیں جو صوفیا کو محبوب رہا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں غضب کا لوچ اور نغمگی ہے یہی وجہ ہے کہ نعتیہ محافل، دینی مجالس اور قوالی کی تقاریب میں آپ کی نعتیں نہایت ذوق وشوق سے پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔ ویسے تو آپ کا تمام کلام ہی عارفانہ ہے اور اس حیثیت سے ہم گفتگو کرنے لگیں تو داستان دراز سے دراز تر ہوتی چلی جائے گی لیکن اس مضمون میں ہمارا موضوع بطور خاص آپ کی نعتیہ شاعری ہے بعض مقامات پر تو آپ کی طویل متصوفانہ منظومات سے بطورِ خاص چند نعتیہ اشعار منتخب کرنے پڑتے ہیں۔ آپ کی ایک معروف نعت کے چند بند قارئین کے ذوقِ علمی کی نذر ہیں آپکی جس نعت سے چند اقتباسات نذر کیے جارہے ہیں وہ اکثر محافل میں اہل شوق کی وارفتگی کا سامان مہیا کرتے ہیں :

دل لگڑا بے پرواہاں نال جتھے دم مارن دی نئیں مجال، صل علیہ ذوالجلال
رونداں نیناں نوں سمجھا رہی
لکھیا پڑھیا سب بھلا رہی
ہک نام سجن دا گا رہی
رگ رگ تے لوں لوں ساہاں نال
دل لگڑا بے پرواہاں نال جتھے دم مارن دی نئیں مجال، صل علیہ ذوالجلال
کراں یاد میں سوہنی جھات نوں
اس سفر عرب والی رات نوں
اس حمرا وادی دی گھات نوں
یا لیتنی یوم الوصال
دل لگڑا بے پرواہاں نال جتھے دم مارن دی نئیں مجال، صل علیہ ذوالجلال
آدمؑ تھیں تاں عیسیٰؑ مسیح
نفسی بلبیں سب نبیؑ

اُتھے بولسی ہک اُمتی
احمد ﷺ نبی صاحب کمال
دل لگڑا بے پرواہاں نال جتھے دم مارن دی نئیں مجال، صل علیہ ذوالجلال

ربـــی اِلٰھـــیٰ صـــمـــدی
صل وسلم علی النبی
فاطمہؓ الزہرا و علیؓ
حسنین جگ دی پناہاں نال
دل لگڑا بے پرواہاں نال جتھے دم مارن دی نئیں مجال، صل علیہ ذوالجلال

اس مشہور و معروف نعت میں دیدار مصطفےٰ ﷺ کے لیے ان کی تڑپ عجیب ہی رنگ اور بے قراری لیے ہوئے ہے۔ اس معاملے میں آپ دیوانگانِ قافلہ شوق کے سربراہ نظر آتے ہیں بے چینی و بے قراری حد سے فزوں ہونے لگتی ہے:

سارا دن گزیداں بھوندیاں
گھت پلڑا مکھ تے روندیاں
ہنجواں نال مکھڑا دھوندیان
ساری رین سالاں تے آہاں نال
دل لگڑا بے پرواہاں نال جتھے دم مارن دی نئیں مجال، صل علیہ ذوالجلال

جنیدی جند تلی تے دھر رہی
گل پلڑا منتاں کر رہی
لکھ واری توبہ پڑھ رہی
رٹھڑا مناون دا خیال
دل لگڑا بے پرواہاں نال جتھے دم مارن دی نئیں مجاں، صل علیہ ذوالجلال

جب بے قراری اور اضطراب کمال کو چھونے لگتے ہیں تو سرکار دو عالم ﷺ کی شانِ رحمت کا خیال آتا ہے کہ آپ تو بے یاروں کا یارا اور بے چاروں کے چارہ ہیں۔ غم نصیب زندگی کا درمان اور رنج والم کے طوفان میں راحت کا سامان ہیں۔ آپ کی شانِ رحمت روتے دلوں کو ہنساتی اور بھیگتی آنکھوں کو مسکراہٹ کے آداب سکھلاتی ہے۔ آپ سے غم زدہ کا حال پوشیدہ نہیں

ہے۔ لٰہذا رونا کیا اور اضطراب کیسا۔ اس جاں فزا احساس کے ساتھ ایک نئی اُمید دل و جان میں خوشیوں اور مسرتوں کے چراغ روشن کرنے لگتی ہے اور بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں:

مہر علی کیوں پھریں اُداسی
اج کل سوہنا آ گل لاسی
ہوسن خوشیاں تے غم جاسی
ملساں لمیاں کر کر باہاں نال

دل لگڑا بے پرواہاں نال جتھے دم مارن دی نئیں مجال، جل علیہ ذوالجلال

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ والا صفات سے بے پناہ محبت و عقیدت ہی ان کے اشعار سے نعت کے نام پر ہجر و فراق کی خوش بو کشید کرنے کا باعث بنی۔ آپ کی شاعری میں جہاں نعتِ حضور، رحمت حضور اور الطافِ حضور کے حوالے سے کیف و شادمانی کے احساسات ملتے ہیں۔ وہاں ہجر و فراق، جدائی و فرقت اور اشک باری و غم ناکی کے احساسات بھی بدرجۂ اولیٰ ملتے ہیں۔ صوفیائے کرام کی غزلیات بھی ان کی روحانی واردات کی امین ہوتی ہیں۔ ان کا محبوب مجازی نہیں بلکہ حقیقی ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں بہ یک وقت حمد و نعت کی کیفیات موجزن دکھائی دیتی ہیں۔ اُردو پنجابی کے علاوہ آپ کی عربی اور فارسی زبانوں پر بھی مضبوط گرفت تھی۔ ان کی نعتوں میں جا بجا عربی کے مصرعے ہی نہیں بلکہ مکمل اشعار بھی بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ قصیدہ فارضیہ عربی قصائد میں بلند اَدبی مقام رکھتا ہے۔ آپ نے اس کے بعض اشعار کا پنجابی میں ترجمہ فرمایا ہے۔ ان میں سے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں جن سے آپ کی اس مہجوری و فرقت کا اندازہ ہوتا جو مدینے سے دور رہ کر آپ کو بے چین کیے ہوئے تھی:

ساربانا ں مہرباناں راہیا
شالا جیویں خیر تھیویں ماہیا
آکھیں جا اُنہاں پیاریاں دل جانیاں
گوڑھے نیناں والیاں مستانیاں
سارا عالم صدقے آکھاں بول توں
واراں سرئیں اُس انوکھڑے ڈھول توں
بن تساڈے ہک گھڑی سو سال دی
بہہ ٹھکانے پئی تساڈے بھال دی

چشماں فرش وچھاواں خاطر ڈھول دی
مرحبا یا مرحبا پئی بول دی
پہنچیں جد توں سوہنیاں دی جھوک تے
خیر ہووی انہاں نوں ذرا روک تے
جا سنیہڑا دیویں اُنہاں جانیاں
گوڑھے نیناں والیاں مستانیاں
بھلدے نئیں اوہ بول مٹھڑے ڈھول دے
بول سانول یار روہی رول دے

ان اشعار میں ہجر وفراق اپنی انتہا کو چھوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ قاصد کے ہاتھ پیغام کیا بھیج رہے ہیں یوں لگتا ہے جیسے اپنی روح اور دل قاصد کے حوالے کر دیتے ہیں اور اشکوں کی برسات کو اظہار مدعا کا ذریعہ بنالیا ہے۔ امام احمد رضا فاضل بریلوی کے ہاں ایسے ہی اشتیاق کی جھلک یوں ملتی ہے:

جان و دل ہوش و خرد سب تو مدینے پہنچے
تم نہیں چلتے رضا سارا تو سامان گیا

بلاشبہ حضرت گولڑوی محبوبانِ بارگاہ خداوندی میں سے تھے۔ آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کا فرمایا ہوا مستند اور جن کا لکھا ہوا حاصل اَدب ہوتا ہے۔ آپ اول وآخر شاعر نہ تھے۔ آپ تو فقط عاشق رسول ﷺ تھے وہ عاشق رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام جس کی زندگی سراسر سیرتِ مصطفوی کا نمونہ اور جس کی بندگی آدابِ نیاز سے عبارت تھی۔ جس کی زندگی خدا کے نام پر اور جس کی موت نبی مکرم ﷺ کے پیغام پر تھی۔ نعت تو آپ کے عشق وعقیدت اور وارداتِ روحانی کے اظہار کا قابل صد ستائش نمونہ ہے۔ آپ کی نعت گوئی تو اس حدی خوان کا زمزمۂ شوق ہے جسے صحرائے محبتِ رسول میں دیوانہ آگے کو بڑھتے ہوئے جوش افتاد کا ذریعہ بنالیتا ہے۔ آپ گلستان مدحت وعقیدت کے وہ گل سدا بہار ہیں جس کی خوش بو سے ہر آنے والا زمانہ معنبر ہوتا رہے گا روحِ ارضی آپ کی عظمتوں کو سلام کرتے ہوئے آپ کو مقبولیت کی خلعتِ جاودانی بخشتے ہوئے فخر محسوس کرتی ہے:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

☆☆☆

خطیبِ اسلام

صاحبزادہ سید فیض الحسن

صوفیائے اکرام اور بزرگانِ دین وہ مقربانِ خداوندی ہیں جنہیں خدا نے غیر معمولی کمالات اور ایمانی صفات سے نواز رکھا ہوتا ہے۔ ان محبوبِ خلائق شخصیات کا مرنا اور جینا خدا کے لیے ہوتا ہے اور ان کی جملہ فکری و نظری صلاحیتیں تبلیغِ اسلام اور ترویجِ دین کے لیے وقف ہوتی ہیں۔ شاعری وہ صفتِ خاص ہے جو بعض اولیائے کرام کو انعامِ خداوندی کے طور پر ودیعت ہوتی ہے اس لئے جہاں یہ دوسری صلاحیتوں کو فروغِ دین و مذہب اور اصلاحِ اُمت کے لیے استعمال کرتے ہیں وہاں یہ شاعری سے بھی اسلامی نظریات کی ترویج اور عقائدِ حقانیہ کی اشاعت کا کام لیتے ہیں ان کی شعری و ادبی خوبیاں رضائے الٰہی اور خوشنودی مصطفیٰ ﷺ کے نام پر ظلمت کدۂ عالم پر ایمان آفریں اُجالے بکھیرنے کا باعث بنتی ہیں۔ ان صوفیائے کرام کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے شاعری کو کبھی ذاتی تشہیر یا اپنی ادبی شہرت کا ذریعہ خیال نہیں کیا، بلکہ تاریخِ ادب شاہد ہے کہ ان کی فکری کاوشیں اور تخلیقی صلاحیتیں دنیائے شعروادب کے لیے ہمیشہ باعثِ صد افتخار ثابت ہوتی رہیں۔

حضرت صاحبزادہ سید فیض الحسن کا شمار بھی ان صاحبِ تصوف میں ہوتا ہے کہ جنہوں نے خطابت کی بزم آرائیوں سے لے کر تحریکِ آزادی کی رزم آرائیوں تک ہر جگہ عشقِ رسول ﷺ کا پرچم لہرانے کے لیے اپنی جن خداداد صلاحیتوں سے کام لیا اُن میں شاعری بھی خاص مقام کی حامل ہے اگر چہ ان کی شاعری بطورِ خاص بزم آرائیوں یا محفل افروزیوں کے لیے نہیں تھی، مگر آپ کے قریب رہنے والے اصحابِ دل گواہ ہیں کہ جب کبھی آپ اپنی کوئی نعت یا نظم سناتے یا کسی صاحبِ ترنم نعت خواں کو خوش الحانی سے پڑھنے کے لیے عطا فرماتے تو پوری محفل جذب وشوق اور عشق وعقیدتِ رسول ﷺ کی خوشبو سے مہک مہک اُٹھتی۔

خطیبِ اسلام حضرت صاحبزادہ سید فیض الحسن کی عظمتِ فکر کا جائزہ لینے کے لیے جب آپ کی ہمہ صفت موصوف شخصیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کی علمی وفکری سربلندیوں کے احساس سے ہی جبینِ شوق خم ہونے لگتی ہے۔ آپ علم وفن کا روشن مینار، کاروانِ آزادی کے

سر بکف مجاہد اور برصغیر کی ولولہ انگیز خطابت کے فکر نواز سلسلے کی آخری کڑی تھے۔ گفتار موثر تھی تو کردار معتبر، باتوں میں گلوں کی خوشبو تھی تو اداؤں میں فقرِ غیور کی جھلک، شخصیت باوقار تھی تو سیرت صبحِ زندگی کا نکھار، فکر میں سمندروں کی گہرائی تھی تو نظر میں تیغ خارا شگاف کی کاٹ۔ علم سرمایہ ایمان تھا تو عمل شوکتِ عرفان۔ تدبر میں پہاڑوں کی سربلندی تھی تو تخیل میں صحرائے بے کنار کی وسعت۔ عاشقِ رسول ﷺ بھی تھے اور فدائے ناموسِ اسلام بھی۔ مجاہد تحریک ختم نبوت بھی تھے اور کاروانِ شوق کے قائد عالی مقام بھی۔

کسی بھی شاعر کی شعری عظمت کا احاطہ کرنے کے لیے اس کے فکری پس منظر کے ساتھ ساتھ اس کے زندگی کے ان عوامل پر بھی نظر ڈالنی پڑتی ہے جو اس شاعر کی ادبی ولسانی رفعتوں اور اس کے علمی تشخص میں پوشیدہ نظر آتے ہیں۔ صاحبزادہ سید فیض الحسن نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ غلامی کا دور تھا چاروں طرف انگریزی استبداد کی دہشت خیزیوں کے چرچے تھے۔ ایسے حالات میں علامہ محمد اقبالؒ شاعری کے اُفق پر آزادی کی روشنی بخشنے والے مہِ کامل کی صورت میں نمودار ہوئے۔ اقبال کی فکر اتنی عظیم اور ان کا فلسفہ اس قدر ہمہ گیر تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے پورا عالم اسلام ان سے متاثر ہونے لگا۔ شمعِ آزادی کے پرستاروں کے لیے اقبال صبح زندگی کی نوید بن کر آئے یہی وجہ ہے کہ جب صاحبزادہ سید فیض الحسن سکول کی زندگی گزار کر کالج میں داخل ہوئے تو اقبال کے افکارِ تازہ ان کے ادراک اور ایمانی محسوسات کو نئی زندگی بخش رہے تھے۔ آپ اقبال سے یوں متاثر ہوئے کہ اقبال کی شاعری آپ کی خطابت کا لازمی جزو بن گئی اور آپ کی اپنی شاعری میں فکرِ اقبال کا جلوہ گری بہ ہزار انداز اپنے حسنِ تاثر کا احساس دلانے لگی۔

صاحبزادہ سید فیض الحسن ایک بہت بڑے علمی وروحانی گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔ گھر میں آنکھ کھولتے ہی علم وادب کا غیر معمولی چرچا دیکھا۔ قدرت نے طبع موزوں عطا کی تھی اس لئے چھوٹی عمر میں ہی خوبصورت اشعار کہنے لگے۔ کالج کی تعلیم کے دوران میں آپ کے ساتھ پڑھنے والے کئی عظیم وسربلند اصحاب اُس دور میں آپ کی شعری صلاحیتوں کو خراجِ عقیدت پیش کر چکے ہیں۔ اس کی تازہ مثال روزنامہ ''نوائے وقت'' میں حال ہی میں نامور شاعر فیض احمد فیض کا شائع ہونے والا وہ انٹرویو ہے جس میں فیض احمد فیض نے کالج تعلیم کے دوران میں صاحبزادہ فیض الحسن کے بہت اچھے شاعر ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ مرے کالج سیالکوٹ میں (جہاں سے صاحبزادہ صاحب نے بی اے کیا) فیض احمد فیض صاحبزادہ صاحب سے ایک سال آگے تھے۔ اس انٹرویو میں فیض احمد فیض نے اس امر کا بھی اقرار کیا ہے کہ ان کے والد روحانی سکون اور تزکیہ نفس کے لئے آلو مہار شریف جایا کرتے تھے۔

صاحبزادہ فیض الحسن نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ نے نعتوں کے علاوہ غزلیں اور نظمیں بھی لکھی ہیں۔ آپ ایک عظیم عاشقِ رسول ﷺ تھے۔ اسی عشق رسول ﷺ سے آپ کی قوتِ فکر کو عظمت ایمان اور مخلوقِ خدا میں پذیرائی حاصل ہوئی یہی جذبہ عشقِ رسول ﷺ ان کی نعتیہ شاعری میں خوشبو بن کر سماتا اور حسن ایمان بن کر اپنے روشن وجود کا احساس دلاتا ہے۔ آپ کی نعتوں میں فکرِ اقبال کے علاوہ امام احمد رضا خاں بریلویؒ کے عشق و گداز اور ظفر علی خان کے شکوہ بیاں کی ایمان آفریں جھلک بھی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ آپ کی غزلیات عشق خداوندی روحانی فکر افروزیوں کے ساتھ ساتھ سوز و گداز اور مشاہداتِ ظاہری و باطنی سے عبارت ہیں۔ آپ کی منظومات میں فکرِ اقبال اس طرح جلوہ گر نظر آتا ہے کہ اگر آپ کی یہ نظمیں آپ کا نام دیئے بغیر باقیاتِ اقبال کے نام سے شائع کر دی جائیں تو کسی کو گمان بھی نہیں گزرے گا کہ یہ منظومات اقبال کی نہیں ہیں۔ آپ کی نعتیہ شاعری پر ایک نظر ڈالتے ہی آپ کی علمی و نظری رفعتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

تیری نوائے شوق سے وجد میں ہے حریمِ ذات
تیری نظر کے کیف سے مست ہے محفلِ حیات
مرہمِ زخمِ بے کسی خندۂ زیرِ لب ترا
چارۂ دردِ عاجزی تیری نگاہِ التفات
تیرے جمال کی قسم رقص کرے گا حشر تک
تیری نوائے شوق کی دُھن پر ضمیرِ کائنات

....

تیرے وقار پر فدا رعب و جلالِ موسویؑ
تیرے جمال پر نثار جلوۂ حسنِ یوسفیؑ
تیری نگاہِ لطف ہے چارۂ دردِ عاجزی
خندۂ زیرِ لب ترا مرہمِ زخمِ بے کسی
ساقیِ محفلِ اَلست رحمت عام سے تری
آ گیا اعتدال پر کیفِ مزاجِ زندگی

نعت چونکہ حضور محمد مصطفیٰ ﷺ سے عشق و عقیدت کا اظہار ہے اس لئے شاعر نئے نئے اسلوب فکر تراش کر آپ ﷺ کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔ نعت گو شاعر مضمون آفرینی کی جملہ صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے آپ ﷺ کی صورت و سیرت کے تصور سے قلب و نظر کو منور کرتا ہوا اشعار کو اپنے جذبات کا ترجمان بنا دیتا ہے۔ نعتِ حضور ﷺ میں مضمون پیدا کرتے ہوئے

شاعر کو شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں ادب و احتیاط کو مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے کیونکہ معمولی سی فکری لغزش سے بھی توحید کا تصور مجروح ہونے یا توہینِ رسالت کے ارتکاب کا گمان گزرنے لگتا ہے۔ صاحبزادہ سید فیض الحسن صاحب علم و فضیلت شخصیت تھے۔ آپ نے عشق و عقیدت کی تمام تر عظمتوں کو دل و جان میں جگہ دیتے ہوئے راہوارِ فکر کو کسی مقام پر بھی بے قابو نہیں ہونے دیا۔ شریعت مطہرہ کی روشنی میں آپ نے مضمون آفرینی کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ ان کی تب و تاب مدتوں قلوب و اذہان کو ذوقِ معرفت عطا کرتی رہے گی۔ مثال کے طور پر۔

جمشید کا تو جام تھا جامِ جہاں نما
جامِ خدا نما ہے مگر جامِ مصطفیٰ

....

یہ فیضِ عام ہے اے رحمت تمام ترا
جہاں میں درد کوئی لا دوا نہیں مِلتا
وہ آئے ساقی کوثر کے میکدہ میں ذرا
جسے گمان ہے آبِ بقا نہیں ملتا
سنبھال لیتا ہے دستِ کرم ترا اس کو
جہاں میں جس کو کوئی آسرا نہیں ملتا
تلاش عفو کو ہے خود گناہگاروں کی
یہ فیضِ عام ہے اے رحمتِ تمام ترا
اُسی کی دُھن پہ تو عشاق رقص کرتے ہیں
ہے سازِ عشق کا مضراب پاک نام ترا

امام احمد رضا خاں بریلویؒ کاروانِ عشق و مستی کے سالار تھے۔ آپ نے اپنے غیر معمولی عشق رسول ﷺ تبحر علمی، روحانی سوز و گداز کے ساتھ ساتھ ادب و احتیاط کے تقاضوں کو بجالاتے ہوئے نعتِ رسول ﷺ کو اُردو ادب میں باقاعدہ اور مستقل صنفِ سخن کی حیثیت عطا کر دی۔ آج کا نعت گو شاعر آپ کے عشق و عقیدت سے افکار کی روشنی مستعار لیتا ہوا دربارِ رسالتؐ میں ہدیہ عقیدت پیش کرتا ہے۔ صاحبزادہ فیض الحسن کی نعتوں میں امام احمد رضا خاں بریلویؒ کی محبت رسولِ خدا ﷺ کی ایک مشہور نعت پر طبع آزمائی کرتے ہوئے کہی ہے۔ فاضل بریلویؒ کی اس مقبولِ عام نعت کے قالب میں نعت کہتے ہوئے صاحبزادہ سید فیض الحسن کا اندازِ فکر دیکھئے۔ اس میں ان کی انفرادیت بھی بصد اعزاز نمایاں محسوس ہوتی ہے۔

ہمسری کون کرے تیری کہ خود خالق نے
جب کیا ہی نہیں ثانی کوئی پیدا تیرا

اہلِ ایمان کے نزدیک کئی لاکھ گنا
مشک و عنبر سے گراں تر ہے پسینہ تیرا
بستۂ قیدِ زماں تھا دمِ عیسےٰ کا کمال
دور ہے تا بہ ابد میرے مسیحا تیرا
ساقی حشر ملے فیض کو بھی جام کوئی
میکدہ تیرا ، سبو تیرا ہے مینا تیرا

حضرت محمد ﷺ حسنِ صورت کے لحاظ سے مظہر انوارِ خداوندی ہیں تو حسنِ سیرت کے لحاظ سے آپ کا کردار عین قرآن ہے۔ حسنِ صورت کا یہ عالم کہ یٰسین وطٰہ کی تابانیاں آپ کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور حسنِ کردار کی جلوہ گری یہ کہ آپ ﷺ کا اُسوۂ حسنہ کائنات کے لیے تا بہ ابد باعثِ تقلید ٹھہرا دیا گیا۔ حقیقتاً آپ ﷺ کا حسنِ کامل صورت کی دلآویزی کے ساتھ ساتھ سیرت کی ہمہ گیری سے بھی عبارت تر ہے۔ اسی لئے نعت گو شعراء نے آپ ﷺ کے سراپائے اقدس کو اشعار کی زینت بناتے ہوئے آپ ﷺ کے اُسوۂ عالم طراز کو بھی موضوعِ فکر بنایا ہے۔ سید فیض الحسن نے حسنِ تغزل کی تمام چاشنی سمیٹتے ہوئے آپ کے جمالِ مہر افروز اور سیرت و کردار کی لمعہ افشانیوں سے ادراک و وجدان کے نہاں خانوں کو یوں منور کیا ہے کہ عظمتِ حسنِ حضور ﷺ ہر بار نئے انداز میں جلوہ فگن نظر آتی ہے۔ حسنِ حضور ﷺ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے سید فیض الحسن کا اندازِ سخن ملاحظہ کیجئے۔

نکہتِ زلف سے تری مست ہوا ہے پھول پھول
کیفِ جمال سے ترے جھوم اُٹھی کلی کلی

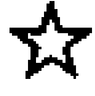
....

حسن تیرا ہے جلوہ گر تابشِ مہر ماہ میں
رنگ تیرا ہی ہے عیاں حسنِ گل و گیاہ میں
ترے وفورِ نور نے کام کیا حجاب کا
دیدۂ شوق کھو گیا تابشِ بے پناہ میں
تری شمیمِ زلف سے نکہتِ گلشنِ خیال
تری نگاہِ مست سے مستیءِ دردِ سلسبیل

اگرچہ سید فیض الحسن کی نعتیہ شاعری کے غالب حصہ میں عشق و عقیدت کے ساتھ ساتھ حضور نبی کریم ﷺ کے جمالِ اقدس کی تابانیاں بکھری نظر آتی ہیں مگر جب یہ سیرت سرورِ کائنات ﷺ کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو اور ہی لفظ سامانی کا منظر پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ

کے اشعار میں سیرتِ محمد رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ دیکھیے۔

کفیل امن ہے اور ضامنِ مسرّت ہے
زمانے بھر کے لیے حسنِ انتظام ترا
برس رہا ہے سیاہ و سفید پر یکساں
سحابِ رحمتِ حق بن کے فیضِ عام ترا



آمد سے تیری دوڑ گئی زندگی کی لہر
بے جان سی تھی محفلِ دنیا ترے بغیر
طوفاں زدہ نگاہ اُٹھے اور کس طرف
ہے کون بحرِ غم کا کنارا تیرے بغیر

صاحبزادہ سید فیض الحسن اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہیں کہ باطل نظریات کے سراب میں گم کاروانِ انسانیت فقط تعلیماتِ محمدیہ ﷺ سے خوشہ چینی کی صورت میں ہی کامیاب و بامراد ہوسکتا ہے۔ حضور صاحب لولاک ﷺ سے کٹ کر ہم کچھ بھی نہیں اور آپ ﷺ سے نسبت میسر آ جائے تو خاک کے ذرے بھی ہمدوشِ ثریّا بن جاتے ہیں۔ آج کا انسان امن وسکون کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ عالمِ اسلام غیر معمولی مشکلات ومسائل کا شکار ہو چکا ہے۔ وہ قوم جس کی ہیبت وسطوت سے شاہانِ عالم لرزاں تھے آج عظمتِ ایمان سے محروم ہو کر نمونہ عبرت بنی ہوئی ہے۔ اس کی قوت وجرات کے سوتے جو اس کے عزائم سے پھوٹتے تھے آج خشک ہو چکے ہیں۔ مسلمان قوم کی اس بے چارگی و پسماندگی کو محسوس کر کے سید فیض الحسن کا دل خون کے آنسو روتا ہے اور وہ حضور سید یوم النشور ﷺ کے دربار میں اُمت کا استغاثہ پیش کر کے آپ کی نگہِ رحمت کے اُمیدوار بنتے ہیں۔ طویل نعت کی صورت میں آپ نے اُمت کا استغاثہ اس خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے آنکھیں بے اختیار شدتِ احساس سے نم ہو جاتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

المدد اے رحمۃ اللعالمین
جاں گسل ہے پھر غمِ دنیا و دیں
جو ترے قدموں کے صدقے میں ملی
تنگ ہے اسلام پر وہ سر زمیں
بڑھ رہے ہیں پھر ہوس کے فاصلے
ہو رہا ہے قلب پھر اندوہ گیں

پھر مقابل گردشِ حالات ہے
زہر کو سمجھا مسلماں انگبیں
ہو سکے گی کفر کے در پر نہ خم
حشر تک تیرے غلاموں کی جبیں
بیکسوں کا مشکلاتِ دہر میں
جُز تیرے ملجا نہیں ماویٰ نہیں
ہو توجہ اس کے حالِ زار پر
فیضؔ ہے تیرا غلامِ کمتریں

نعتِ رسول کریم ﷺ فکروفن کی معراج بھی ہے اور لوح وقلم کا وقار بھی۔ علم وادب کا افتخار بھی ہے اور بزمِ ہستی کا نگار بھی۔ ہر عہد اس کا عظمت شناس ہے تو ہر صدی اس کی رفعت آشنا۔ ادیبوں نے اسے فکر کا بانکپن سمجھا تو خطیبوں نے اعجازِ نطق خیال کیا۔ دانشوروں نے متاعِ یقین سمجھا تو عُشاق کو امیں ارمغانِ محبت کی جلوہ فرمائی نظر آئی۔ آج کا دور نعت رسولِ کریم ﷺ کا دور ہے۔ آج کا شاعر حضور ﷺ کے دامانِ رحمت سے وابستگی کو اپنا اعزاز اور آپ سے عقیدت کو سرمایا ایمان سمجھتا ہے۔ صاجزادہ سید فیض الحسن بھی نعتِ رسول ﷺ کہتے ہوئے بے پناہ خوشی وسرشاری محسوس کرتے ہیں۔ وہ توفیقِ نعت گوئی کو خدا کی طرف سے عطا ہونے والی نعمتِ عظمیٰ قرار دیتے ہوئے اس نسبتِ روحانی پر انتہائی نازاں ہیں۔ اس امر کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

زہے نصیب سعادت ملی ہے مدحت کی
مری نجات کو یہ انتخاب کافی ہے

....

اگر قبول کرے رحمتِ تمام تری
تو فیض پیش کرے ارمغانِ بے ہنری

....

شرف یہ بھلا فیض کیا تجھ کو کم ہے
کہ تو بھی ہے ادنیٰ ثنا خوانِ احمدؐ

آقائے دو عالم افتخارِ آدم وبنی آدم جناب رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ والا صفات خلاصہ محاسنِ کائنات ہے۔ آپ کا اسمِ گرامی وہ اسمِ اعظم ہے جس سے دلوں میں مرادوں کے پھول کھلتے

اور تمناؤں کے چمن زار مہکتے ہیں۔ اس نام کی تاثیر مسلم اور اس کی تکرار حلاوت آفریں ہے۔ یہ نام کلید مخزنِ عرفان بھی ہے اور حاصل ایمان بھی۔ اس نام کے ساتھ رحمۃ اللعالمین کا جو تصور وابستہ ہے وہ محروم انسانوں کے لیے پیام اُمید بھی ہے اور عالمِ اسلام کی عظمت و سربلندی کی نوید بھی۔

سید فیض الحسن حضور رحمۃ اللعالمین ﷺ کی رحمت بے پایاں کا تذکرہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ عشق و ارادت اپنے تمام تر سوز و گداز کے ساتھ شاعر کے مافی الضمیر سے چھلکتے نظر آتے ہیں۔ آپ کی بے کراں رحمت کو آواز دیتے ہوئے سید فیض الحسن ماجرائے عشق یوں پیش کرتے ہیں۔

سن کبھی اے جانِ خوبی قصہ دردِ نہاں
ہے لکھی دل نے مرے یہ داستاں تیرے لئے
ہیں اُٹھائے فیض بے کس نے بھی جانِ جہاں
کیسے کیسے درد کے کوہِ گراں تیرے لئے

....

فیض سناؤں کس طرح قصہ دردِ آرزو
وقفہ حشر مختصر اور مری داستاں طویل

صاحبزادہ سید فیض الحسن کا نعتیہ کلام اُن کے عشقِ رسول اللہ ﷺ کا غماز اور اُن کے گدازِ ایمانی کا ہمراز نظر آتا ہے۔ یہ نعتیں ان کے جذبِ اندروں کا اظہار بھی ہیں اور ان کے حسنِ عقیدت کا شہکار بھی۔ اشعار کی صورت میں انہوں نے شوقِ بے تاب کی عرض گزاری کا سامان مہیا کیا ہے۔ خاموش جذبوں کو الفاظ کی زبان بخش کر اپنی تمناؤں کو دربارِ رسول ﷺ میں پیش کیا ہے۔

جیسا کہ ہم آغاز میں عرض کر چکے ہیں کہ صاحبزادہ سید فیض الحسن کی شاعری فکرِ اقبال سے یوں متاثر ہوئی کہ اقبال کا رنگ اپنی تمام تر امتیازی خصوصیات کے ساتھ ان کے کلام میں نمایاں ہو گیا۔ اقبال کی محبوب اصطلاحات اور تراکیب ان کے کلام میں اپنی تشریحات کے ساتھ ان کے کلام کا روشن پہلو دکھائی دیتی ہیں۔ عقل و عشق، جنون و خرد، ذوق و شوق، حسن و عشق وغیرہ۔ نعت وہ یا نظم ہر مقام پر راہوِ عشق عقل کو حیران و پریشان چھوڑ کر منزلِ مقصود پر پہنچتا نظر آتا ہے۔ جنون کی سرفرازی خرد کی ظاہری چکا چوند کا طلسم باطل کرتی نظر آتی ہے۔ عشق کی قبولیت اور پذیرائی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جس کی تپش کا ہو اثر اس کے حریم ناز تک
ایسا ہی سوز ہے نہاں عشق کی اک نگاہ میں

منطق و فلسفہ کے سب ساحل استوار فیض
بہہ گئے سیلِ عشق کی یورشِ بے پناہ میں

....

بن کے رہے گی اک دن سرمۂ دیدۂ سحر
میرے جنوں کے فیض سے ظلمتِ شامِ عاشقی
ہوش کی سختیاں گئیں عقل کی دھمکیاں گئیں
جب سے بنا ہے دل مرا فیض غلامِ عاشقی

''جنون وخرد'' کے عنوان سے ان کی نظم جنوں کی منزل آشنائی اور خرد کی کوتاہ بینی کے راز آشکار کرتی نظر آتی ہے۔ اقبال کی طرح انہوں نے بھی جنوں کو عشق کی صورت میں جذبہ بے کراں سے تعبیر کیا ہے۔ جبکہ خرد راستے کے غبار میں گم منزل کی ادنی سی جھلک سے بھی محروم و نامراد دکھائی دیتی ہے، اس نظم کے تین اشعار پیش ہیں۔

خرد کو جب بھی ملا وہ پسِ نقاب ملا
جنوں کو جب بھی ملا ہو کے باریاب ملا
یقیں خرد کو نہیں اپنی کامیابی کا
جنوں کو مل بھی چکا اذن باریابی کا
خرد تو کوئے طلب کے غبار میں گم ہے
جنوں مشاہدۂ حسنِ یار میں گم ہے

صاحبزادہ سید فیض الحسن نے بعض شعائر اسلامی پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ اذان، نماز، عبادت اور عید کے عنوانات سے انہوں نے ان کی حقیقی روح کو اُجاگر کیا ہے۔ ان کا اندازِ فکر سطحی یا عارضی نہیں ہے بلکہ انہوں نے ان شعائر کے فکری پہلو کو تمام فنی لوازمات کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا اندازِ فکر محدود یا مختصر نہیں ہے بلکہ ان کی سوچ، ان شعائر کے بنیادی مقاصد اور علمی وتہذیبی پس منظر کو واضح کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ عبادت کے عنوان سے ان کی فکرافروزی کی ایک جھلک دیکھئے۔

جبلّت کے تقاضوں کو محبت آشنا کرنا
مزاجِ زندگی کو خوگرِ حمد و ثنا کرنا
جمالِ حسنِ مطلق کے حسیں جلوؤں میں کھو جانا

عید کو اکثر شعراء نے اپنی وقتی خوشیوں کی صورت میں موضوع شاعری بنایا ہے۔ اپنی ان منظومات

میں ان شعراء کی نظر عید کے سامانِ خورد ونوش اور رنگ برنگے ملبوسات سے آگے نہیں بڑھ سکی مگر صاحبزادہ سید فیض الحسن نے علامہ اقبال کی طرح عید کی مسرّتوں میں جلوہ گر اس فلسفہ کو واضح کیا ہے کہ جو عید کو اہلِ ایمان کے لیے حقیقی خوشی ومسرت کا پیغام اور ماہِ صیام کے رُوحانی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے والوں کے لیے خدائے پاک کا انعام بنا دیتا ہے۔سید فیض الحسن کہتے ہیں۔

مسافرانِ رہِ شوق کامیاب ہوئے
حرمِ حسن کے انوار بے نقاب ہوئے
مہِ صیام کی تکمیل کی نوید ملی
خدا کا شکر ہے تبریکِ روزِ عید ملی

''اذان'' وہ نغمہ لاہوت ہے جو اہلِ ایمان کے دلوں کو عبادت کے لیے اُبھارتا اور ان کے ایمان کو جلا بخشتا ہوا توحید ورسالت کے آداب سکھاتا ہے۔اذانِ صبح عبادت کی اولین تنویر بھی ہے اور بندگانِ خدا کے جذبہ یقین کی تنویر بھی۔سید فیض الحسن کی نظم بلاشبہ اردو ادب کا شہ پارہ ہے۔انہوں نے اس میں فکر وفلسفہ کے کتنے ہی جواہر تابدار جگمگاتے ہوئے اشعار کی صورت میں اصحابِ ایمان کے سامنے پیش کیے ہیں۔تشبیہات واستعارات اور ایمان افروز تراکیب کے سبب یہ نظم دلوں کو عبادت آشنا کرتی نظر آتی ہے۔

گمشدہ نغمہ ہے کوئی بربطِ لاہوت کا
وجد میں ہے جس کے زیر وبم سے دل ناسوت کا
یہ نویدِ قربِ منزل ہے پیامِ وصل ہے
ہر سحر اس کے فسوں سے رشکِ شامِ وصل ہے
صبحِ صادق ہے صدائے سارباںِ عشق
اُٹھ کہ یہ وقتِ رحیل کاروانِ شوق ہے

نماز کو اہلِ ایمان کی معراج کہا گیا ہے۔اس عنوان سے سید فیض الحسن کی شعری صلاحیتیں کس طرح رنگ دوام پیدا کرتی ہیں دیکھنے کی چیز ہے۔اس نظم کے آخری دو شعر پیشِ خدمت ہیں۔نماز چونکہ عشقِ خداوندی کا پرتَو اور جلوۂ حسنِ خدا میں کھو جانے کا انداز ہے اس لئے ان کا استدلال ملاحظہ ہو۔

حریمِ ناز پردے اُٹھائے جاتے ہیں
جمالِ یار کے جلوے دکھائے جاتے ہیں

حریم حسن میں جب عشق باریاب ہوا
یہی ہے عشق کی معراج کامیاب ہوا

غالب اپنی ایک غزل کے نعتیہ مطلع میں جمالِ محمدی ﷺ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

منظور تھی یہ شکل تجلی کو طور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

سید فیض الحسن ''ظہورِ نور'' کے عنوان سے حسن و جمال حضور ﷺ کی تابانیوں اور طلعتوں کو زبردست خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اپنے عشق واردات کی جولانیاں دکھاتے ہیں۔غالب کے اس شعر کی روشنی میں ان کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

وجودِ حسن رُخِ یار کا نقاب بنا
فروغِ نور ہی خورشید کا حجاب بنا
شفق میں رنگ بھرا اور گلوں کو مہکایا
ہزار رنگ میں اُسنے ظہور فرمایا
کہاں کہاں اسے دیکھا کہاں کہاں پایا
وہ جانِ ناز برنگِ نیاز بھی آیا

''عظمتِ آدم'' کے عنوان سے ان کی فکرانگیزی کے انداز میں ملاحظہ کیجئے۔

اس طرح شیشہء امکاں میں ہیں انوارِ وجود
محفلِ راز کی غماز ہوئی بزمِ شہود
ایک ایک قطرے میں نہاں شوکتِ قلزم دیکھو
دیکھنے والو ذرا عظمتِ آدم دیکھو

ذوق وشوق اقبال کا خاص موضوع ہے۔اقبال نے اس موضوع سے اُمت مسلمہ کو نئی زندگی کا پیغام دیا ہے۔ان کے پیغام کی بدولت ذوق وشوق کی وارفتگی خاک کے ذروں کو ہمدوشِ ثریا ہونے کا سلیقہ بخش دیتی ہے۔یہی فکر سید فیض الحسن کی نظم ''ذوق'' میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

ذوق احساس و تخیل کو جلا دیتا ہے
ذوق ذرّے کو بھی خورشید بنا دیتا ہے
معرفت کے درِ مسدود کو وا کرتا ہے
فکر کو طاقتِ پرواز عطا کرتا ہے

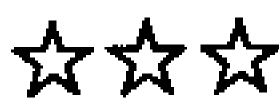
''سرورِ سرمدی'' کے عنوان سے بیان کی فکری پرواز کی بلندی دیکھئے۔

خرد فریبِ زندگی جنوں شعورِ زندگی
یہ رازِ دارِ زندگی وہ محوِ جستجو ابھی
ہے میکدے میں کام کیا شعورِ ناتمام کا
دلیلِ جہل ہے یہاں شعور صبح و شام کا

سید فیض الحسن کی شعری وادبی صلاحیتوں سے خراج لینے والے ''حسن'' کا بانکپن ملاحظہ کیجئے۔

حسن ربط و ضبطِ ہستی حُسن رُوحِ کائنات
ملتِ تخلیقِ آدم رونقِ بزمِ حیات
بزمِ امکاں حسن سے جنت بداماں ہوگئی
اس کے دم سے ہر خلش راحت کا ساماں ہوگئی

صاحبزادہ سید فیض الحسن کی شاعری اُن کی غیر معمولی علمی وادبی صلاحیتوں کا نہایت خوبصورت اظہار ہے۔ اِن کی شاعری میں مطالعہ کی گہرائی بھی ہے اور مشاہدہ کی گیرائی بھی۔ مضمون آفرینی بھی ہے اور زبان و بیان کا خوبصورت انداز بھی۔ پرشکوہ تراکیب بھی ہیں اور برمحل معاملہ بندی بھی۔ رفعتِ افکار بھی ہے اور شوکتِ استدلال بھی۔ جذبات ایمانی کی سچائی بھی ہے اور خلوص عقیدت کی رعنائی بھی۔ آپ کی منظومات ہنگامی، وقتی یا عارضی سوچ کی حامل یا کسی سطحی فلسفے کی اسیر نہیں بلکہ آپ کی فکر کا منبع قرآن، حدیث اور مطالعہ تاریخ وتہذیب ہے۔ اس لئے آپ کی منظومات کا تاثر اتنا جامع' تاثیر اس قدر ہمہ گیر اور نظریاتی استدلال سے اس قدر بھرپور ہے کہ آپ کی شاعری یقیناً بہی خواہاں ادب کے نزدیک باعثِ افتخار قرار پائے گی۔ ہمیں یقین ہے کہ تشنگانِ معرفت کو ان کی شاعری سے ذوق ایمانی کی جلا بھی میسر آئے گی اور فکر ونظر کی تابندگی بھی۔ صاحبزادہ صاحب کا نعتیہ کلام ان کے لیے توشہ آخرت بھی ثابت ہوگا اور انہیں دنیائے ادب میں حیاتِ جاوداں بخشنے کا باعث بھی بنے گا۔



عہد آفریں نعت گو

حفیظ تائب

منزلِ شوق کی جانب آگے بڑھتے ہوئے بعض رہ نورد اس قدر خوش نصیب ہوتے ہیں کہ انکے قدموں کی چاپ آنے والے دور کے مسافروں کے لئے نشانِ منزل بن جاتی ہے اور مستقبل کے مسافرانِ جادۂ شوق اس خوش بخت مسافر کے فکر و عمل کے سرمائے کو اپنے لئے میزان تصور کرتے ہیں۔ حضرت حفیظ تائب کو قدرت نے اسی سعید بختی سے اس فیاضی سے نوازا ہے کہ انہیں نعتیہ شاعری کے حوالے سے کاروانِ عشق حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا حدی خوان تصور کیا جاتا ہے ایسا حدی خوان جو صرف خود ہی محبتِ رسول کے فکری و عملی تقاضوں کے مہکبار راستے پر کامرانی سے سفر نہیں کرتا بلکہ جس کی آواز سلطانِ خوبانِ دو عالم ﷺ کے دوسرے متوالوں کو بھی حب حضور ﷺ کی لازوال دولت سے بہرہ ور کر دیتی ہے۔ احمد نگر (گوجرانوالہ) کی خاک سے ابھرنے والے اس ماہتاب صفت نعت گو کو خوش قسمتی ایک نئے جذبۂ امتنان و تشکر سے آشنا کر رہی ہے ۔

خوش ہوں کہ میری خاک ہی احمد نگر کی ہے
مجھ پر نظر ازل سے شہِ بحر و بر کی ہے
یادِ نبی ہو منزلِ عقبیٰ میں ساتھ ساتھ
میری بس ایک یافت یہی عمر بھر کی ہے

حفیظ تائب گلستانِ نعت کے وہ خوش بخت عندلیب ہیں کہ جن کی نوا سے برصغیر کے بے شمار دل عشقِ حضور پُر نور ﷺ کی دولت سے آباد ہوئے۔ آپ نے ایک عرصہ تک غزل کو اپنے خونِ جگر سے نوازا اور محبوبانِ مجازی کے حوالے سے نمائندہ غزلیات پیش کرتے رہے مگر جب احمد نگر کے درویش صفت حضرت الحاج چراغ دین قادری کے اس نورِ نظر کے تصورات کے خلوت کدوں میں محبوبِ خدا ﷺ کے انوار کی بارات اتری تو پھر کسی اور کوچے کا رُخ نہ کیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سیدنا حسانؓ بن ثابت کے کاروانِ نعت گوئی کے رکن بن گئے ۔ یہ وہ دور تھا جب نعت کو مؤقر اخبارات و جرائد تبرکاً اسلامی تقاریب کے موقعہ پر ہی جگہ دیتے تھے۔ ایک زمانہ غزل کی دُھن میں مست تھا۔ کرامت علی شہیدی، الطاف حسین حالی، امام احمد رضا خاں بریلوی، علامہ محمد اقبال

اور حفیظ جالندھری کی جادوانی شاعری جمالِ نعت سے دلوں کو مستنیر کر رہی تھی مگر عہدِ حاضر کو ایسے بلند آہنگ نعت گو کی ضرورت تھی جس کی آواز وقت کے بے کراں سناٹوں کے طلسم کو پارا پارا کر کے ''ورفعنا لک ذکرک،، کی تفسیر بن جائے۔ یہ سعادت غزل کے شبستانِ ہوس سے نعت کے گلزارِ مہکبار کی سمت عقیدت و شیفتگی کی سوغات لے کر آنے والے حفیظ تائب کو ہی حاصل ہوئی' انہوں نے غزل کا رُخ موڑ دیا اور حسنِ تغزل کے ربط سے نعت و مدحت کے قدسی زمزمے پھوٹ نکلے۔ عصرِ حاضر کی ترجمانی کرتے ہوئے نعت کے کوہِ فاران سے ایک صدائے دردناک ابھری۔

دے تبسم کی خیرات ماحول کو ، ہم کو درکار ہے روشنی یا نبی
ایک شیریں جھلک ایک نوریں ڈھلک تلخ و تاریک ہے زندگی یا نبی

یہ صدا حفیظ تائب کی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے حفیظ تائب اور عہدِ حاضر لازم و ملزوم ہو گئے۔ حفیظ تائب نے اس شدتِ احساس کے ساتھ نعت گوئی کا پرچم سر بلند کیا کہ ہر غزل گو کا دل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہِ قدس میں مدحت و توصیف کے گلاب نذر کرنے کے لئے مچلنے لگا۔ حفیظ تائب کی نعتیہ شاعری نے ایک زمانے کو متاثر کر دیا اور انتہائی قلیل مدت میں اس عظیم نعت گو کا نام بے شمار عشاقِ مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء کے دلوں کی دھڑکنوں میں آباد ہو چکا تھا۔ حفیظ تائب کا قلم ستائش کی تمنا اور صلے کی آرزو سے بے نیاز ہو کر اردو شاعری کو نعت و عقیدت کے نئے تقاضوں سے آشنا کر رہا تھا۔ حفیظ تائب کو بارگاہِ خداوندی سے عطا ہونے والی ان عظمتوں کے پس پردہ ان کی یہ دعا کارفرما تھی کہ۔

یارب ثنا میں کعبؓ کی دلکش ادا ملے
فتنوں کی دوپہر میں سکوں کی ردا ملے
حسانؓ کا شکوہِ بیاں مجھ کو ہو عطا
تائیدِ جبرائیل بوقتِ ثنا ملے
آئے قضا شہیدیؒ خوش بخت کی طرح
دُوری میں بھی حضوریٔ احمد رضاؒ ملے
جو مدحتِ نبیؐ میں رہا با مراد و شاد
اس کاروانِ شوق سے تائب بھی جا ملے

یہ دعا بارگاہِ ایزدی میں باریاب ہوئی۔ ''ورفعنا لک ذکرک'' کا غلغلہ بلند ہوا اور صاحب تقدیر نے شہرتِ عام بقائے دوام کا تاج حفیظ تائب کے سر پر سجا کر انہیں دوسرے مدحت

نگاروں سے ممتاز کردیا انکی انفرادیت کا ایک پرتو ممتاز محقق ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم کے اس اقتباس میں نظر آتا ہے۔

''یہ تو ظاہر ہے کہ ہر صنف کی طرح نعت میں بھی ہر شاعر یا نعت گو کی ایک انفرادی آواز ہوتی ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ حفیظ تائب کی نعت کی بھی ایک انفرادی آواز ہے جو عصر حاضر کے دوسرے نعت گوؤں سے اسے ممتاز کرتی ہے۔ یہ آواز ہے۔ وفورِ شوق و عقیدت۔ وہ لہجہ جو ادب ولحاظ کا پاسدار ہے۔ حفیظ تائب کی نعت کو پڑھ کر کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسا وصاف ہے جو حضور کے روبرو کھڑا ہے اس کی نگاہیں جھکی ہوئی ہیں اور اس کی آواز احترام کی وجہ سے دھیمی ہے مگر نہ ایسی کہ سنائی ہی نہ دے اور نہ ایسی اونچی کہ سوءِ ادب کا گمان گزرے۔ شوق ہے کہ اُمڈا آتا ہے اور ادب ہے کہ سمٹا جارہا ہے۔''

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے حفیظ تائب کی نعت گوئی میں جس وفورِ شوق و عقیدت کو ان کی انفرادیت ٹھہرایا ہے اس کی ایک جھلک اس نعت میں ملاحظہ ہو۔

بادِ رحمت سنک سنک جائے
وادئ جاں مہک مہک جائے
جب چھڑے بات نُطقِ حضرت کی
غنچۂ فن چٹک چٹک جائے
ماہِ طیبہ کا جب خیال آئے
شب ہجراں چمک چمک جائے
جب سمائے نظر میں وہ پیکر
ذہن میرا دمک دمک جائے

اور پھر طائر گلستانِ توصیفِ حضورؐ بارگاہ سرورِ کائنات میں وفورِ شوق و عقیدت سے مغلوب ہوکر عظمتِ رسالتمآب ﷺ اور اپنی کم مائیگی کا یوں اعتراف کرتا ہے۔

خوشبو ہے دو عالم میں تری اے گُل چیدہ
کس منہ سے بیاں ہوں ترے اوصافِ حمیدہ
تجھ سا کوئی آیا ہے نہ آئے گا جہاں میں
دیتا ہے گواہی یہی عالم کا جریدہ

یہ گُل چیدہ کون ہے کہ جس کی نکہت ونور کے حضور تائب نوا پیرا ہیں یہی تو گلزارِ توحید کا وہ گُلِ یکتا ہے کہ جس کی خوشبوئے دل نواز نے کثافت آلود دلوں کو عرفانِ خداوندی کی لطافتوں سے آشنا

کر دیا ہے۔اسی گلِ چیدہ کی مہک نے دلوں کے غنچے کھلا دیئے اور شدتِ الم سے گریہ کناں انسانوں کو حیات نو کی نوید بخش دی۔یہی گلِ چیدہ محمد ﷺ بھی ہے اور احمد ﷺ بھی' طٰہٰ بھی ہے اور یٰسین بھی ،مظہرِ انوارِ خدا بھی ہے اور محبوبِ مخلوق دوسرا بھی، باعث تکوین دو عالم بھی ہے اور قیامت کی لرزا دینے والی ساعتوں میں شفیع اعظم بھی، جو ازل کا ظہور بھی ہے اور ابد کا نور بھی۔نعت کہتے ہوئے حفیظ تائب کو ہر گام پر یہ احساس دامنگیر ہے کہ وہ جس ہستی والا صفات کے حضور عقیدتوں کا ارمغان لے کر حاضر ہو رہے ہیں وہ ان کی توصیف نگاری کی محتاج نہیں بلکہ شاعر اپنے کلام کو دوام بخشنے اور اپنی نجات کا سامان ڈھونڈنے کے لئے اس محسنِ اعظم کی ثنا گوئی کر کے ہی ایمان کے تقاضوں کی بجا آوری کا شرف حاصل کر سکتا ہے۔وہ اپنی اس خوش قسمتی پر یوں نازاں ہوتے ہیں۔

اپنی خوش بختی پہ تائب کیوں نہ مجھ کو ناز ہو
کم نہیں سرکار کی مدحت سرائی کا شرف

☆

دلِ محزوں میں یادِ مصطفیٰ ہے
اندھیرے میں چراغ اک جل رہا ہے

☆

کیا ہے نعت میں دیوانِ تائب
مری بخشش کا ساماں ہو گیا ہے

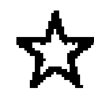
حفیظ تائب کے اردو نعتیہ مجموعے ''صلو علیہ وآلہ،، ''وسلمو تسلیما،، اپنے عنوانات کے لحاظ سے درود پاک کا حُسن رکھتے ہیں کیونکہ شاعر کو احساس ہے کہ نعت درود ہی کا دوسرا نام ہے۔ نعت کہیے یا درود کہیے۔خدا بھی اپنے محبوب ﷺ پر درود نازل فرما رہا ہے،فرشتے بھی یہی محسن ترین فریضہ انجام دے رہے ہیں۔انبیاء و رسل بھی اپنے اپنے ادوار میں درودوں کے پھول ان دیکھے نبی ﷺ کو نذر کرتے رہے۔خدائے کریم اُمت مسلمہ کو بھی درود و سلام کا حکم دے رہا ہے گویا قدرت کی طرف سے ہمیں یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ عشاقِ رسول اپنے آقا و مولا پر درود بھیج کر اپنے خالق کے حکم کی تعمیل ہی نہیں کر رہے بلکہ خدا کی سنت بھی بجا لا رہے ہیں۔حفیظ تائب کی نعت گوئی درود و سلام کا حقیقی روپ ہے۔سلطان دو عالم کی صفت و ثنا،آپ کی عظمت و سربلندی کا تذکرہ، آپ کے حضور مناجات گزاری،آپ کے محاسنِ قدسی اور آپ کے جمال و کمال کا تذکرہ،آپ کی

صورت وسیرت کی جلوہ کاریاں، آپ کے کردار اور گفتار کی مہکباریاں۔ یہ سب کچھ وہ نعتوں میں بیان کر کے حکم خدا کی تعمیل کرتے ہوئے کس قدر نازاں ہیں اس کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے۔

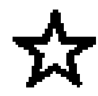
منزلِ ذات کا تنہا رہرو، صلی اللہ علیہ وسلم
مطلعِ او ادنیٰ کا مہِ نو، صلی اللہ علیہ وسلم
توقیرِ انساں ٹھہری ہے تنویرِ امکاں ٹھہری ہے
عرصۂ حق میں اس کی تگ و دو، صلی اللہ علیہ وسلم

حفیظ تائب کی نعتوں میں عقیدت اپنی انتہا کو چھو رہی ہے۔ ہر گام پر احساس ہوتا ہے کہ حفیظ تائب مقامِ مصطفےٰ ﷺ کی رفعتوں سے باخبر ہیں اور جانتے ہیں کہ یہاں تو جنیدؒ و بایزیدؒ بھی دم بخود آتے ہیں۔ یہاں تو ملائکہ بھی ادب و احترام کی تجلیات کو دل و جان میں سمو کر محوِ طواف رہتے ہیں۔ وہ حضور ﷺ کی ثنا کرتے ہوئے اس حقیقت کو بحسن وخوبی مدنظر رکھتے ہیں کہ حضور ﷺ گنبدِ خضریٰ کی نورانی چھاؤں میں آرام فرما ہو کر بھی اسی ادب و احترام اور عقیدت کے حقدار ہیں جیسا آپ حیاتِ ظاہری میں تھے۔ اسی لئے حفیظ تائب نے اپنی نعتوں میں عصرِ حاضر کے نعت گو شعراء کو بارگاہِ مصطفےٰ ﷺ میں عرض گزاری کے لئے ادب و احترام کے نئے نئے اسلوب عطا کئے ہیں۔ اس معاملہ میں ان کے پیشِ نظر قرآنِ حکیم کی آیات کا نُور اور اصحاب رسول کا غیر معمولی جذبۂ حسنِ ارادت جلوہ گر رہا ہے، انداز بدل بدل کر انہوں نے اپنی عقیدت آفرینی کی بدولت عشاقِ سرورِ کونین ﷺ کے دلوں کو محبتِ محبوبِ خدا ﷺ کے آداب جس طور سکھائے ہیں ان کی تب و تاب سے دلوں کو منور کیجئے۔

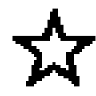
ذہن میں رکھ آیۂ لا ترفعو اصواتکم
بات کر طبعِ پیمبرؐ کی نفاست دیکھ کر



شوق و نیاز و عجز کے سانچے میں ڈھل کے آ
یہ کوچۂ حبیب ہے پلکوں سے چل کے آ
اُمت کے اولیا بھی ادب سے ہیں دم بخود
یہ بارگاہِ سرورِ دیں ہے سنبھل کے آ
آتا ہے تو جو شہرِ رسالت مآب میں
حرص و ہوا کے دام سے باہر نکل کے آ



قدموں میں شہنشاہِ دو عالم کے پڑا ہوں
میں ذرہ ناچیز ہوں یا بخت رسا ہوں
اے کاش ذرا دیر یہیں وقت ٹھہر جائے
میں پیشِ رسولِ عربی نعت سرا ہوں



کاش طیبہ میں سکونت کا شرف مل جاتا
دیکھتے روضۂ سرکار کو آتے جاتے
اس خنک شہر کو جاتی ہوئی اے نرم ہوا
ساتھ لے جا مرے جذبات بھی جاتے جاتے

بلا شبہ حفیظ تائب کی نعتیہ شاعری نے کاروان مدحت ونعت کے مسافرانِ خوش بخت کے قدموں کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لئے موثر راہنمائی کا کردار ادا کیا ہے۔وہ راہنما جو اُمت مسلمہ کو جگانے کے لئے عظمتِ مصطفےٰ علیہ السلام اور شوکتِ اسلاف کے ترانے بھی الاپتا ہے دورِ حاضر میں امت مسلمہ کی بیچارگی کی دلدوز کیفیت بھی بیان کرتا ہے اور ماضی اور حال کے حوالے سے وہ پُر شکوہ دورِ استقبال کی دعا کرتا ہے۔حفیظ تائب کی آواز غزل کے خوگر شعراء کے دلوں کو جھنجوڑتی رہی ،حجاز کی چھاؤں میں سایۂ خنک تلاش کرنے والوں کو شافعِ روزِ محشر کے دامانِ شفاعت تلے پناہ ڈھونڈنے پر آمادہ کرتی رہی۔چونکہ تائب نے خود غزل سے نعت کی طرف اپنا سفر مکمل کرنے کے لئے برسوں کی تڑپ اور بے شمار شب و روز کی کسک بارگاہِ حضور علیہ السلام میں نذر کی تھی اس لئے ان کے دل سے جو بات نکلی وہ روحانیت کے دوش پر پرواز کرتی ہوئی لاتعداد دلوں کو متاثر کر گئی۔تائب نے جو کہا دل سے کہا۔جو لکھا دل سے لکھا۔اپنے کردار کی وسعتوں کو سیرتِ حضور علیہ السلام کی اتباع سے جلوہ ریز کیا۔ان کی نعت گوئی ریا کاری سے پاک مصلحت سے بے نیاز اور داد و تحسین سے بے نیاز رہی۔یہ علیحدہ امر ہے کہ داد بھی ملی اور اہل نظر نے قلب کی تمام تر فراخی کے ساتھ اسے تحسین کا مستحق بھی ٹھہرایا۔ماضی حال اور مستقبل کے تناظر میں بات کرنا حفیظ تائب کی نعت گوئی کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ایک نظریاتی گھرانے کے چشم و چراغ سے یہی توقع کی جاسکتی ہے۔تاریخ پر گہری نظر، سیرت مصطفےٰ علیہ السلام کا عمیق مطالعہ، خصائص حضور علیہ السلام سے باخبری اور مسلمانوں کے حق میں حالات کی ستم کاری نے حفیظ تائب کے قلم کو امت اسلام کا ترجمان بنا

دیا۔ تڑپتے بھی ہیں اور تڑپاتے بھی ہیں، روتے ہی نہیں رلاتے بھی ہیں۔ آمدِ حضور ﷺ کا استقبال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

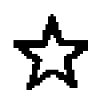
سکۂ حق چلانے حضور آ گئے
نقشِ باطل مٹانے حضور آ گئے
معصیت کے عذابِ الناک سے
آدمی کو چھڑانے حضور آ گئے

اور پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وسیلے سے شوکتِ ماضی کا ایک انداز ملاحظہ ہو۔

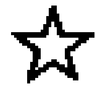
اسلوب زندگی کا ہوا دلکش و حسیں
امن و سلامتی کا علم دار آ گیا
سلجھیں تمام گیسوئے حکمت کی الجھنیں
جب دہر میں وہ کاشف اسرار آ گیا
گم کشتگانِ راہ نے پایا سراغِ زیست
میر حجاز و قافلہ سالار آ گیا
دم توڑتی حیات کی نبضیں سنبھل گئیں
تقدیر کے ستاروں کی راہیں بدل گئیں

اُمت مسلمہ کا زوال دیکھ کر حفیظ تائب کے دلِ مضطر کی تڑپ دیکھئے۔

پھر اُٹھا ہاتھ بہرِ دعا یا نبیؐ
شاد ہو جائے خلقِ خدا یا نبیؐ
پھر سرافراز ہو اُمتِ آخریں
ختم ہو یورشِ ابتلا یا نبیؐ
حرمتِ خونِ انساں ہو سب پر عیاں
پھر چلے خیر کا سلسلا یا نبیؐ



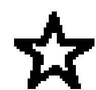
دل کو مرے تڑپانے لگی پستیٔ اُمت
جوں جوں مجھے یاد آنے لگی رفعتِ مولیٰ



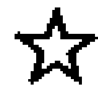
اس شاہ کی اُمت ہوئی محتاجِ زمانہ
ہر نعمتِ کونین ہے جس شاہ کا صدقہ
یہ حال زبوں اُمتِ مرحوم کا یارب
اب شاعرِ سرکار سے دیکھا نہیں جاتا
پھر ملتِ بیضا کو سرافرازِ جہاں کر
اب پھیر دے ماضی کی طرف چہرۂ فردا

حفیظ تائب کا بہت بڑا اعزاز یہ ہے کہ انہوں نے نعت کو اُسوۂ حضور ﷺ کا ترجمان بنا کر اسے تبلیغ دین کا ذریعہ بنا دیا۔ اُسوۂ مصطفےٰ ﷺ تاریخ اسلام میں اکمل ترین ضابطۂ حیات ہے حضور سرور کائنات ﷺ کے لازوال کردار نے عرب کے جاہل بدوؤں کو زمانے بھر کے مقدر کا مالک بنا دیا۔ آپ نے اخلاق ومحبت کی دولت اس طرح لٹائی کہ سفاک ترین انسان بھی آپ کے قدموں پہ جھک گئے۔ آپ نے پتھر کھا کر پھول برسائے۔ خون کے پیاسوں کو رحمت کی قبائیں عطا کیں۔ جان کے دشمنوں کو سینے سے لگا لیا۔ معمولی باتوں پر جنگ وجدل کا بازار گرم کرنے والوں کے دل آپس میں ملا دیئے۔ آپ نے ظلم وتشدد کے خوگر صحرانشینوں کو خُلق ومروت کا پیکر بنا دیا۔ سب سے بڑھ کر آپ نے اُمتِ مسلمہ کو عظمتِ حیات کا لازوال منشور دیا۔ یہ منشور حیات آپ کے کردار کی رفعتوں سے عبارت ہے۔ حفیظ تائب کی تاریخ پر گہری نظر ہے وہ ایک سچے اور کھرے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیقی شعور سے بھی بہرہ ور ہیں۔ انہوں نے حضور ﷺ کی ذات کو حسنِ عقیدت کے حوالے سے بھی دیکھا ہے اور سیرت وکردار کی میزان پر بھی پرکھا ہے اور وہ اس حقیقت سے آشنا ہوئے ہیں کہ سیرتِ مصطفےٰ ﷺ کو شمعِ راہ بنا کر نہ صرف عظمتِ اسلاف کے افسانے دہرائے جا سکتے ہیں بلکہ اقوام عالم کی راہنمائی کا اعزاز بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ حفیظ تائب سیرتِ حضور ﷺ کے انوار سے کس طرح ایوانِ نعت کو جگمگاتے ہیں اس کی ایک جھلک دیکھئے۔

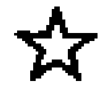
اعتبارِ نُطق ہے گفتارِ خیرالانبیاً
نو بہارِ خُلق ہے کردارِ خیرالانبیاً
مشعلِ راہِ ہدایت آپ کی شرعِ متیں
ہیں دو عالم کو محیط انوارِ خیرالانبیاً



اعزاز یہ سرکار کی سیرت کے لئے ہے
ہر دور میں انساں کی ہدایت کے لئے ہے
ہے پیشِ نظر اُسوۂ پیغمبر آخر
ساماں یہ بہم فکر کی رفعت کے لئے ہے



رنگِ فطرت آپ کے فیضان سے نکھرا حضورؐ
آپ کی آمد سے پہلے کب یہ نقشہ تھا حضورؐ
آپ کا دینِ حیات آموز جب پھیلا حضورؐ
مٹ گئی یکسر تمیز بندہ و آقا حضورؐ



اے سرورِ دیں نُور ہے یکسر تری سیرت
اقدار کو کرتی ہے منور تری سیرت
یا خیر کا معمورۂ پُر نُور و معنبر
یا حُسن کا معراج سمندر تری سیرت

حفیظ تائب اس حقیقت سے بدرجہ اتم آگاہ ہیں کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے جمالِ جہاں آرا نے بھی اذہان کو تسخیر کرنے میں کچھ کم کردار ادا نہیں کیا۔ کفار کی ایک بڑی تعداد آپ کے حُسن کی تابانیوں میں کھو کر آپ پر ایمان لے آئی کہ اتنا حسین و جمیل رُخِ اقدس کسی ساحر یا جھوٹے کا نہیں ہو سکتا بلکہ اس نبی ٔ محترم کا جمالِ بے مثال خود اس کے صادق القول ہونے کی نشانی ہے یہ چہرہ تو سینۂ شبِ تارِ الست سے پھوٹنے والے نُور کی جلوہ گری ہے۔ یہ رُخِ والضحیٰ تاریخ انسانیت کے سب سے سچے انسان کا چہرہ ہے۔ صبحِ فطرت اس چہرے پر تصدق ہو کر اپنا نُور مستعار لینی تھی۔ چاند سورج اسی کی چوکھٹ پر پابوسی کرتے ہوئے تابانیوں کے حقدار ٹھہرتے تھے۔ یہ محبوب خلائق ہی کا نہیں بلکہ محبوبِ خدا کا جمال ہے۔ خلاقِ دو عالم کی عظمت تخلیق کی جلوہ آرائی ہے۔ جب شاعر کا قلم حسن و جمال مصطفیٰ علیہ کی جلوہ افروزیوں میں کھونے لگتا ہے تو نکہت و نُور کی برسات کا سماں ہوتا ہے۔ لافانی کیف و سرور کی وادیاں مہکنے لگتی ہیں۔ محبوبیت مصطفیٰ کا تصور اپنے کمال سے ہمکنار ہونے لگتا ہے۔ انوار کی رم جھم کے برسنے اور شاعر کے قلزم نور میں غوطہ زن ہونے کا وقت آنے لگتا ہے۔ ان کیفیات سے حفیظ تائب اس شان سے گزرے کہ اپنے قلم کی معجز بیانی سے ایک

زمانے کو اپنے ہمراہ جادۂ شوق کا راہی بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ جمال حضور ﷺ کی طلعتوں میں گم ہو کر حفیظ تائب نے شریعت کے تقاضوں کو فراموش نہیں کیا۔ عشق و عقیدت کے وفور کا عالم ہو تو راہوار شوق کے ٹھوکر کھانے کا گماں ہوتا ہے مگر حفیظ تائب اس مرحلہ ذوق و شوق سے بھی سرخرو ہو کر گزرے۔ جمالِ محبوبِ خدا کو اپنے وجدان کا حصہ اس طرح بنایا کہ عصرِ حاضر کو اپنی ترجمانی کے لئے ان کی نعت گوئی کی صورت میں آئینہ خانہ میسر آ گیا جس پر جب بھی ایک نظر ڈالیں تو دل و جان بے اختیار پکار اُٹھیں کہ حفیظ تائب نے فقط اپنے لئے نہیں لکھا بلکہ ہم سب کی ترجمانی کر دی ہے۔ ایک جھلک دیکھئے۔

نشاطِ روح خیالِ محمد ﷺ عربی
بہارِ زیست جمالِ محمد ﷺ عربی
جنہیں بنا کے مصور بھی آپ ہے مسرور
وہ نقش ہیں خدوخالِ محمد ﷺ عربی

☆

مہرِ ہدیٰ ہے چہرۂ گلگوں حضور کا
اِک سروِ نُور ہے قدِ موزوں حضور کا
جس کے لئے شفاعتِ اُمت کا تاج ہے
لا ریب ہے وہ فرقِ ہمایوں حضور کا

☆

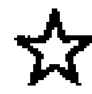
مرکز میرے فکر کا وہ مکی محبوب
فطرت کی رعنائیاں ہیں سب جس سے منسوب
جس کا راس المال ہے مولا کا عرفان
وہ طالب اللہ کا اور اس کا مطلوب

☆

چہرۂ زیست کا ضو حسنِ پیمبر کی جھلک
چشمِ ہستی کی دُعا بدرِ دجیٰ کے جلوے
والضحیٰ روئے منور ہے تو واللیل ہے زلف
ان کے فیضان سے ہیں صبح و مسا کے جلوے

حفیظ تائب نے نعتِ حضورﷺ کے گلرنگ راستے پر طویل سفر کیا ہے۔ اس سفر کا ایک ایک لمحہ لازوال اور ایک ایک ساعت جاوداں ہے۔ مدحت و نعتِ مصطفٰےصلی اللہ علیہ وسلم کے اس سفرِ یادگار میں وہ ایسی کیفیات سے دوچار ہوئے جن کا اجمالی جائزہ ہم اپنے مضمون میں لے چکے ہیں۔ نعت کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ تو ازل سے جاری و ساری ہے اور شامِ ابد کو بھی اس سفر کی سعادت سے بہرہ ور ہونے والے شادکاموں کا تذکرہ ہو رہا ہوگا۔ آہستہ آہستہ حفیظ تائب کا ذہن اور فکر وجدانی کیفیت سے دوچار ہو رہے ہیں۔ وجدانی کیفیت کہ جہاں عشرتِ قطرہ دریا میں فنا ہو جانے کا نام ہے۔ وجدانی کیفیت کہ جب شاعر شمعِ محفل کی طرح سے سب سے الگ ہو کر محبوبِ خداﷺ کے جلووں میں گم ہونے کا تمنائی بنتا ہے۔ اب یہ وہاں پر ہیں کہ جہاں اپنا وجود بھی نورانی ماحول میں تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حضرت احمد ندیم قاسمی نے بھی کچھ ایسے ہی تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ یوں تو حفیظ تائب کا تمام تر نعتیہ کلام وجد آفریں ہے مگر نعتیہ قصیدہ کہتے ہوئے ان پر جو وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے وہ اپنا جواب آپ ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے شاعر محبوب خُدا اور اپنے مرکز فکر کے حضور حاضر ہے اور ان کی مدح میں انہی کیفیات کا وفور ملاحظہ کیجئے۔

لب کھلے جب نبیؐ کی مدحت میں
پھول کھلنے لگے طبیعت میں
پائی ہر تلخیٔ الم سے نجات
کھو کے تذکارِ شہ کی لذت میں
آپ کی یاد نے سکوں بخشا
میں گھرا جب کسی مصیبت میں
آپ کا چہرہ ماہتاب بنا
میری ہر ایک شامِ عسرت میں



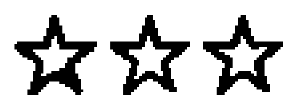
بارگاہِ پاک میں پہنچے صدا کرتے ہوئے
مدعا پایا ہے عرضِ مدعا کرتے ہوئے
تھام کر دامن کو ان کے بے محابا رو دیا
میں کہ گھبراتا تھا ان کا سامنا کرتے ہوئے



ہیں جس کی خاک میں آسودہ رحمتِ عالم
وہی دیار بنے میرا مستقر اے کاش
سفر عدم کا جو در پیش ہو مجھے تائب
دیارِ نُور کی خوشبو ہو ہم سفر اے کاش

یہ کہنا اعترافِ عظمت ہی نہیں بلکہ اعترافِ حقیقت بھی ہے کہ حفیظ تائب عہد آفریں نعت نگار ہے اور نعت گوئی کے فروغ و ارتقا میں اس کا ناقابلِ فراموش حصہ ہے۔ یہ وہ چراغِ ایوانِ مدحت حضور ﷺ ہے کہ جس کی فکر اور تڑپ اندازِ نعت گوئی کا حصہ بنتی ہے تو پھر ہر آنے والا دور حفیظ تائب کی خوش بختیوں کے ساتھ لازم و ملزوم ہونے لگتا ہے۔ ہم بھی حفیظ تائب کے ہم نوا ہو کر بارگاہ رسالت مآب میں اپنے داخلی اور خارجی کرب و الم کا ماجرا عرض کرتے ہوئے اس تحریر کو انجام پذیر کرنا چاہتے ہیں کہ

پُر کرے گا کون روحوں کے خلا، یا مصطفےٰ ﷺ
تیری چشمِ لطف و رحمت کے سوا، یا مصطفےٰ ﷺ
دہر میں پھر اہلِ دیں کو سرفرازی ہو نصیب
لوٹ آئے دور عدل و خیر کا، یا مصطفےٰ ﷺ



گلزارِ مدحت کی بہارِ لازوال

محمد اعظم چشتی

یہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ خوش بختی کا تاجِ ہمایونی کب کسی کے سر کی زینت بن جائے۔ شہرت اور ناموری کی آرزو تو بے شمار انسانوں کے دلوں میں مچلتی ہے مگر یہ عظمت اسی کا مقدر بنتی ہے جس پر خالق تقدیر مہربان ہو جائے۔ عصرِ حاضر کے نمائندہ شاعر اور صاحب اسلوب نعت گو اور نعت خواں محمد اعظم چشتی کا شمار ان سعید بخت افراد میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی حیات مستعار ہی میں غیر معمولی شہرت اور ہر دلعزیزی کو قدموں کی بلائیں لیتے دیکھا۔ آج انہیں اس دنیائے فانی سے کوچ کئے کتنے ہی برس بیت گئے مگر جب بھی افکار بوجھل ہونے لگتے ہیں تو ان کا یہ نعتیہ شعر یکبارگی قلب و جان کو روحانی فرحت اور ایمان کی تازگی عطا کر جاتا ہے۔ کہ

سمجھا نہیں ہنوز مرا عشقِ بے ثبات
تو کائناتِ حسن ہے یا حسنِ کائنات

محمد اعظم چشتی نعت خوانی کا ارمغان لے کر محافلِ نعت میں طلوع ہوئے۔ بے پناہ داد پائی۔ طبعِ موزوں نے اپنا رنگ دکھایا مقدر کا ستارا جگمگایا تو نعت گوئی ان کا مقدر بننے لگی۔ واقعی یہ بڑے ہی کرم کے فیصلے ہیں اور بلاشبہ نصیب کی سربلندی کی بات ہے کہ جب نعت لکھی تو زمانے بھر کو چونکا دیا۔ ایک تو پہلے ہی ان کی نعت خوانی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ عوام الناس اور اصحاب علم و اَدب یکساں طور پر آپ کی خداداد صلاحیتوں کے قائل تھے۔ آپ کی نعت گوئی سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی۔ آپ کا بے مثال لحن، کمال صوت، حسنِ ادا، مخصوص لے اور آواز کا اُتار چڑھاؤ۔ اللہ رے اتنی بلندی اور یہ عظمت پہلے کسی کا مقدر بنی اور نہ ہی ابھی تک کوئی ایسی شخصیت منصہٴ نعت پر جلوہ گر نظر آتی ہے جسے اعظم چشتی جیسا کہہ سکوں۔ اس انفرادیت کا کمال یہ ہے کہ آپ کی نعت خوانی تو آپ کو محبوب خلائق بنا گئی تھی۔ اُوپر سے نعت گوئی کی سعادت بھی اس شان سے عطا ہوئی کہ ایک طرف آواز پر مرنے والے اور دوسری طرف نعت کے مرتبہ شناس یکساں طور پر چونک پڑے۔ آج کا دور درحقیقت دورِ نعت ہے مگر ایسا کہاں سے لائیں جو نعت خوانی اور نعت گوئی کو اپنا

اعزاز بنا کر مدتوں اصحاب ایمان کے دلوں کی دھڑکن میں سمایا رہا ہو۔ اعظم چشتی اس فخر کا کس طور اظہار کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

کیوں نہ ہو صاحبِ ایمان محمد اعظم
ہے گدائے درِ حسان محمد اعظم
میری تربت کے سرہانے یہ لکھانا لکھ کر
تھا محمد ﷺ کا ثنا خوان محمد اعظم

محمد اعظم چشتی نعت گوئی کے لیے سیدنا حسانِ ثابتؓ کا قرینہ مانگتے ہیں۔ وہی سیدنا حسان جو شاعرِ دربارِ رسول تھے۔ جنہیں حضور ﷺ کی خوشنودی اس طرح نصیب ہوئی کہ منبر رسول پر کھڑے ہو کر نعت سناتے رہے۔ اعظم چشتی نعت کو عبادت بھی سمجھتے ہیں اور سعادت بھی۔ عبادت ان معنوں میں کہ توصیف مصطفےٰ ﷺ کا حکم رب دو عالم نے دیا ہے اور سعادت ان معنوں میں کہ یہ نعمت عظمٰی ہر کسی کا مقدر نہیں بنتی۔ انہیں ہر گام پر احساس ہوتا ہے کہ وہ جس کی نعت کہہ رہے ہیں۔ خدا خود اس کا ثنا خواں ہے۔

منم ادنیٰ ثنا خوانِ محمد ﷺ
غلامے از غلامانِ محمد ﷺ
نہ تنہا ہست اعظم نعت خوانش
خدائے ما ثنا خوانِ محمد ﷺ

جب اعظم چشتی دیکھتے ہیں کہ خدا خود ثنا خوانِ محمد ﷺ ہے اور جملہ ملائکہ ومخلوقاتِ عالم ثنا خوانِ حضور ہیں۔ ہر صاحب نظر کی تمنا ہے کہ اس کی نعت بارگاہِ رسول میں مقبول ہو جائے تو پھر انہیں اپنی ثنا خوانی پر ناز ہونے لگتا ہے کہ وہ بھی اس خوش بخت قافلے کے رکن ہیں۔ جس کے قائد اوّل سیدنا حسان بن ثابتؓ اور کعبؓ بن زہیر جیسے عظیم المرتبت نعت گو تھے۔ یہ احساس انہیں اپنی خوش بختی کا اظہار کرنے کا سلیقہ عطا کرنے لگتا ہے۔

دی زباں حق نے ثنائے مصطفےٰ کے واسطے
دل دیا حب حبیب کبریا کے واسطے
کتنا بڑا ہے مجھ پہ یہ احسانِ مصطفےٰ
کہتے ہیں لوگ مجھ کو ثنا خوانِ مصطفےٰ

نعت گوئی بعد کی بات سہی مگر ان کی نعت خوانی تو پانچ دہائیوں سے بھی زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔ پھر ان کے بارے میں زیادہ کیوں نہیں لکھا گیا؟ ان کے بارے میں تو بڑے بڑے اساتذۂ فن نے اظہار خیال کیا ہے۔ انہوں نے تمام ترفنی اور شعری بلندیوں کے باوجود ''حسانِ پاکستان'' کہلوانا پسند نہیں کیا۔ اس معاملے میں وہ بڑی حد تک حق بجانب تھے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ تو ایک ہی تھے۔ اگر ہر ملک خطہ اور پھر ہر شہر میں ایک حسان ہونے لگے تو نعت کے تقدس کا کیا بنے گا۔ یہاں تو سرکارِ عالمﷺ کی ثنا خوانی ہی سب سے بڑی دولت ہے اور حضرت حسانؓ کے کاروانِ نعت گوئی کا رکن کہلانا ہی بہت بڑا اعزاز ہے چہ جائیکہ کہ کوئی نعت خواں سیدنا حسانؓ ثابتؓ کی نسبت سے اپنے لیے کوئی خطہ مخصوص کر لے۔ ہم نے یہ عرض اس لیے کی ہے کہ ریکارڈ پر رہے کہ حضرت اعظم چشتی اس تہمت سے بری تھے جبکہ ان کے معاصرین کئی شعراء اس لقب کے حصول کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

ان کی شاعری کا مطالعہ فوراً اس حقیقت سے آشنا کرتا ہے کہ انہوں نے اپنے اکابرین نعت سے خوب خوب اکتساب فیض کیا ہے۔ امام نعت گویاں شاہ احمد رضا خاں کہتے ہیں۔

واہ کیا جود و کرم ہے شہِ بطحا تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

محمد اعظم چشتی کہتے ہیں۔

ایسا کوئی محبوب نہ ہو گا نہ کہیں ہے
بیٹھا ہے چٹائی پہ مگر عرش نشیں ہے
ملتا نہیں کیا کیا دوجہاں کو ترے در سے
اک لفظ نہیں ہے کہ ترے لب پہ نہیں ہے

اور پھر اسی نعت میں مقاماتِ رسولﷺ کی سربلندیاں ملاحظہ کیجئے۔

تو چاہے تو ہر شب ہو مثالِ شبِ اسریٰ
تیرے لیے دو چار قدم عرش بریں ہے
رُکتے ہیں ، یہیں آ کے قدم اہلِ نظر کے
اس کوچے سے آگے نہ زماں ہے نہ زمیں ہے

نعت گوئی میں سوز وگداز کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ جس طرح پروانہ شمع پر نثار ہونے کو

معراجِ حیات سمجھتا ہے۔اسی طرح عاشق رسول بھی اپنے آقا و مولا ﷺ کی محبت میں پروانہ وار جلنے کو بے قرار رہتا ہے۔وہ غیر معمولی اضطراب اور بے قراری و بے چینی سے دوچار ہوتا ہے۔اس کی فکر سلطانِ دو عالم ﷺ کے جلوؤں میں گم رہتی ہے اور اس کے قلم کی نوک سے ایسے اشعار ٹپکتے ہیں۔ جو ہر قلبِ مضطر کی نوا بن جاتے ہیں۔محمد اعظم چشتی نے بھی اسی سوز و گداز اور والہانہ پن کو ہر آن محسوس کیا ہے۔ان کے تخیلات بھی یادِ حضور سے آباد رہتے ہیں۔خود بھی تڑپتے ہیں اور اپنی یادگار نعتیہ شاعری کی بدولت ایک زمانے کو تڑپانے کا فکری سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔

پیار ان کا اگر حاصل ایماں نہ بنے گا
مومن تو بڑی بات ہے انساں نہ بنے گا

....

تشنگی روحِ دو عالم کی بجھانے والا
جوئے رحمت بھی ہے اور ابرِ گہر بار بھی ہے
اعظم اس پیکرِ رحمت سے ہے نسبت مجھ کو
درد مندوں کا جو مونس بھی ہے غمخوار بھی ہے

....

کس کی تجلیات سے خیرہ ہے چشم آفتاب
کھوئی گئی ہے کائنات کس کے تصورات میں
مٹ گئے اک نگاہ سے تیری جہاں کے وسوسے
ڈوبا ہوا ہے فلسفی اب بھی توہمات میں

یہ حقیقت پوری کائنات پر اظہر من الشمس ہے کہ حضور اس کائنات میں رب کریم کا سب سے بڑا احسان بن کر تشریف لائے۔آپ کی آمد سے قبل عالمِ انسانیت ظلم و تشدد اور وحشت و بربریت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔دور دور تک انسانی اقدار کی معمولی سی روشنی بھی نظر نہیں آتی تھی مگر حضور ﷺ کی بعثتِ قدسی سے گلستان انسانیت پر بہار آ گئی اور راہِ انسانیت سے بھٹکے ہوئے انسان دامانِ محمد ﷺ سے وابستہ ہو کر خود آگاہی اور خداشناسی کے آداب سکھانے لگے۔ اس لیے وہ احساناتِ مصطفیٰ ﷺ کا تذکرہ کرتے نہیں تھکتے وہ عالم انسانیت کو یہ حقیقت بھی باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہم فقط اُسوۂ حضور ﷺ پر عمل پیرا ہو کر اور آپ کی غیر مشروط اطاعت کر کے ہی

کونین میں مکمل سرخروئی کا تصور کر سکتے ہیں۔ محمد اعظم چشتی بعثتِ مصطفیٰ ﷺ سے قبل کا نقشہ بیان کرتے ہیں۔

تمہارے آنے سے پہلے کیا تھی ہمارے صبح و مسا کی صورت
نہ کوئی مونس نہ کوئی ساتھی پڑے تھے ہم نقشِ پا کی صورت
ہزارہا سال اہلِ دل نے ستم اُٹھائے ستم گروں کے
نہ کوئی آیا بہ جز محمد ﷺ جہاں میں مشکل کشا کی صورت

....

بگڑے ہوؤں کو کس نے سنوارا ترے بغیر
ڈوبے ہوؤں کو کس نے اُبھارا ترے بغیر
انسانیت کا درس ملا تیری ذات سے
بے نور تھا خرد کا ستارا ترے بغیر

اور حضور ﷺ کے احسانات کا تذکرہ کرتے کرتے ''تحدیثِ نعت'' کے نام پر حضور ﷺ سے محبت اور کامل اطاعت کا پیغام دیتے ہیں تا کہ عصرِ حاضر کا مسلمان پھر سے عشق سرورِ کونین ﷺ کے جادۂ رحمت کا راہی بن جائے۔

سچ ہے عمل ہی قبر کا سرمایہ ہے مگر
افضل ہے ہر عمل سے محبت رسول کی
ظاہر ہے صاف صاف اطیعُو الرسول سے
محبوب ہے خدا کو اطاعت رسول کی

اور پھر اسی کیفیت میں اعظم چشتی بارگاہِ رسالتمآب میں استغاثہ پیش کرتے ہیں۔ اپنے رنج و آلام کا فسانہ نبی محترم ﷺ کی نذر کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہمارے آنسو بارگاہ حضور میں قبول ہو گئے تو جواہر بے بہا بن جائیں گے۔ اگر ہماری فریاد کی پُر اثر لے پر حامیء بے کساں کو پیار آ گیا تو ہمارا بگڑا ہوا مقدر سنور جائے گا۔ اس ضمن میں وہ ذاتی رنج و آلام کا ماجرا بھی سناتے ہیں اور اُمت اسلام کے اجتماعی آلام بھی گنبدِ خضرا کے مکین کی نذر کرتے ہیں۔ وہ بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ بات فقط حضور ﷺ کی چشم کرم کی ہے۔ اک بار آپ کی چشم کرم بار کا اشارا ہو گیا تو اُمتِ اسلام کی زوال پذیری عروج و اقبال میں بدل جائے گی۔ ان کی کیفیت ملاحظہ کیجئے۔

ہم ہیں بے یارو مددگار رسول عربی
جز ترے کون ہو غم خوار رسول عربی

تلملاتے ہیں، تڑپتے ہیں شب و روز غریب
جن کو ہے تجھ سے ذرا پیار رسول عربی
کرم یا رحمتہ للعالمیں یا شافعِ محشر
کہ ہے خالی عمل سے میرا داماں یا رسول اللہ
دکھاتا پھر رہا ہوں کب سے ان سینے کے داغوں کو
سلے گا کب مرا چاک گریباں یا رسول اللہ

معروف دانشور کوثر نیازی محمد اعظم چشتی کے فنِ نعت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔
''ایسی ہستیاں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں جنہیں شاید قدرت روزِ ازل ہی سے اس سعادت کے لیے نامزد کر رکھا تھا اور میں پورے وثوق اور شرحِ صدر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اعظم چشتی کا نام بھی انہی خوش نصیبوں میں شامل ہے۔ اعظم چشتی کی نعتوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں عشق بھی نظر آئے گا اور علم بھی، جذبے کی گیرائی بھی ہوگی اور فن کی گہرائی بھی۔ وہ اپنی نعتوں میں بے تکلف قرآنی آیات دینی اصطلاحات اور تصوف کے اشارات و کنایات استعمال کر جاتا ہے اور اس کے باوجود شعریت کی روح برقرار رہتی ہے۔ وہ نعت کے لیے غزل کا پیرایہ استعمال کرتا ہے مگر شریعت کا مزاج برہم نہیں ہوتا۔'' نیر اعظم کے دیباچے سے ایک اقتباس''

حضور ﷺ نور ہیں۔ بلکہ نور علیٰ نور ہیں۔ احادیث شاہد ہیں کہ خدائے کائنات نے سب سے پہلے آپ کا نور تخلیق کیا اور پھر اسی نور سے تمام کائنات بنائی۔ نعت گو شعراء نے اپنی نعتوں میں آقا و مولا ﷺ کے نورانی جلوؤں اور آپ کی بے مثال نورانیت کو بطورِ خاص اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ اس ضمن میں محمد اعظم چشتی کا والہانہ پن بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ زیادہ مثالیں کیا دوں۔ ان کی ایک ہی نعت کے چند اشعار دیکھئے اور انوارِ مصطفیٰ ﷺ کی جلوہ گری کا نظارا کیجئے۔

گزرا وہ جدھر سے ہوئی وہ راہ گزر نور
اس نورِ مجسم کی ہے ہر شام و سحر نور
لب نور دہن نور، زباں نور بیاں نور
دل نور جگر نور جبیں نور نظر نور
نسبت ہوئی جس کو تری خاکِ کفِ پا سے
وہ شہر وہ کوچہ وہ در و بام وہ گھر نور
جس صبح اُتارا گیا وہ چاند زمیں پر
وہ ماہ وہ دن نور وہ ساعت وہ شجر نور

محمد اعظم چشتی نے اپنی نعتیہ شاعری میں فکر و فن کی وہ بلندیاں دکھائی ہیں کہ پڑھنے والا

حیرت میں گم ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ اتنی بلندی فکر اور رعنائی خیال کو چھوتے نظر آتے ہیں کہ ان کے کلام پر علامہ اقبال اور ظفر علی خاں کی قادر الکلامی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اعظم چشتی محض تقاریب کے نعت خواں نہ تھے۔ وہ پختہ فکر شاعر علمی تدریسی دینی اور روحانی بلندیوں سے بہرہ ور تھے۔ فارسی اُردو اور پنجابی زبانوں پر یکساں گرفت رکھتے تھے۔ بعض اوقات یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ وہ کس زبان میں زیادہ مہارتِ فکر اور ندرتِ بیان کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ایک زمانہ نعت گوئی کے حوالے سے ان کا ہم نوا رہا ہے۔ ہم چند ایسے اشعار پیش کر رہے ہیں جن میں ان کی بلند خیالی اپنی معراج کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے مگر کیا مجال کہ کہیں شریعت اَدب یا احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے پائے۔

حسنِ حبیبِ دو جہاں یوں ہے تصورات میں
جیسے ظہورِ ماہتاب غم کی اندھیری رات میں
کس کی تجلیات سے خیرہ ہے چشمِ آفتاب
کھوئی گئی ہے کائنات کس کے تصورات میں

....

سمجھا نہیں ہنوز مرا عشقِ بے ثبات
تو کائناتِ حسن ہے یا حسنِ کائنات
اب تک سجی ہوئی ہے ستاروں کی انجمن
اس انتظار میں کہ پھر آئیں وہ ایک رات
اک خالقِ جہاں ہے تو اک مالکِ جہاں
خالق کے بعد کیوں نہ مکرم ہو تیری ذات
جو ذکر زندگی کے فسانے کی جان ہے
وہ تیرا ذکر پاک ہے اے زینتِ حیات

....

کتنی گستاخ ہے نگاہِ خیال
ڈھونڈنے جا رہی ہے ان کی مثال
دیکھئے میری عجزِ طبع کا حال
ان کے ابرو کو کہہ رہا ہوں ہلال
جو بھی ذرہ اُڑا ستارہ بنا
اللہ اللہ گردِ رہ کا جلال

معراج رسول علیہ السلام وہ عظیم ترین معجزہ ہے جس سے حضور علیہ السلام کی بارگاہ خداوندی میں غیر معمولی مقبولیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان اور ہر دور کے نعت گو شعراء نے معراج حضور پر نظم اور نثر میں بہت کچھ لکھا ہے اور یہ سلسلہ تا ابد جاری رہے گا۔ ہر شاعر معراجِ مصطفےٰ علیہ السلام کی بلندیوں کو اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ محمد اعظم چشتی کو رب کونین نے عشق وعقیدت سے بھرپور دل عطا کیا یہی وجہ ہے کہ آپ معراجِ رسول کا ذکر کرتے ہیں تو آپ اپنی فکری نظری اور شعری سرفرازیاں بارگاہ رسول علیہ السلام کی نذر کردیتے ہیں۔

دیکھئے جذبِ محبت کا اثر آج کی رات
اپنے محبوب کو بلوا لیا گھر آج کی رات
آئی آوازِ خدا اور قریب آ جاؤ
منتظر ہے کوئی آغوشِ نظر آج کی رات
کوئی سمجھے بھی تو کیا کوئی نہ سمجھے بھی تو کیا
اللہ اللہ یہ توقیر بشر آج کی رات

ایک اور مقام پر آپ معراجِ رسول علیہ السلام کے مضمون سدا بہار کو یوں ادا کرتے ہیں۔

عرش اعظم پہ گئے شاہِ زمن آج کی رات
قابلِ دید ہے فطرت کی پھبن آج کی رات
لے کے جبریلِ امیں حسن کا پیغام آئے
دیکھ کر عشق کا بے ساختہ پن آج کی رات
یہ بھی ہے صاحب معراج کی مدحت کا صلہ
مجھ کو حاصل ہوئی معراجِ سخن آج کی رات

محمد اعظم چشتی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ حضور علیہ السلام کی ذاتِ بابرکات کائنات بھر کے عشق وعقیدت کا محور ہے۔ جملہ انبیائے کرام کے محاسن اپنی جگہ مگر آپ کے محاسن قدسی کو دیکھ کر روح ارضی بے اختیار اس حقیقت کا ادراک کرتی ہے کہ فقط اور فقط آپ ہی محبوبِ دو عالم اور ممدوح آدم و بنی آدم ہیں۔ محمد اعظم چشتی جیسے عظیم المرتبت نعت خواں اور نعت گو نے اپنی حیات مستعار اور فکر وفن کا تمام تر سرمایہ بارگاہ رسالتمآب کی نذر کردیا کہ اگر بارگاہِ رسول علیہ السلام میں قبولیت ہوگئی تو پھر ان کی نعت گوئی صدیوں تک اہل ایمان کے دل وجان کو معنبر کرتی رہے گی اور محمد اعظم کی یہ خواہش پوری ہو کر رہی، آج آپ کو اس دارِ فانی سے کوچ کیے ہوئے کتنے ہی برس بیت چکے ہیں مگر آپ کی آواز کا ترنم فضاؤں میں رس گھولتا ہوا اب بھی قلوب ہستی کو عشق حضور علیہ السلام کے آداب سکھا رہا ہے۔ آپ کا سخن خداداد آپ کی آواز کا حسن، شعری کمالات ومحاسن اَدبی وفکری

اوصاف اہل مشرق کو مدتوں آپ کے وجود کا احساس دلاتے رہیں گے۔

محمد اعظم محض مجالس کی زینت بننے والے وصافِ رسول ﷺ ہی نہیں بلکہ انہوں نے جو کچھ لکھا دل کی گہرائیوں سے لکھا اور حضور ﷺ کے محاسن قدسی اس شان سے بیان کیے کہ بے اختیار قلم چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ان کی ایک طویل نعت سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

شاہِ گردوں مقام عرش خرام
مظہرِ ذوالجلال والاکرام
مخزنِ علم و پیکرِ حکمت
ہیں فصوصِ حکم حروف کلام
کنت کنزاً کی وادیوں کا نور
آسمانِ قدم کا ماہِ تمام
وَرَفعنا کی رفعتوں کا امیں
اَبوالارواح کا بھی پیش امام
راز دارِ دنیٰ و اَوادَنیٰ
کتنا اَرفع ہے عبدہٗ کا مقام
سینہ آئینہ اَلم نشرح
دل خدا کی امانتوں کا مقام
خاکِ نعلینِ پاک وہ جس سے
عرش کے بھی چمک اُٹھیں در و بام
خاکِ بطحا بھی کیا عجب شے ہے
جس کو حاصل ہے ان کا قربِ دوام

جیسا کہ ہم نے آغاز میں بھی عرض کیا تھا کہ ان کے نعتیہ کلام میں اساتذہ فن کی جھلک ملتی ہے اور یہ اسی طور ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اساتذہ کے کلام کو خوب خوب پڑھ رکھا ہو اور نعت و مدحت کے حقیقی ماخذان کے ہمیشہ پیش نظر رہے ہوں اور واقعی ایسا ہی تھا۔ امام احمد رضا خاں فرماتے ہیں۔

نعمتیں بانٹتا جس سمت وہ ذیشان گیا
ساتھ ہی منشیء رحمت کا قلمدان گیا

محمد اعظم چشتی کے ہاں یہی تخیل ملاحظہ فرمایئے۔

اس خالقِ کونین کی مرضی بھی اُدھر ہے
اے سید ابرار رضا تیری جدھر ہے

اور پھر شاہ احمد رضا خاں کا پاسِ شریعت دیکھیے۔

بسکہ رضا نے ختمِ سخن اس پہ کر دیا
خالق کا بندہ خلق کا مولی کہوں تجھے

محمد اعظم چشتی بھی اس کمال احتیاط اور ادب شریعت سے کام لیتے ہیں۔

عقل کہتی ہے مثلنا کہیے
عشق بے تاب ہے خدا کہیے
نہ خدا کہیے نہ جدا کہیے
عبدہٗ کہیے حق نما کہیے

اور یہاں بھی اعظم چشتی اپنے جذبات شوق کا اظہار کر جاتے ہیں۔

جس کو اعظم حضور آپ سنیں
ایسی مدحت کو مرحبا کہیے

محمد اعظم چشتی کو رب کونین نے سوز و گداز کی دولت وافر انداز سے عطا کی ہے۔ یہ تڑپ، یہ کسک، یہ لچک، یہ شوقِ آرزو، یہ ذوقِ جستجو، یہ عشق کی بیتابیاں، یہ جذبات کی فداکاریاں، یہ لفظوں کا بانکپن، یہ زمانے سے جدا طرز سخن، یہ فکر کی بلند پروازی، بارگاہ رسول ﷺ میں حاضری کے لیے آہ وزاری، یہ پلکوں پہ آنسوؤں کا لرزنا، یہ جذبوں کا مچلنا، یہ جذبات بے کرانہ، احساسات والہانہ، احساس کی فراوانی، آنکھوں سے خراجِ عقیدت بن کر اُمڈتے ہوئے اشکوں کی طغیانی، یہ تمام صفات ان کی شاعرانہ تگ و تاز کا اعزاز ہیں اور یہی صفات ان کی نعت گوئی کو معاصرین سے ممتاز کر کے اساتذۂ فن کی مجلس میں لا کھڑا کرتی ہیں۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا، فقط بارگاہ رسول ﷺ میں مقبولیت اور پذیرائی کا سودا، ہم انہی کے ان نعتیہ اشعار پر اس مضمون کو ختم کر رہے ہیں۔

جذبۂ حسرتِ دیدار جو تڑپاتا ہے
اپنی کوتاہ نگاہی کا خیال آتا ہے
کوئی روتا ہے تو بھر آتی ہیں آنکھیں میری
میں سمجھتا ہوں مدینہ اِسے تڑپاتا ہے
نعت کا رنگ جو بدلا تو میں سمجھا اعظم
پہلے میں کہتا تھا اب کوئی کہلواتا ہے

......☆......☆......☆......

عارف عبدالمتین

نعت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حوالے سے شاعر بے مثال

پروفیسر عارف عبدالمتین ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ خوبصورت نثر نگار۔ ممتاز شاعر۔ منفرد نقاد۔ قابلِ قدر دیباچہ نگار۔ مخلص انسان۔ سب سے محبت کرنے والے اور اپنی لاجواب محبت کے جواب میں سب سے محبت کا ارمغان وصول کرنے والے۔ انہوں نے بہت سی اصناف شعروسخن پر طبع آزمائی کی اور ان کے قلم کے طویل سفر کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے خوب لکھا ہے اور بہت لکھا ہے۔ شعروسخن کے میدان میں ان کے راہوارِ قلم کی جولانیاں زوروں پر ہیں۔ غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نعت بھی لکھی اور اس میں بھی خوب نام پیدا کیا۔ ''بے مثال'' سے لے کر ''امبر تیری تھاں،، تک ان کی نعت گوئی کا ایک طویل سلسلہ ماضی کی وسعتوں سے لے کر عہدِ حال کی شعری رفعتوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اردو اور پنجابی زبان میں یکساں روانی اور وفورِ عقیدت کے ساتھ نعت لکھی اور یہ ثابت کر دیا کہ نعت کے زمزمے کسی زبان یا مخصوص ادبی لہجے کے پابند نہیں بلکہ یہ وہ نغمہ کلاہوتی ہے کہ جو ہر عہد اور ہر زبان سے عقیدتوں کا خراج لیتا ہوا حاصل زمانہ ٹھہرتا ہے۔

عارف عبدالمتین کی نعت گوئی میں ایک انفرادیت ہے۔ یہ انفرادیت ان کے اسلوب اور لہجے کی ہے۔ ان کی نعتوں پر پہلی نظر میں غزل کا گمان گزرتا ہے مگر جب قاری نعت کے مطلع سے گزر کر آگے بڑھتا ہے تو اسے بے اختیار احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ تو عارف عبدالمتین کا مخصوص اندازِ نعت ہے، وہ اندازِ نعت جو عجز کے آداب سکھاتا، قلبی واردات کو حضورﷺ کی بارگاہِ عالم پناہ میں پیش کرنے کا حوصلہ عطا کرتا اور ذرہ ناچیز کو کائنات کی سب سے محترم ہستی کے حضور ماجرائے غم نذر کرنے کی توفیق عطا کرتا ہے۔ اس طور یوں کہنا بے جانہ ہوگا کہ عارف عبدالمتین کی نعتوں میں حضورﷺ سے محبت کا جو والہانہ پن پایا جاتا ہے اس میں وہ حضورﷺ سے ان کی عقیدت کو اپنائیت میں بدل دیتا ہے۔ انہیں حضور کی شخصیت کے کمالات و محاسن میں اپنی بے مائیگی اور درد و غم کا درمان نظر آتا ہے یہی وہ مقام ہے جب وہ عشق و عقیدت کی بلندیوں کو چھوتے

ہوئے اپنے آقا و مولا ﷺ سے صرف اپنے وجود کے حوالے سے ہم کلام ہوتے نظر آتے ہیں ۔اسی مقام پر انہیں نبی مکرم ﷺ کی انتہائی سربلندی کے حضور پیش کرنے کیلئے سرمایۂ عجز کے علاوہ کوئی ارمغان نہیں سوجھتا۔ یہیں پر قطرے کے سمندر میں فنا ہو جانے پر عشرتِ قطرہ کا گمان گزرتا ہے۔

عارف عبدالمتین کی نعت گوئی کا ایک اجمالی جائزہ لیتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ نعت کے بہانے اپنے آقا و مولا ﷺ سے باتیں کر رہے ہوں۔ اس سلسلہ میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے تو، تیرا اور تجھ وغیرہ کا سہارا لیا ہے۔ اسے ہم سوئے ادب نہیں کہہ سکتے کیونکہ سوئے ادب تو اس طور ممکن ہے کہ یہ تنقیصِ رسالت کا ارتکاب کر بیٹھیں۔ ان کی نعتوں کے مطالعہ سے کسی صورت بھی گستاخی یا بے ادبی کا احتمال نہیں گزرتا بلکہ یہ جذبہ تو غیر معمولی والہانہ پن اور خود سپردگی کا مظہر بن جاتا ہے اور یوں نظر آنے لگتا ہے کہ عارف عبدالمتین اپنے اور اپنے آقا کے درمیان کسی اور کو حائل دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ اس طرح تو اور تیرا کی تکرار طبیعت پر گراں نہیں گزرتی بلکہ عارف عبدالمتین اس حُسنِ تکرار کی بدولت خود سپردگی کی منزل سے ہمکنار ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ ایسی خود سپردگی ہے جس میں شاعر کے ذہن میں محبتِ رسول ﷺ کے قلزمِ نُور میں غوطہ زن ہونے اور حضور کی سیرت کو اپنانے کی خواہش شدت سے پائی جاتی ہے۔

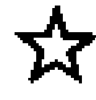
دید کا ڈھب ترے اندازِ نظر سے مانگوں
آگہی دہر کی میں تیری خبر سے مانگوں
بے بسی دیکھ کے مفلس کی پگھلتا جاؤں
درد مندی میں ترے دیدۂ تر سے مانگوں



یہ ماہتاب ترا آفتاب تیرا ہے
کتابِ زیست کا ہر ایک باب تیرا ہے
تری حدیث ہر ایک دل میں جا اترتی ہے
ہر اک خطاب سے دلکش خطاب تیرا ہے



تیرے اک ہاتھ میں مصحف تھی تو اک ہاتھ میں تیغ
مرا وجدان بھی مانگے ہے شجاعت تیری
تیری معراج میں ہے رمزِ عروجِ انساں
آدمیت کی نہایت ہے شریعت تیری

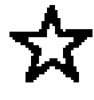


اپنی سیرت سے عطا کر مجھے حق کی قوت
سرنگوں جس سے ہو باطل وہ توانائی دے
تُو کہ رعنائی کردار کی معراج پہ ہے
مجھ کو بھی تھوڑی سی کردار کی رعنائی دے

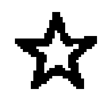
عارف عبدالمتین اس حقیقت سے بہرہ ور ہیں کہ جب خود سپردگی کی تمنا کی جاتی ہے تو پھر اس راہ تمنا پر چلنے کے لئے محبوب کی ایک ایک ادا کو سرمایۂ عمل بنانا پڑتا ہے اس راستے پر چلتے ہوئے محبوب کی اداؤں کے چمنستان کی مہکباریوں میں کھو جانا پڑتا ہے اور یہ والہانہ پن اس وقت تک ممکن نہیں جب تک محبوب کے نقوش قدم کی جلوہ کاریوں میں اپنی منزلِ حقیقی کا سراغ تلاش نہ کیا جائے اور جب شاعر کا محبوب وہ ذاتِ والا صفات ہو جو محبوبیت اور مرجعیت کی تمام تر رعنائیوں سے بہرہ یاب ہو۔ وہ محبوب جو محبوبِ خدا بھی ہے اور محبوب خلائق بھی اور حسنِ عقیدت کی جلوہ گری یہ ہے کہ خدا اور مخلوق خدا دونوں ذوق وشوق سے اس محبوب کی توصیف و مدحت میں مصروف ہیں۔ عارف عبدالمتین پر یہ حقیقت آشکارا ہے کہ محبوب خدا کی محبوبیت کو اس وقت تک حاصلِ حیات نہیں بنایا جا سکتا جب تک اس کی سیرت سے خوشہ چینی نہ کی جائے۔ سیرتِ حضور ﷺ سے خوشہ چینی کا عمل عارف کی نعتیہ شاعری میں دوسروں سے منفرد نظر آتا ہے اس میں رسمی تمنائیں نہیں بلکہ قلب وجگر کی خلوتوں سے ابھرنے والی دعائیں ہیں۔ یہ خود کو حضور نبی کریم ﷺ کے اتنا قریب محسوس کرتے ہیں کہ خود کو ان کی لازوال سیرت کی مہکباریوں میں رچ بس جانے کا احساس بخشنے لگتے ہیں۔ اس موقع پر بھی عارف کی یہی تمنا ہے کہ جہاں یہ ہیں وہاں دوسرا اور کوئی نہ ہو۔ سیرتِ حضور کو اپنانے کے حوالے سے عارف عبدالمتین کے اندازِ طلب کا ایک حسین انداز ملاحظہ کیجئے۔

آ میرے رگ و پے میں لہو بن کے رواں ہو
تجھ بن یہ بدن قریۂ بے آب نظر آئے

گہنائے نہ سورج تری رحمت کا ابد تک
تا حشر ترے پیار کا مہتاب نہ گہنائے
جو عہد بھی آئے تری سیرت پہ ہو نازاں
جو دور بھی آئے ترے کردار پہ اترائے



دے آنکھ کہ دیکھوں ترے اوصاف حمیدہ
دے فہم کہ سمجھوں ترا پاکیزہ جریدہ
بوذرؓ کے حوالے سے غنا تُو نے عطا کی
ہم نے درِ زر پر نہ کیا سر کو خمیدہ



مری نگاہ کا مرکز ہے بانکپن تیرا
کبھی عمل ترا دیکھوں کبھی سخن تیرا
گزر رہے ہیں شب و روز اس تمنا میں
مرے چلن میں جھلکنے لگے چلن تیرا
یہ آرزو ہے کہ لاہور سے مدینے تک
میں اپنے خون سے سینچوں چمن چمن تیرا

حضور سلطانِ دو عالم ﷺ سے محبت و عقیدت کا رشتہ استوار کرنا ہر صاحب ایمان کا بہترین اثاثۂ حیات ہے۔ اس رشتۂ عقیدت کی استواری اس کی تمنا بھی ہے اور حاصل تمنا بھی، دعا بھی ہے اور حاصل دعا بھی۔ کیونکہ دامانِ رسالتمآب ﷺ سے وابستگی اتنا بڑا اعزاز ہے کہ اس کے بعد کسی اور اعزاز کی تمنا نہیں رہتی۔ اسی کو فنافی الرسول کی منزل بھی کہتے ہیں۔ عارف عبدالمتین کے لئے یہ رشتہ ارادت حُسنِ شاعری کے ساتھ ساتھ کمالِ ایمان بھی ہے لیکن یہ بلند بخت شاعر جب عشق و عقیدت کے راہوار کے سہارے آگے بڑھتا ہوا گنبدِ خضریٰ کی نورانی طلعتوں کا تمنائی بنتا ہے تو اسے جہاں اپنی سعید بختی پہ ناز آتا ہے وہاں یہ شوکتِ حضور ﷺ کا تصور کر کے آبدیدہ ہو جاتا ہے کہ وہ کہاں اور میں کہاں؟ وہ سراپا کمال اور میں خستہ و پریشاں حال وہ رحمۃ للعالمین اور میں ملول واندوہ گیں۔ وہ دو عالم کا افتخار اور میں سراسر معصیت شعار۔ اسی فکری سفر میں جب عارف

عبدالمتین کی روح سرکارِ دو عالمﷺ کی علوِ مرتبتی اور بلندئ درجات کا تصور کر کے اپنی پستی کے احساس سے بوجھل ہونے لگتی ہے تو پھر معاً اس حقیقت کا ادراک ان کے لئے وجہِ نشاط بن جاتا ہے کہ محبوبِ دو عالمﷺ کی رحمت کا عرفان ہی تو مرے لئے وجہِ نجات ہے۔ میں لاکھ عصیاں شعار اور خطا کار سہی مگر جس سے نسبت رکھتا ہوں اس کا ادنیٰ سا اشارۂ رحمت ایک زمانے کی نجات و سرخروئی کے لئے کافی ہے۔ پھر یہی احساس عارف عبدالمتین کے لئے وجہِ نشاط بن جاتا ہے ،قلب و جان پر روحانی کیفیتِ سرور کا وفور ہونے لگتا ہے اور پھر عارف کا قلم بے اختیار نسبتِ حضورﷺ کے تصور سے مچل مچل جاتا ہے۔

تُو روشن آفتاب میں تیرا سحاب ہوں
کر مجھ کو منکشف کہ سراپا حجاب ہوں
کتنے کڑے سوال اٹھاتا ہے یہ جہاں
تو مائل کرم ہو تو سب کا جواب ہوں
شاداب اپنے لُطف کی رم جھم سے کر مجھے
صحرائے زندگی میں سلگتا سراب ہوں

اور پھر اسی حسنِ تاثر کی جلوہ کاری کا ایک اور رنگ ملاحظہ کیجئے۔

برس رہی ہے دل و جاں پہ روشنی کی پھوار
کہ کہہ رہا ہوں میں قرآں کے ترجماں کی حدیث
اگرچہ اس کے تھے سب روپ رہنمائی کے
لگی حدیث تری مجھ کو دوستاں کی حدیث



نجانے کس گھڑی تیرا کرم تجھ کو ادھر لائے
کھلا رکھتا ہوں میں ہر وقت اپنے دل کا دروازہ
ترے شایانِ شاں کب نعت میری ہے مگر سچ ہے
ثنا تیری ہے میرے چہرۂ اظہار کا غازہ

عارف عبدالمتین کی نعت گوئی میں جدیدیت پوری شدت سے کارفرما ہے یہ جدیدیت جب جدتِ فکر و فن کا روپ اختیار کرتی ہے تو قلم کو مسیحائی اور دعاؤں کو پذیرائی کا اعزاز عطا کر دیتی

ہے۔ جدیدیت کوئی تہمت نہیں صبحِ نو کے ماتھے پر سیاہ دھبہ نہیں بلکہ یہ تو عصرِ حاضر کے جدید ترین اسلوبِ اظہار اور اندازِ ابلاغ کو اپنا کر اپنے مدعا کو بیان کرنے کا دوسرا نام ہے ہاں جب یہی جدیدیت مقاماتِ مصطفوی ﷺ اور جمال محبوبانِ مجازی کے درمیان امتیاز نہیں کر پاتی تو نعت کے بجائے فن برائے فن کے نام پر تہمت بن کر رہ جاتی ہے۔ عارف عبدالمتین نے عصرِ حاضر کی جدیدیت کو فکر و فن کی جدتوں کے تناظر میں لیا ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس طور وہ بہتر طریق سے ثنائے حضور کو دورِ حاضر کی ادبی، نظریاتی سربلندیوں کا ارمغان پیش کر سکتے ہیں۔ یار لوگوں نے جدیدت کے نام پر ادبی تجربات اس طور سے کئے ہیں کہ بعض اوقات یوں گماں ہونے لگتا ہے کہ

مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

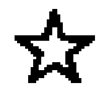
مگر جب یہی جدیدیت جدتِ فکر و فن کے حُسن سے آراستہ ہو کر عارف عبدالمتین کے لئے نعت گوئی کا وسیلہ بنتی ہے تو اور ہی کیف آفریں سماں دیکھنے کو ملتا ہے۔ حسین تشبیہات، دلکش استعارات، عصرِ نو کی ادبی روایات کی امین برجستہ تراکیب، زبان و بیان کی سحر طرازی، الفاظ کے حسن انتخاب کی جلوہ کاری، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہاں آ کر جدیدیت نے اپنے لئے جو خلعت پسند کی ہے وہ ہر لحاظ سے مرصع اور جاذب فکر و نظر ہے۔ اس ضمن میں انتخاب ڈھونڈنے لگیں تو بے شمار خوبصورت نعتیہ اشعار بے اختیار قاری کے ذہن اور قوتِ انتخاب کو اپنی گرفت میں لینے لگتے ہیں ملاحظہ کیجئے۔

میں آفتاب کہوں تجھ کو کہ ماہتاب کہوں
کتابِ شام و سحر کا ہر ایک باب کہوں
سراغِ سنگ بھی ملتا ہے تجھ سے صورتِ گل
تو ایک ایسی حقیقت ہے جس کو خواب کہوں



آ کبھی آئینے کی مانند میرے رُوبرو
آرزو ہے فیض سے تیرے بنوں میں خود نگر
تجھ کو اسرارِ جہاں میں آشنا پاتا ہوں میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں تجھ کو دے مجھے مری خبر

میں مکاں کی قید میں ہوں لامکاں ہے تجھ میں گم
اس تفاوت کو مٹا دے روح کو آسودہ کر



میں پھول ہوں تو مرے واسطے صبا تو ہے
نفس کہیں جسے وہ موجۂ ہوا تو ہے
ازل بھی حُسن ترا ہے ابد بھی رُوپ ترا
جمال بن کے زمانے سے آشنا تُو ہے

محبوب دو عالم ﷺ سے غیر معمولی فکری وابستگی کے سبب عارف عبدالمتین اپنے آقا و مولا ﷺ کو اپنی ذات پر وارد ہونے والے رنج والم کا فسانہ سناتے ہیں۔ عارف کے کہنے کا انداز دوسروں سے جداگانہ ہے بعض اوقات وہ حضور نبی کریم ﷺ کو اپنی ذات سے اس قدر قریب جانتے ہیں کہ فسانۂ الم سناتے ہوئے سرگوشیاں کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی داستانِ آلام کو زمانے بھر سے چھپا کر اپنے آقا و مولا ﷺ کو سنا رہے ہیں لیکن کبھی کبھی ان کا لہجہ بلند ہو جاتا ہے اور ان کے آہنگ میں جذبے کی تپش کے سبب شدت آجاتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جب وہ اپنی ذات کے حصار سے نکل کر ملتِ اسلام کا نوحہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نذر کر رہے ہیں۔ اُمتِ حضور کا استغاثہ بارگاہِ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میں پیش کرنا نئی روایت یا جدت پسندی کی دلیل نہیں۔ صحابہ کرام جس طرح سرکارِ دو عالم ﷺ کی حیات ظاہری میں اپنے اپنے آلام و مصائب دربارِ حضور میں پیش کیا کرتے تھے یہی سلسلۂ مناجات وصالِ حضور ﷺ کے بعد بھی جاری رہا۔ کیونکہ لطف و کرم کے ہر تمنائی کو احساس ہے کہ اگر اس کے آنسو سلطانِ دو عالم ﷺ کی بارگاہ بیکس نواز میں قبول ہو گئے تو رحمتِ ایزدی انہیں یقیناً پذیرائی کے موتیوں کی تب و تاب بخش دے گی۔ حضرت قدسیؒ کے لفظوں میں

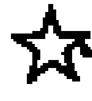
چشمِ رحمت بکشا سُوئے من انداز نظر
اے قریشی لقبی ہاشمی و مطلبی

اور پھر الطاف حسین حالی کی مناجات

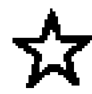
اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

استغاثہ ہو یا مناجات، عرض گزاری ہو یا تمنائے عفو و کرم، شاعر بہر صورت کبھی اپنے حوالے سے امتِ اسلام کا اور کبھی اُمتِ اسلام کے حوالے سے اپنی ذات کا فسانہ الم نبی ءِ رحمت پناہ ﷺ کی بارگاہ قدس میں پیش کر کے یُوں محسوس کرتا ہے جیسے سرکار دو عالم ﷺ کی ردائے رحمت نے اس کو اپنی پناہ میں لے لیا ہو۔ عارف عبدالمتین نے خود کو حضورِ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جلووں میں اس قدر گم اور وارفتہ دکھایا ہے کہ مناجات یا عرض گزاری کے بہت کم مواقع نظر آتے ہیں مگر جہاں بھی ایسا موقعہ میسر آیا ہے عارف عبدالمتین کی فریاد دلوں کو چیرتی ہوئی زمانی و مکانی فاصلوں سے بے نیاز ہو کر دیارِ رسول ﷺ کا طواف کرنے لگتی ہے۔ چند اشعار اس حوالے سے قارئین کی نذر ہیں۔

میں پھول ہوں چبھتے ہوئے کانٹوں میں گھرا ہوں
اے میرے پیمبر میں جہنم میں پڑا ہوں



خوشی کی پہچان بخش مجھ کو غموں کا عرفاں مجھے عطا کر
میں تیری دہلیز پر کھڑا ہوں مجھے مری ذات سے سوا کر
میں روز و شب کے شمار میں ہوں میں وقت کے سرِ حصار میں ہوں
ازل ابد ہیں ترے رضا جُو تو ان کی زد سے مجھے رہا کر



دکھ کا سورج ہے سوا نیزے پہ دشتِ غم ہے
عافیت میں تری رحمت کے شجر سے مانگوں
میں تیرے ساتھ ہوں اور نور ہے میرے سات حبیبؐ
مگر تُو چاند ہے اور میں اندھیری رات حبیبؐ
ہر ایک سمت سے یلغار ہے رقیبوں کی
بتا کہ کیوں ہے انہیں جیت مجھ کو مات حبیبؐ
گرا چکا ہوں میں باہر کے سومنات، مگر
مرے وجود میں پنہاں ہیں سومنات حبیبؐ
بہار بن کے گزر میرے گلستاں سے کبھی

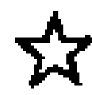
شجر ہیں سوکھے ہوئے چند پھول پات حبیبؐ

عارف عبدالمتین کے نعتیہ کلام میں ایک اہم عنصر ذوق وشوق کا ہے۔ جب شاعر والہانہ پن کی منزلوں کو چھوتے ہوئے اپنے وجود کو محبتِ حضورﷺ میں فنا کر کے اور آگے بڑھنا چاہتا ہے تو اسے بے اختیار بے خودی وسرشاری کا احساس ہوتا ہے۔ حضور نبی کریم کی تعریف وتوصیف میں اپنے قلم کو شہپر جبریلؑ بناتے ہوئے عارف عبدالمتین ذوق وشوق کے حوالے سے رسول شناسی کی جن رفعتوں سے آشنا ہوتے ہیں ان کا ادراک ہی نعت گو شاعر کو کیف وسرور کی ان جاودانی فضاؤں میں لے جاتا ہے جہاں توصیف نگار کا اپنا تشخص گم ہو جاتا ہے اور اسے چاروں طرف محبوبِ دو عالمﷺ کے نورانیت آفریں جلوے بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس عالمِ مدہوشی میں کہ جس پر ہوش وخرد کی تمام تر سربلندیاں نچھاور کی جاسکتی ہیں شاعر ان روحانی ووجدانی لذتوں سے آشنا ہوتا ہے کہ پھر اس کا اس دنیائے من وتُو میں واپس آنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ اقبال کے لفظوں میں۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

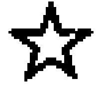
عارف عبدالمتین اپنی فکر بلند کو پرواز شوق بخشتے ہیں اور پھر سلطان مدینہﷺ اور گنبدِ خضریٰ کے تصوراتی جلووں میں گم ہو جاتے ہیں۔ تصور بھی کتنی کیف آفریں دولت ہے جو محب کو اس کی ارادت مندی کے طفیل محبوب کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت عطا کر دیتی ہے۔ ذوق وشوق شادکامی اور سرخوشی وسرشاری کی کیفیت میں عارف عبدالمتین کی شوکتِ احساس انہیں کس طور محویت اور خود فراموشی کے نام پر حضورﷺ کی مدحت طرازی کا سلیقہ عطا کرتی ہے اس کی ایک جھلک دیکھئے۔

نہ تیرے غم سے نجات پاؤں نہ تیری یادیں بھلا سکوں میں
تُو میری آنکھوں کا خواب ٹھہرے تجھے پلک پہ سجا سکوں میں
تو رحمتوں کا گداز بن کر ڈھلے مری آنکھ کی نمی میں
زمانہ ہمدردیاں جو مانگے تو خود کو آنسو بنا سکوں میں



تو سنا ہر پل مجھے اپنی حدیثِ دلربا
میں کہوں ہر آن تجھ سے اپنے دل کا ماجرا

کھل اُٹھے ہیں گلشنِ جاں میں امیدوں کے گلاب
یہ تری موجِ تصور ہے کہ ہے بادِ صبا



بہت قریب ہے تو بھی مری رگِ جاں کے
خُدا نہیں ہے مگر ہاں خدا نما تُو ہے
لکھوں جو نعت تو ہوتا ہے ہر گھڑی محسوس
میں حرف ہوں تو مری لے کا معجزہ تُو ہے

ذوق وشوق کی ان خلوتوں میں جا کر بھی کہ جہاں چاہنے والا اپنی ہستی سے بے گانہ اور انوارِ مصطفوی ﷺ کی ہمہ گیریت کے حصار میں گُم ہو جاتا ہے عارف عبدالمتین نے محبوبِ دو عالم ﷺ کی بلندی درجات کو فراموش نہیں کیا۔

با خدا دیوانہ باشد با محمدؐ ہوشیار

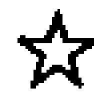
کے مصداق عارف عبدالمتین کو یہ احساس شدّت سے دامنگیر ہے کہ کہیں یہ والہانہ پن اپنی حدود سے تجاوز کر کے بے ادبی کا مرتکب نہ ہو جائے۔ کہیں اس کیف سامانی کا وفوران سے عظمتِ حضور ﷺ کا شعور نہ چھین لے، کہیں ذوق وشوق کی نور آفریں ساعتوں میں خودفراموشی ان کے لئے اس بارگاہِ ناز میں گستاخی کا باعث نہ بن جائے، جہاں فرشتے دم بخود اور خاصانِ خلائق نفس گم کردہ ہیں۔ یہ وہ بارگاہِ ناز ہے جہاں صاحبِ نیاز اپنی جبین پر ''بعداز خدا بزرگ توئی قصہ مختصر،، کی حقیقتِ ازلی کا نُور سجائے حاضر ہوتا ہے۔ اس مقامِ شوق سے گزرتے ہوئے عارف عبدالمتین نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے مقاماتِ قدسیہ، محاسن ایمانی، فضائل وکمالات اور معجزات وخصائص کو بھی عقیدت کی آنکھ سے دیکھا اور ارادت کے احساس سے دل میں جگہ دی ہے۔ انہوں نے اپنے قلم کو عشق وعقیدت کی روشنی میں ڈبو کر جس طور محاسنِ حضور ﷺ کا تذکرہ کیا ہے اس کی بدولت قاری کو عارف عبدالمتین کے تاریخی شعور اور سیرت نگاری کے نہایت خوبصورت مظاہر دیکھنے کو عطا ہوتے ہیں۔

ثبوت ہے تری عظمت کا تری رفعت کا
تری ثنا پہ ہے مجبور خود عدو تیرا

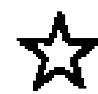
مرے لئے تری سیرت ہی بے مثال نہیں
دکھائی دیتی نہیں تجھ سی کوئی صورت بھی

ہر ایک گام ہو طائف سا مرحلہ در پیش
ستم اٹھاؤں کسی کو مگر برا نہ کہوں

تو نے یکتائی خالق کی بصیرت بخشی
تجھ کو مخلوق نے ہر رنگ میں یکتا دیکھا
الجھے الجھے تھے بہت کون ومکاں کے عقدے
تیرے فیضان سے ہر عقدہ سلجھتا دیکھا



تیری عظمت سے ہمیں وسعتِ کردار ملی
ہم کہ قطرہ تھے ہمیں بحر بنایا تُو نے
فقر کو رفعتِ مفہوم ترے گھر سے ملی
اپنے دروازے پہ شاہوں کو جھکایا تُو نے



کجلائے نہ سورج تری رحمت کا ابد تک
تا حشر ترے پیار کا مہتاب نہ گہنائے
جو عہد بھی آئے تری سیرت پہ ہو نازاں
جو دور بھی آئے ترے کردار پہ اترائے

عارف عبدالمتین کی نعت گوئی بلاشبہ اردو نعت کے سرمائے میں بے حد خوبصورت اور گراں قدر اضافہ ہے۔ محبتِ حضورﷺ کی رفعتوں کو چھوتے ہوئے عارف عبدالمتین نے بارہا خود کو سیرت حضورﷺ کے سانچے میں ڈھالنے کی آرزو کی ہے اور یہ وہی آرزو ہے جو ہر صاحبِ ایمان کو جانِ ایمانﷺ سے فکری طور پر قریب تر کر دیتی ہے۔ سچ جانیے تو اصل محبت اور قربت

اسی کا نام ہے کہ نعت گو شاعر لفظوں کے گل وگلزار کھلاتا ہوا اپنے آقا و مولا ﷺ کی صورت و سیرت سے اس طور راہنمائی حاصل کرے کہ اسے ایک نظر دیکھتے ہی محبت رسول ﷺ کی عملی تفسیر نگاہوں کے روبرو ہو اور میدان حشر میں حضور شفیع المذنبین ﷺ اسے دیکھتے ہی کہہ دیں کہ یہ تو مرا غلام ہے۔ صورت و سیرتِ حضور ﷺ کے نورانی جلووں میں کھو کر نبی اکرم ﷺ کے محاسن و محامد کا پرتو عہدِ حاضر کے اصحابِ ایمان میں دیکھنے کی تمنا عارف عبدالمتین کی شاعری کا حسنِ امتیاز ہے۔ ان کے بے مثال مجموعہ نعت ''بے مثال'' سے محبت و عقیدت سرکار ﷺ کے انوار سمیٹتے ہوئے ہم شاعر بے مثال کی بلندیٔ درجات اور دربارِ رسالتمآب ﷺ میں پذیرائی کے لئے دعا گو ہیں۔ ہم عارف عبدالمتین کے اس حسنِ تمنا پر اپنی تحریر کا اختتام کرتے ہیں۔

تری ثنا کے لئے تیرا رُوپ لازم ہے
تو میری نعت کو اندازِ دلربائی دے

☆☆☆

راسخ عرفانی

ایک منفرد نعت گو

سرکارِ دو عالم ﷺ کی تعریف و توصیف اس قدر مقدس و محترم فریضہ ہے کہ جس کی عظمتوں کے احساس سے ہی قلب و فکر کو بالیدگی کی دولت عطا ہونے لگتی ہے۔ جسم و جان کو نا قابلِ بیان فرحت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر صاحبِ ایمان سلطانِ مدینہ ﷺ کی مدحت و ثنا کو وظیفۂ حیات بنائے ہوئے ہے۔ جملہ اسالیب کے دھارے، ہر قسم کے استعارات کے سرچشمے اور تشبیہات و تراکیب کے زمزمے صفت و ثنائے مصطفوی ﷺ کے بحرِ ناپیدا کنار میں جذب ہو جاتے ہیں اور ہر ثنا گو جملہ مدحت نگاروں کی صف میں اپنے لئے گنجائش پیدا کرنے کے لئے عجز و انکسار کو وسیلۂ اظہار بنا کر حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی چشمِ عنایت کا طلبگار رہتا ہے۔

یہ وہ کوچہ ہے جہاں کسی کو کسی سے بازی لے جانے کی آرزو نہیں ہے بلکہ ہر ثنا گو کو احساس ہے کہ یہ اس قدر بلند فکر کوچہ ہے کہ جس میں جگہ پانے کے لئے دیدہ و دل کو فرشِ راہ کر کے آنا پڑتا ہے یہ وہ مقامِ قدسی ہے جہاں جنیدؒ و بایزیدؒ بھی دست بستہ اور دم بخود نظر آتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں سیدنا کعب بنؓ زہیر اور سیدنا حسانؓ بن ثابت سمیت بے شمار عشاق نے اپنے اپنے افکار کے گلہائے رنگا رنگ محبوبِ کائنات ﷺ کی نذر کئے ہیں۔ جہاں ہر دور کے طالبان شوق نے اپنے بہترین روحانی اثاثے اور ایمانی جذبے جناب رسالتمآبؐ کے دربار اقدس میں پیش کئے ہیں۔ انبیائے کرام، صحابہ کبار، اولیائے عظام ہی نہیں بلکہ خود خداوند قدوس اور ملائکہ بھی بارگاہِ مصطفیٰ ﷺ میں سلام و درود کی ڈالیاں گزارتے دکھائی دیتے ہیں۔ زمین کی پستیوں سے لے کر افلاک کی رفعتوں تک جملہ مخلوقات اس حکم ربانی کی تعمیل میں محو نظر آتی ہیں کہ

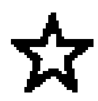
اِن اللہ وملٰئکتہ یصلون علی النبی ٥ یا ایھاالذین آمنوا صَلّو علیہ وسلّمو تسلیما۔ہ

فنِ نعت گوئی کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں تو ہر دور میں چند ایسے سر بلند نفوس نظر آتے ہیں جن کی آواز میں اپنے معاصرین کی نسبت کہیں زیادہ توانائی اور جن کے سوزِ نعت میں دوسرے ثنا خوانوں کی نسبت کہیں زیادہ دلگدازی محسوس ہوتی ہے۔ عصرِ حاضر میں جو مدحت نگار نعت کے

میدان میں اپنی عظمتِ فکروفن کے چراغ روشن کیئے ہوئے ہیں ان میں راسخ عرفانی کا نام ہرلحاظ سے لائق صد ستائش نظر آتا ہے۔راسخ عرفانی اپنے مقام ومرتبہ کے لحاظ سے قطعاًمحتاجِ تعارف نہیں ہیں وہ عمر کے اس دور میں ہیں جہاں شاعر کی فنی پختگی سند کا درجہ حاصل کرلیتی ہے۔اس بڑھاپے میں ان کا فن جوانی کی منزلیں طے کرتا نظر آتا ہے۔وہی علمی پختگی،وہی ادبی دلآویزی، وہی فنی سربلندی،وہی جذباتی والہانہ پن،وہی سوز وگداز کا نم،وہی ہر آن ریاضِ فکر کی منازل طے کرتا ہوا اشہب قلم،وہی احساسات کی تازگی،وہی مہکبار جذبہ سخنوری۔

راسخ عرفانی بیک وقت غزل اور نعت کے میدان میں رفعتِ فکروفن کا جادو جگارہے ہیں بالخصوص نعت کے میدان میں ان کے افکاروتخیلات کی تازگی اس کا اعلان ہے کہ اگر دلوں میں عشق وعقیدت رسولِ خداﷺ کی قندیل صحیح معنوں میں فروزاں کرلی جائے تو پھر عمر کی گذرتی ہوئی ساعتیں شاعر کے قلم کی روانی کو کبھی بھی زوال آشنا نہیں ہونے دیتیں۔جب ممدوح وہ ذات گرامی ہے کہ جس کا ذکرِ عنبر بار ہر قسم کی حدود وقیود سے بے نیاز ہے۔ازل سے بھی پہلے اورابد سے بھی آگے تو پھر اس ممدوح آدم وبنی آدم سے عقیدت کا رشتہ رکھنے والے کس طور کسی فکری کمزوری یا فنی لغزش سے آشنا ہوسکتے ہیں۔عقیدت کا گلزار بہارآفریں ہوتو پھر خزاں کا وہاں کیا گزر۔جناب راسخ عرفانی کے قلم نے ہرلحظہ ہر آن اُن کے مسلسل سرگرمِ عمل ہونے کا احساس دلایا ہے۔اسی لئے وہ کہتے ہیں

جس در سے رحمتوں کو ملتی ہے بھیک راسخ
گھر بار کو بھلا کر اس در کا ہو گیا ہوں

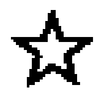


راسخ میں اک موذنِ دینِ رسولؐ ہوں
میری صدا ہے گنبدِ بے در سے بھی بلند

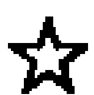
بارگاہِ مصطفویﷺ کی عظمتوں کا نظارا یہ ہے کہ یہاں کجکلاہانِ عالم بھی غلامانہ صورت بنائے عجز وفروتنی کا انداز جبینوں پر سجائے اس بڑے داتا کی چوکھٹ پر سوالی بن کر حاضر ہوتے ہیں۔دربارِ رسولﷺ میں حاضری کا شرف حاصل کرنے کی آرزو کرتے ہوئے ہر صاحبِ فکر کو علم ہوتا ہے کہ یہاں ادب عقیدت کے پیمانے دنیاوی شہنشاہوں کے آدابِ درباری سے جدا ہوتے ہیں۔یہاں وہ آقا قیام فرما ہے جو لرزتے لبوں کی جنبش سے ہی دلوں کا مدعا جان لیتا ہے جو خاموش

جذبوں میں مضمر عقیدت کے لفظوں کو شرف باریابی عطا کرتا ہے۔ جو بے کسوں کا سہارا اور بے بسوں کی ڈھارس ہے۔ جو غمزدوں کا آسرا اور محروم قسمت انسانوں کے لئے وجہ تسلی ہے۔ اس رشکِ سلاطین عالم ﷺ کے دربار میں راسخ عرفانی کا اندازِ عجز دلوں کو عقیدت کے نئے آداب سکھاتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

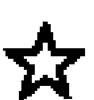
چاندنی رات میں طیبہ کی مسافت کا سماں
خاک بھی پاؤں میں بچھتی ہے صبا کی صورت
اے شہِ خلد کی گلیوں کے غبارِ اطہر
ڈھانپ لے حشر کے دن مجھ کو ردا کی صورت



کھوئے ہیں کچھ اس طور سے بطحا کی فضا میں
ایماں کی کہیں اپنا نگر بھول گئے ہیں
دل کا ہے سکوں گنبدِ خضریٰ کی زیارت
اک لمحے میں ہم کربِ سفر بھول گئے ہیں



مُشک میں ڈوب کے پلکوں پہ ہیں آنسو آئے
نعت لکھوں مرے خامے سے بھی خوشبو آئے



ختمِ رسل کے روضۂ اقدس کا وہ جلال
اٹھی نہ پھر نظر مری پہلی نظر کے بعد
دل سیر رُوح سیر ہے خیراتِ فقر سے
دیکھا نہ در کسی کا محمد ﷺ کے در کے بعد

راسخ عرفانی ایک بڑے شاعر ہوتے ہوئے اس حقیقت سے بہرہ ور ہیں کہ سلطانِ مدینہ ﷺ کی مدحت وثنا کا حق کون ادا کر سکتا ہے۔ جو رب بے مثال کا بے مثال شہکار ہو جو ہر ایک قلب غمزدہ کا قرار ہو جس کے مدحت سرا خدا و ملائکہ ہوں جس کے در کے دربان ہونے کی سعادت جبریلؑ کو ملی ہو۔ جس کا ہر قول وحیِ خدا اور جس کا ہر لفظ تقدیرِ یزداں ہو۔ جو صاحبِ قرآن ہی نہیں

اپنی سیرتِ مطہرہ کے لحاظ سے عین قرآن ہو، جو ہر تخیل سے ماورائی اور ہر تصور سے سر بلند ہو، جس کو خیالوں میں بسایا تو جا سکے مگر نگاہ جس کے جلووں کی تاب نہ لا سکے۔ اس کی ثنا میں شاعر کا قلم کس حد تک آگے بڑھ سکتا ہے کیونکہ انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ

لا یمکن الثناء کما کان حقہ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

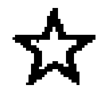
اس مرحلہ پر پہنچ کر راسخ عرفانی کے قلم سے جو صداقتیں پھوٹتی ہیں ان کی ایک جھلک دیکھئے۔

توصیفِ مصطفٰے کی کرامت زہے کرم
پھیلا ہے بزم بزم میں کیف و سرورِ فن
عاجز جہاں تھا سعدیؒ و حسان ؓ کا سخن
بے جا ہے اس مقام پر ناز و غرور فن
حیران ہوں میں کہ نعت کے زمرے میں کیا لکھوں
بے بس سا ہو گیا ہے قلم بھی حضورِ فن
راسخ کٹھن ہیں مدحِ محمد ﷺ کے مرحلے
طبعِ رسا سے دور ہیں انوارِ طورِ فن

نعتِ سرورِ کونین ﷺ کے باب میں اس قدر اظہار عجز و انکسار کے باوجود راسخ عرفانی نے اپنی عقیدت آفرینی کی بدولت جو گل و لالہ مہکائے ہیں ان کی خوشبو ایوانِ نعت کو ہمیشہ معنبر و معطر رکھے گی۔ راسخ کی نعتیہ شاعری ایک ایسے جام جہاں نما کی صورت ہے کہ جس پر ایک نظر ڈالتے ہی قاری اپنے آقا و مولا ﷺ کی لازوال شخصیت کے بہت سے پہلوؤں سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ راسخ نے اپنی ندرتِ فن اور طبعِ رسا کی بدولت نئے سے نیا مضمون پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کسی مضمون یا مفہوم کی تکرار ہوئی بھی ہے تو اس خوبی کے ساتھ کہ اس کا نیا پن مجروح نہ ہونے پائے۔ نعت کہنا حقیقت میں تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ شاعر عقیدت میں غلو سے کام لے تو سرکار کی نظروں سے گرتا ہے اور اگر آپ کے مقاماتِ سر بلند میں کمی کر جائے تو تنقیص رسالت کے نام پر عذابِ الٰہی کا خوف دامنگیر ہے۔ راسخ عرفانی شریعت کے تقاضوں سے آگاہ ہیں اس لئے انہوں نے حقیقی نعت کی روح کو ملحوظ رکھتے ہوئے نعت لکھی ہے۔ ان کی نعت میں ادب کے ساتھ ساتھ احتیاط کی جھلک بھی ہویدا ہے۔ اس ادب و احتیاط کے امتزاج نے

انکی نعتیہ شاعری کو دوام سے ہمکنار کر دیا ہے۔ چند ایسے اشعار ملاحظہ کیجئے جن سے راسخ کی طبع رسا اور نعت کے فکری بانکپن کا اظہار ہوتا ہے۔

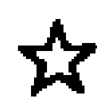
جو لے گئی تھی مجھ کو اڑا کر سرِ حجاز
پھر کاش وہ ہوا کبھی معجز اثر چلے
کیا کیجئے گا اس کے تجمل کا تذکرہ
جس کی گلی میں چاند بھی خم کر کے سر چلے
بن کر غبارِ راہ رہوں میں بھی ساتھ ساتھ
موجِ نسیم جانبِ طیبہ اگر چلے



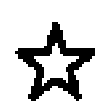
ہو سکیں لائقِ توصیفِ محمد ﷺ شاید
کوئی حرفوں میں اگر چاند کے جوہر باندھے
تشنگی ذوقِ عقیدت کی بدستور رہی
لاکھ مضمون پئے مدحِ پیمبرؐ باندھے



دل میں طیبہ کا تصور ضوفشاں ہونے لگا
ایک اک ذرے پہ سورج کا گماں ہونے لگا
گنبدِ خضریٰ کی یادوں نے وہ بخشی تازگی
اجڑا اجڑا گھر بھی ہمدوشِ جناں ہونے لگا



وفورِ جذبِ الفت میں یہ اسلوبِ سخن میرا
ہر آنسو کو وفا کا استعارا کر لیا میں نے

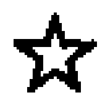


تسلیم و عجز پیار کا پہلا اصول ہے
اے نطق با ادب کہ یہ نعتِ رسول ہے

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرتِ مقدسہ وہ لازوال قوت ہے کہ جس نے زمانے بھر

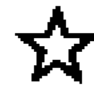
کو تسخیر کرلیا۔ آپ نے اپنے کردار کی بدولت عرب کے صحرانشینوں کو دنیا بھر کے لئے وجہ صد افتخار بنادیا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے کائنات کے جملہ علوم وفنون کے ایسے ماہر بن گئے کہ دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ راسخ عرفانی بھی آقائے دو عالم ﷺ کی سیرت کو خراجِ عقیدت ادا کرتے نہیں تھکتے کیونکہ آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اگر آج پھر زمانے بھر میں منفرد و ممتاز ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں سیرتِ مصطفوی ﷺ سے استفادہ کرنا ہوگا۔ سیرت نگاری خواہ نثر میں ہو یا نظم میں اپنی جگہ منفرد حسن رکھتی ہے۔ راسخ نے اپنے نعتیہ اشعار میں جابجا سیرت سلطانِ دو عالم کو موضوع سخن بنا کر خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ آپ کی رحمۃ للعالمینی، آپ کا خُلق بے مثال، آپ کی راہبری و راہنمائی، آپ کی سیادت قیادت، آپ کی عنایاتِ کریمانہ، آپ کی شفقتِ بے کراں سمیت کتنے ہی موضوعات ہیں جو جگمگاتے ہوئے ستاروں کی صورت راسخ عرفانی کے کلام میں روشنی بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ اس سیرت نگاری کا یہ مطلب نہیں کہ راسخ نے صورتِ مصطفےٰ ﷺ کی تجلیات سے آنکھیں چرائی ہیں بلکہ انہوں نے سلطانِ دو عالم ﷺ کے حسن و جمال اور صورتِ بے مثال سے بھی اپنے اشعار کو زینت بخشی ہے اور اس کی بدولت حسنِ تغزل کے بہت سے اعلیٰ نمونے نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ راسخ عرفانی نے بعض مقامات پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرتِ قدسیہ کو اس طور بیان کیا ہے کہ اس میں جمالِ مصطفوی کی لمعہ افشانیاں بھی جلوہ گر نظر آتی ہیں سیرت نگاری کے حوالے سے ان کا اندازِ فکر ملاحظہ کیجئے۔

کفر کی دھند میں ایمان کا سورج چمکا
کس تب و تاب سے ایمان کا سورج چمکا
مٹ گیا سارے قبیلوں کا تفاوت یکسر
وحدتِ قوم کی پہچان کا سورج چمکا
روئے عالم پہ مساوات کی کرنیں پھیلیں
عدل و انصاف کی میزان کا سورج چمکا

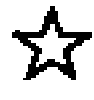


ترا یہ لطفِ فراواں لہو کے پیاسوں پر
انوکھا اہلِ جہاں سے ہے انتقام ترا

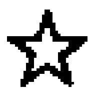
گدا بھی در کے سوالی ہیں اور منعم بھی
غریب و میر پہ یکساں ہے لطفِ عام ترا



ہجومِ کرب میں ڈھونڈیں کوئی سکوں کی سبیل
کریں امیرِ بہشت بریں کا ذکرِ جمیل



راہِ تیرہ میں ضیا ان کے نقوشِ پا کی
رہروِ عشق کو قندیل سفر ہوتی ہے



نبی ورودِ مبارک سے جنتِ ارضی
وہی زمین جو بنجر تھی آپ سے پہلے
برہنہ سر تھیں قبائل کی عزتیں راسخ
دریدہ حُسن کی چادر تھی آپ سے پہلے

یہ حقیقت ہے کہ حالی اقبال اور ظفر علی خاں نے نعت کے مروجہ اسلوب کو نیا پیکر عطا کر کے جدید نعت گوئی کا آغاز کیا تھا۔ نیا اسلوب زندگی کے حساس پہلوؤں سے قریب تر ہوتا ہے۔ یعنی شاعر جو کچھ محسوس کرتا ہے اسے قرطاس دل پر رقم کرنے لگتا ہے۔ کہیں اپنی ذات کے حوالے سے، کہیں ملک وقوم کے حوالے سے، کہیں وقت کی بے مہریوں کے حوالے سے، کہیں حالات کی ستم کاریوں کے حوالے سے، کسی نہ کسی صورت میں وہ انفرادی یا اجتماعی استغاثہ بارگاہِ رسالتمآب ﷺ میں پیش کرتا ہے کیونکہ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے کہ یہی وہ بارگاہ ہے جہاں سے کوئی بھی سوالی خالی ہاتھ نہیں آتا۔ جہاں جذبات صرف قبول ہی نہیں ہوتے بلکہ سائل کو اس کی طلب سے زیادہ عطا ہوتا ہے۔ راسخ عرفانی اپنی ذات کے حوالے سے کم اور ملک وقوم کے حوالے سے کہیں زیادہ مصائب روزگار کے قصہ ہائے درد سناتے ہیں۔ اس سے جہاں شاعر کو فسانہ ہائے الم بارگاہِ مصطفوی میں سنا کر ذہنی وروحانی سکون کی دولت عطا ہوتی ہے وہاں قاری شاعر کی رفعتِ فکروفن کے نام پر ملت اسلام کو درپیش مسائل کی شدت سے بھی آگاہ ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں راسخ عرفانی کے لہجے کا نم دیکھئے۔

پُر کریں جنسِ قناعت سے ہوس کے کاسے
قوم کی قوم ہے محتاج رسولِ اکرم

کل ہمیں آپ نے بخشی تھی غنا کی دولت
دیکھئے ہم کو ذرا آج رسولِ اکرم

☆

کیا کہوں عرصۂ عالم میں مسلماں کے لئے
نت نیا ظلم ہے ایجاد رسولِ عربی

لاج رکھ لیجئے راسخ کی سرِ شہرِ جفا
دیجئے رحم کی کچھ داد رسولِ عربی

☆

کیا کیا نہ ستم اُمتِ مرحوم پہ ٹوٹے
یہ کرب کی دھرتی ہے اُدھر گردشِ افلاک

اے میرِ امم دیجئے رحمت کا سہارا
لے ڈوبے گی ورنہ ہمیں نافہمیٔ ادراک

پھر برسرِ بیداد ہیں بوجہل کے بیٹے
لوٹی ہیں تری قوم کی کفار نے املاک

☆

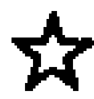
اب تو مرے الفاظ کو تاثیر عطا ہو
بہہ جائے نہ اشکوں میں مرا قلب تپیدہ

محتاج ہوں میں سر بہ قدم بخیہ گری کا
ملبوس تو کیا جسم بھی ہے مرا دریدہ

راسخ عرفانی نے محض روایتی نعت نہیں کہی بلکہ نعت کے حقیقی تقدس کو دل و جان میں بسا کر نعت کہنے کی کوشش کی ہے۔ نعت کہنے کے لئے جس پاکیزگی فکر، لطافتِ احساس اور طہارتِ ذوق کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان کی شاعری کا اعزاز بن چکا ہے۔ حجِ بیت اللہ کی سعادت سے بہرہ ور ہو چکے ہیں۔ گنبدِ خضریٰ کے نورانی جلوؤں سے دیدہ و دل کو ضوریز کر چکے ہیں۔ جب تک جمال گنبدِ خضریٰ دیکھا نہ تھا تو ہجر کی شدت تھی۔ گنبدِ خضریٰ کی چھاؤں میں ستانے کا موقع ملا تو روح کے ساتھ ساتھ جسم کو بھی فکری بالیدگی عطا ہوئی۔ جب تک وہاں رہے ان جلوؤں کو دامانِ روح میں سمیٹتے رہے اور جونہی واپسی کا سفر شروع ہوا تو دل ایک نئی کیفیت سے دوچار ہونے لگا کہ جن جلوؤں کو دیکھ چکا ہوں انکو بار بار دیکھوں، اذنِ حضوری عطا ہوتا رہے۔ اس نئے احساس کی بدولت ان کی نعتیہ شاعری کے پس منظر سے نئے نئے موضوعات ابھرنے لگے۔ ایسے موضوعات کہ جن میں درد کی کسک بھی تھی اور شوق کی وارفتگی بھی۔

دل میں ہے ان کی محبت کا خزینہ ورنہ
اور تو مجھ میں نہیں وصف نمایاں کوئی

ارضِ طیبہ میں پسِ مرگ ہو مدفن راسخ
سوا اس کے نہیں حسرت و ارماں کوئی



تیرہ سامانی بھی راہوں میں رہے حائل اگر
منزلِ طیبہ کی رودادِ سفر لکھتا رہوں

ختم ہو جائے سیاہی تو بھی توصیفِ حضور
آنسوؤں سے یا بہ خونِ نابِ جگر لکھتا رہوں



اشتیاقِ سجدہ ریزی کا تاثر مرحبا
خود بخود نزدیک سر کے آستاں ہونے لگا

راسخ عرفانی کی نعتوں میں محبتِ رسول ﷺ کی دلنواز مہک احساسات کو مہکانے کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ منزلِ طیبہ کی جانب بڑھتے ہوئے انہوں نے خلوصِ فکر کی قندیل مسلسل جلائے رکھی ہے۔ فنی ریاضت پر ناز کرنے کے بجائے انہوں نے عشق و عقیدت کو فوقیت بخشی ہے کیونکہ انہیں یقین ہے کہ ان کے دامن میں فقط عقیدتِ حضور ﷺ ہی وہ واحد متاعِ عزیز ہے کہ جو بارگاہِ رسالتمآب ﷺ میں مقبول ہو کر اِن کی دینی و دنیوی سرخروئی کا باعث بن سکتی ہے۔ اپنی اس متاعِ عزیز کو انہوں نے مادی کثافتوں اور باطل نظریات کی یلغار سے بچا کر رکھا ہے اور جب بھی موقع میسر آتا ہے اسی ارادت و عقیدت کو تمناؤں کی ڈالی پر سجا کر محبوبِ دو جہاں ﷺ کے حضور نذر کر دیتے ہیں اس احساس کے ساتھ کہ یہی تو وہ در ہے کہ جہاں ہر آن چھایا ہوا سحابِ رحمت عصیاں کاریوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر طالبانِ شوق کو ابدی سرخروئی و سرشاری سے ہمکنار کر دیتا ہے۔



جادۂ شوق کا مسافر

اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی

مطلع فلک جو سورج نصف النہار کو پہنچتا ہے۔ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ دامانِ مغرب میں غروب ہو جاتا ہے۔ جو چاند رات کی تاریکیوں میں ضو پاشی کرتا ہے۔ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ بھی اپنا نور کھو بیٹھتا ہے۔اسی طرح سے جو گلستان بھی مہکتا ہے ایک دن نذرِ خزاں ہو جاتا ہے لیکن ایک سورج ایسا ہے جو اپنی سربلندیوں کو پہنچا تو پھر ابد تک گہن یا زوال آشنا نہیں ہو سکا۔ ایک چاند ایسا ہے جو ایک مرتبہ ضوفگن ہوا تو کبھی بھی غروب نہ ہو سکا۔ایک گلستان ایسا ہے جو ایک مرتبہ مہکا تو پھر مہکتا ہی رہا۔ یہ سورج، یہ چاند وہ صاحب وَالشَّمس وَالقَمر ہے جس کی توصیف وثنا کائنات کا مرکز ومحور ہے۔ یہ گلستان مدحت وثنائے مصطفوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وہ گلزارِ نو بہار ہے کہ جس پر کبھی خزاں نہیں چھا سکے گی۔ازل تو محض ایک نکتہ آغاز ہے اور اسی طرح ابد محض ایک نقطۂ انجام ورنہ جہاں تک صفت وثنائے سرورِ کونین کا تعلق ہے تو نہ حد اس کے پیچھے نہ حد اس سے پیچھے کے مصداق یہ تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اصحابِ ایمان کے افکار واذہان کا جزوِ لاینفک بن چکی ہے۔ اقبال کے لفظوں میں

چشم اقوام یہ نظارا ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ لک ذکرک دیکھے

اسی مضمون کو عصرِ حاضر کے عظیم نعت گو شاعر اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی نے یوں بیان کیا ہے۔

خزاں ناآشنا روزِ ازل سے برگ برگ اس کا
بہارِ جاوداں وقفِ گلستانِ محمد ﷺ ہے

یہ کون نظیر لدھیانوی ہیں کہ جن سے میں آج سے پہلے کبھی نہیں ملا مگر جن کی نعت گوئی ایک مدت سے میرے خلوت خانہ ذہن وفکر میں بسی ہوئی ہے۔ یہ وہی نظیر لدھیانوی ہیں جنہیں میں نے اپنے آغازِ شعور سے آج تک نعت گوئی میں مسلسل اپنا رہنما پایا ہے۔ یہ وہی نظیر لدھیانوی ہیں جن کا قلم زندگی کی اتنی مسافتیں طے کرنے کے باوجود زوال آشنا نہیں ہوا، ہاں ہاں وہی نظیر لدھیانوی جنہوں نے مدحت ونعت رسول ﷺ کے زمزمے فضاؤں میں بکھیرے ہیں۔ یہ وہی نظیر لدھیانوی ہیں جو عمر کی طویل مسافت طے کرنے کے باوجود نعت آج بھی اسی وقار، عقیدت

اور احترام سے کہتے ہیں۔ جو عشاق رسول ﷺ کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہی نظیر لدھیانوی جنہیں سلطان دو عالم ﷺ سے نسبت پر پیہم ناز ہے اور یہی ناز ہے جو ان کے لئے آب حیات کی تاثیر رکھتا ہے اور انہیں ہر آن نعت مصطفےٰ ﷺ کے لئے سرگرم عمل رکھتا ہے۔

ستارہ ہو نظیرؔ بے نوا کا کیوں نہ تابندہ
کہ یہ خاک کف پائے غلامانِ محمد ﷺ ہے
شغل میرا ہر نفس تسبیح و تسلیم اے نظیر
کام میرا روز و شب مدحت رسول اللہ کا

چودہ صدیاں قبل جبلِ فاراں کی رفعتوں سے آفتابِ جمال مصطفوی ﷺ یوں جلوہ افروز ہوا کہ اس کی لازوال کرنوں نے عشاقِ جاں نواز کے قلب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مستنیر کر دیا۔ جن ذرات کائنات کو عشق و عقیدت کی کرنوں کی تب و تاب میسر آئی وہ نجوم تاباں کی صورت جگمگا اُٹھے۔ جنابِ نظیر لدھیانوی کی نعتیہ شاعری بھی مطلعٔ شعر و اَدب پر جگمگانے والے ایک ایسے نجم کامل کی داستانِ شوق کی مظہر ہے جو آج میدان شاعری میں ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' کا مصداق قرار پا چکا ہے۔ دو چار برس کی بات نہیں یہ تو نصف صدی سے بھی زیادہ کا قصہ ہے جب نظیر نے مدحت مصطفےٰ ﷺ علیہ التحیۃ الثناء کی منزل کی جانب اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ نظم ہو یا نثر تنقید ہو یا تحقیق نظیر لدھیانوی نے کہاں کہاں اپنی عظمت سربلندی کا علم نہیں لہرایا' ان کی نعتوں میں حسنِ تغزل کے حوالے سے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

آنسو خوشی کے دیدۂ تر سے ٹپک پڑیں
خاموشی' نگہ ہو لطفِ نوا حضور
چھا جائے آسمان پر الطاف کی گھٹا
مثلِ صبا ہو موجِ نفس غم ربا حضور

....

شوق میں کون نہیں دیکھتا رستہ تیرا
چار سو عالم امکاں میں ہے چرچا تیرا
جا بجا نقش قدم تیرے بہار آرائیں
عاشقوں کے لئے گلزار ہے صحرا تیرا
لے گئے روشنی آرائشِ جنت کے لئے
لوگ وہ دیکھا جنہوں نے رخ زیبا تیرا

نظیر لدھیانوی نے جہاں اپنے ذاتی حوالے سے اپنے محسوسات حضور ﷺ کی نذر کیے ہیں۔

وہاں وہ اُمت اسلام کو نہیں بھولے۔ یہ خود کو ملتِ اسلام کا حساس فرد سمجھتے ہیں جو اُمت مسلمہ پر چھانے والی گردشوں سے بے بہرہ نہیں ہے۔ تمام مسائل بارگاہِ سرور کائنات ﷺ میں اس اُمید پر پیش کر رہے ہیں کہ اگر وہاں سے چشم کرم کا اشارا ہو جائے تو گردشیں چھٹ جائیں گی۔ وقت کا آتشکدہ گلزار ہو جائے اور شب غم کے مسافروں کو اُمید کے اُجالے میسر آئیں گے۔ اُمت اسلام کے حوالے سے یہ جس طور اجتماعی غم بارگاہ رسالتمآب ﷺ میں پیش کرتے ہیں اس کی ایک جھلک دیکھئے۔

مسلماں اور ہو مغلوبِ مایوسی و محرومی
یہی وہ شیر ہیں جو دین و دنیا ہار بیٹھے ہیں
اے خاصۂ خاصانِ رسل روزِ جزا ہے
اُمت تیری محتاجِ مراعات و عطا ہے
کس طرح ختم ہو یہ سلسلۂ فسق و فجور
باعثِ شرم تھی جو بات وہ مرغوب ہے اب
بڑی مدت سے مسلط ہے لعاص کی گھٹا
دیکھئے اس شب تیرہ کی سحر ہوتی ہے کب

عظمت سرورِ کونین ﷺ نعت گو شعراء کا مقصودِ اوّل ہے۔ مدحت نگار اپنی جملہ ادبی و شعری صلاحیتوں کا ارمغان حضور ﷺ کی نذر کرتے نہیں تھکتے۔ یہی کیفیت اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی کی ہے۔ ان کی نعتیں ان کے واردات قلب کی روداد ہیں۔ ان میں عشق وعقیدت کی فراوانی بھی ہے اور طبع رسا کی جولانی بھی، پاکیزگی فکر کی بلند پروازی بھی ہے اور مہجوریٔ طیبہ میں تڑپنے والے دل کی بے قراری بھی۔ عنایات مصطفویٰ ﷺ پر اظہار امتنان وتشکر بھی ہے اور نعت گوئی کی سعادت عطا ہونے پر احساس اعزاز مقدر بھی، گلبار لفظوں کا شکوہ بھی ہے اور معطر معطر جذباتِ شوق کا بانکپن بھی، ان کی شاعری میں دردِ ذات، کرب ملت سے یوں ہم آہنگ ہو گیا ہے کہ اس کی بدولت ان کی عظمتِ فن مسلم سے مسلم تر ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ عظمت سرور کونین ﷺ کو یوں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

پست وبالا میں نہ ہے خورد و کلاں میں امتیاز
شفقت و احسان ہے عادت رسول اللہ کی
مرغِ سدرہ بھی ہے چپ جبریلؑ بھی خاموش ہیں
سمجھیں کس تشبیہ سے عظمت رسول اللہ کی
کی صبحِ ازل اس نے ترے نور سے روشن
ہستی تری آئینہ لولاک لما ہے

ہے سر یہ ترے تاج رفعنا لک ذکرک
کب اور کسی شخص کو یہ رتبہ ملا ہے

نظیر حسین نظیر لدھیانوی نے اپنے تمام محاسنِ شعری کو عجز وفروتنی کے سانچے میں سمو کر اسے ابدی جگمگاہٹ عطا کر دی ہے۔ کیونکہ نظیر جیسے محبِ رسول ﷺ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ بارگاہِ مصطفوی ﷺ میں وہی متاعِ فن قبول ہوتی ہے جسے اَدب واحترام کی ڈالیوں پر رکھ کر پیش کیا جائے کیونکہ اَدب ہی وہ قرینہ ہے جو تمام آرزوؤں کو قبولیت سے ہمکنار کرتا ہے۔ اَدیب ہو یا شاعر، نثر نگار ہو یا خطیب سب کے سب بہت کچھ لکھ کر بھی ازراہِ احترام عقیدت سر نیادہ کھڑے ہیں کہ جب تک اَدب واحترام کو اپنے جذبات کا حاصل نہیں بنائیں گے اس وقت تک ان کی متاعِ فن خوشنودی حضور ﷺ کا باعث نہیں بن سکے گی۔ نظیر لدھیانوی نے اَدب واحترام کے تقاضوں کو کس طور بجا آوری کی ہے اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

میں تو چپ تھا کہ نہ آئے تھے بنانے الفاظ
نعت گوئی کے لئے بخشے خدا نے الفاظ
نعت کہنے کا ارادہ جو میں کرتا ہوں کبھی
ڈال دیتے ہیں مرے آگے خزانے الفاظ

....

دھو لیا ہے کوثر وتسنیم سے سو بار دہن
اب بھی لوں نام اگر تیرا تو ہے بے اَدبی
سرمۂ چشم بناؤں ترے کوچے کا غبار
سر کے بل حاضرِ خدمت ہوں اگر ہو طلبی

ہماری دعا ہے کہ ذکر وفکر مصطفیٰ ﷺ کے فیوضِ ابدی سے مستنیر ہونے والا انجم کامل دنیائے مدحت ونعت میں اسی طور ایمان ویقین کی روشنی لٹاتا رہے اور مستقبل کے وجود سے اُبھرنے والے قافلے اس سر بلند وسرفراز نعت گو شاعر کے کلام کی تاثیر کی بدولت ذوقِ عقیدت حضور ﷺ سے بہرہ یاب ہوتے رہیں۔ صاحبو! آج انہیں دیکھ لو، اپنی نگاہوں میں سمیٹ لو۔ قبل اس کے یہ حسین عہد حال پر ملال ماضی میں تبدیل ہو جائے، نظیر لدھیانوی کی صحبت کو غنیمت جانو۔ کہیں سے آبِ بقائے دوام ڈھونڈ لو کہ تقدیر کا قاضی ہر آن ہمیں یہ پیغام دے رہا ہے کہ

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی

☆......☆......☆

کاروانِ نعت کا ممتاز رُکن

راجہ رشید محمود

کاروانِ مدحت نگارانِ رسول کریم ﷺ بلاشبہ تاریخ عالمِ انسانی کا سب سے زیادہ خوش بخت قافلہ ہے۔ یہ وہی کاروانِ عشق و سرمستی ہے جو ازل کی صبح سعید کی تجلیات سمیٹتا ہوا ابد کی آفاقی ساعتوں کی جانب رواں دواں ہے۔ لامتناہی مدت پر محیط یہ قافلہ جذباتِ ذوق وشوق کی رفعتیں سمیٹتا ہوا مسلسل آگے کو بڑھ رہا ہے۔ یہ وہی کاروانِ شوق ہے کہ جس کی رفتار کبھی کم یا مدہم نہیں ہونے پائی۔ اس قافلے کا ہر مسافر شوقِ بے کراں سے سرشار اور محبتِ رسول ﷺ سے بے قرار ہے۔ اس قافلے نے پڑاؤ یا قیام کی مصلحتیں نہیں سیکھیں بلکہ ہر آنے والا دور اس قافلے کی تیز رفتاری میں پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے مظاہر دیکھ رہا ہوتا ہے۔ فصلِ گل ولالہ اور بہار وخزاں کے تصورات سے بے نیاز اس قافلے کے قدموں کی چاپ سے شبستانِ وجود لرزتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہر آن ہر ساعت، ہر لحہ عقیدتوں کی سوغات بانٹتا ہوا یہ قافلہ گنبدِ خضریٰ اور مکین گنبدِ خضریٰ کے سعادت آفریں تصورات میں کھویا ہوا جاودانی نقوش ثبت کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔

اگرچہ اس قافلہءجذب وشوق کا ہر رکن محترم اور وجہِ صد افتخار ہے لیکن صدیوں کے تسلسل میں سفر کرنے والے اس قافلے میں بعض سعید بخت مسافروں کی آوازیں دوسروں کی نسبت کہیں زیادہ بلند آہنگ اور پرتاثیر لہجے کی غماز محسوس ہونے لگتی ہیں۔ ان آوازوں کے حسنِ تاثیر اور پرکشش لب ولہجہ کو دیکھ کر اولین احساس اُبھرتا ہے کہ یہ آوازیں ان حدی خوانوں کی ہیں جو اس کاروانِ شوق کی رفتار کو تیز سے تیز تر کرنے کے لئے دوسروں کی نسبت کہیں زیادہ دلکش لَے میں نغماتِ حُبِ رسول ﷺ الاپ رہے ہیں۔ حسان بن ثابتؓ، کعب بن زبیرؓ، امام بوصیریؒ، عبدالرحمٰن جامی، قدسی، کرامت علی شہیدی، محسن کاکوروی، احمد رضا خاں، علامہ اقبال، ظفر علی خاں یہ سب حدی خوان ہی تو ہیں جنہوں نے مختلف ادوار میں عقیدتوں کی کہکشاں لٹائی اور مدحت وتوصیف مصطفےٰ ﷺ کی خوشبو پھیلائی ہے۔ ان حدی خوانوں نے اس کاروانِ مدحت وثنا کے مسافروں کی منزل پیمائی کے نئے نئے اسلوب بخشے ہیں۔ عہدِ حاضر کے مدحت نگار منزلِ شوق کی جانب سفر

کرتے ہوئے ان حدی خوانوں کی آوازوں سے ذہن وفکر کی بالیدگی کا اہتمام کر رہے ہیں۔

اگرچہ ہر دور دورِ نعت ہے لیکن عصرِ حاضر کے شعراء جتنی بڑی تعداد میں اس صنفِ اُدب کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اس کا تذکرہ ایمان آفریں بھی ہے اور باعث اعزاز بھی، کتنے ہی سربلند نام ہیں جو اپنے موثر وجود کا احساس دلا رہے ہیں لیکن ایسے شعراء کہ جنہوں نے اوائلِ عمر سے نعت کہنی شروع کی اور آج تک مسلسل کہہ رہے ہیں اور اس دوران میں انہیں کسی دوسری صنفِ شاعری نے اپنے طلسم کا اسیر نہیں بنایا ان کی تعداد بہت کم ہے۔ ان میں سے ایک نام راجہ رشید محمود کا ہے جو ایک طویل مدت سے کوچۂ نعت سے آشنائی کا حق ادا کر رہے ہیں۔ راجہ رشید محمود نے شعر گوئی کی ابتدا صنفِ نعت سے کی اور پھر ہمیشہ کے لئے اسی کوچۂ مدحت وثنا کے ہو رہے۔ ان کا کلام مدتوں سے وطنِ عزیز کے قابل قدر رسائل و جرائد میں شائع ہو رہا ہے اور اب تک ان کے دو نعتیہ مجموعے، ''وَرَفَعنَا لَکَ ذِکرَکَ'' اور ''حدیث شوق'' کے عنوانات سے شائع ہو چکے ہیں۔ راجہ رشید محمود کوچۂ مدحت و نعت مصطفےٰ ﷺ سے اپنی دائمی وابستگی پر از حد نازاں ہیں۔ ان کے نعتیہ اشعار میں جابجا اس افتخار کی جگمگاہٹ دکھائی دیتی ہے۔

میرا فکر و فن نبیؐ کے ذکر تک محدود ہے
خالقِ کونین کا مجھ پر کرم ہے جود ہے

......☆☆......

مجھ پہ ہے محمودؔ سرکارِ دو عالم کا کرم
نعت گو ہوں آپ کی چشمِ عنایت کے سبب

......☆☆......

پائے گا بارگاہِ رسالت سے ہر مراد
محمودؔ کی طرح کوئی مدحت سرا تو ہو

......☆☆......

مجھے محمودؔ احساسِ تفاخر کیوں نہ ہو دل میں
کہ آئی میرے حصے میں محمد ﷺ کی ثنا خوانی
جب سے ذوق شاعری محمودؔ کو حاصل ہوا
آپ کی مدحت ہے موضوعِ سخن شاہِ زمن

سنتِ ربّ العلیٰ ہے وجہِ اطمینان قلب
نعت کہتا ہوں تو میں رہتا ہوں کیسا مطمئن
نعت میں محمودؔ جب میں خامہ فرسا ہو گیا
حرف خوش ہیں لفظ شیریں ہیں تو معنی مطمئن

نعت وہ ذریعہ اظہار ہے جس کی بدولت عشاقِ احمد مختار ﷺ کو اپنے آقا و مولا کی مدحت کا موقع میسر آتا ہے۔ شعراء کو نعتِ رسول ﷺ کی بدولت اپنے جذبات قلبی کو شاعری کے موزوں قالب میں ڈھالنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ نعت فی الحقیقت صفت وثنائے مصطفوی ﷺ کا احسن ترین ذریعہ ہے صفت وثنائے رسول مقبول ﷺ خدا کو بھی عزیز ہے اور بندگان خدا کو بھی، فرشتوں کو بھی مرغوب ہے اور حور و غلمان کو بھی۔ ایک صاحبِ ایمان نعتِ رسول پیش کر کے جہاں اپنے محسوسات حضور ﷺ کی نذر کرتا ہے وہاں وہ اس افتخار سے بھی سرشار ہوتا ہے کہ نعت کہہ کر وہ فقط ملائکہ ہی کی تقلید نہیں کر رہا بلکہ سنتِ خداوندی بھی ادا کر رہا ہے۔ نعت کی بدولت ایمان کو حضور ﷺ کے مقاماتِ قدسیہ سے آگاہی اور آپ کی تعلیمات کی پیروی کا سلیقہ بھی عطا ہوتا ہے۔ راجہ رشید محمود ثنائے رسول ﷺ کو ثنائے خدا کا مصداق قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے بے مثال حسن صورت و سیرت کو خراجِ عقیدت پیش کر کے ہی حضور ﷺ کے خالقِ اکبر کی ثنا کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔ رشید محمودؔ کے اشعار میں مدحت مصطفےٰ ﷺ کی قدر و منزلت دیکھئے۔

نعت ہے بے دینی والحاد کے سم کا علاج
یہ دوا ہے ذہن کے امراضِ پیہم کا علاج
آپ کی مدحت میں ہے خوشنودی ربّ العلےٰ
آپ کی سنت میں ہے دردِ دو عالم کا علاج

......☆☆......

ہم کھولتے ہیں راز کہ کس سے ہے کیا مراد
نعت رسولؐ سے ہے ثنائے خدا مراد
مدّاحیٔ نبیؐ کو کیا جس نے اختیار
وہ شخص کامگار ہے وہ شخص بامراد

......☆☆......

جب نعت سے تطہیرِ خیالات ہوئی تھی
پھر جا کے کہیں حمد و مناجات ہوئی تھی

حضور اکرم ﷺ اس کائنات میں تعلیماتِ قدسیہ کی صورت میں جو سرچشمۂ ہدایت لے کر آئے تھے اس نے چند ہی برسوں میں عرب معاشرہ اور پھر پوری دنیا میں حیرت انگیز ایمانی انقلاب برپا کر دیا تھا۔ آپ صورت و سیرت کے لحاظ سے بے مثال اور بے نظیر ہیں۔ ربِ دو عالم نے آپ کی شخصیت میں ازل سے ابد تک کے جملہ محاسن سمو دیئے ہیں۔ آپ کی تعلیمات برحق اور آپ کے جملہ ارشادات قوانینِ فطرت کی صورت اٹل ہیں۔ قرآن حکیم آپ کی عظمتوں کا شاہد اور گواہ ہے۔ آپ نے اپنی جاودانی سیرت کی خوشبو بکھیر کر جس طرح زمانے بھر کو معطر کر دیا تھا۔ اس کا تذکرہ فکر آفریں بھی ہے اور فرحت انگیز بھی۔ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ کے بقول جس نے سیرتِ حضور ﷺ کی شان دیکھنی ہو وہ قرآن حکیم کا مطالعہ کرے۔ قرآنی آیات کے پس منظر سے حضور ﷺ کی سیرت مبارکہ طلعتیں بکھیرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ حضور ﷺ کی ذات والا صفات پر لکھنے کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک آپ کے زندۂ جاوید کردار کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ آپ کا خلق حسیں، آپ کی رحمتِ بے کراں، آپ کی غریب نوازی، الفقر فخری فرما کر دنیا بھر کے ٹھکرائے ہوئے خستہ جانوں کو اپنا کہہ کر سینے سے لگانا، حق و صداقت کی پاسداری، بے مثال قیادت، لازوال سیادت، صلح و جنگ کے اُصولوں کی ترتیب، عفو و درگزر کی بارانِ عام، سماجی زندگی کی تابانیاں، سیاسی معاملہ بندی، آدابِ حکومت، خدوخال معیشت غرضیکہ آپ کی سیرت عالیہ کا ورق ورق ہر عہد کے مورخین کے لئے روحانی دلچسپی اور جذباتی وابستگی کا مظہر رہا ہے۔ ایک صاحب ایمان مدحت نگار کی حیثیت سے رشید محمود نے اپنے آقا و مولا کی مقدس سیرت کے مختلف گوشوں کا سیر حاصل مطالعہ کیا ہے اور جہاں بھی موقعہ میسر آیا ہے جی بھر کر خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ راجہ رشید محمود اس ادراک سے بہرہ ور ہیں کہ آج کے دور میں جبکہ ہم چاروں طرف سے روشنی لے کر ہی قلب و نظر کو ایمانی جگمگاہٹ عطا کرنے کا اہتمام کر سکتے ہیں۔ ان کو احساس ہے یہ فقط سیرت محمدی ﷺ ہی کی جلوہ گری تھی کہ راہزن راہبر بن گئے بت پرستوں کو توحید خداوندی کا شعور عطا ہوا کمزوروں کی عزت سے کھیلنے والے اقوامِ عالم کی عظمت کے پاسبان بن گئے، جادۂ حق سے غیر آشنا انسان صراطِ مستقیم پر گامزن ہو گئے۔ الحمد اللہ راجہ رشید محمود اس حقیقت سے بہرہ ور ہیں کہ آج کے مسائل کی تلخیوں سے فقط اس صورت نجات حاصل ہو سکتی ہے کہ ہم حضور ﷺ کے

کردار کے ایک ایک لمحہ کو حاصل زیست تصور کرتے ہوئے اس سے فکری روشنی اور عملی راہنمائی حاصل کریں۔ رشید محمود سیرت رسول ﷺ کی سربلندیوں کو کس طور مدنظر رکھتے ہیں ملاحظہ کیجئے۔

ہے خلق و عدل و مروّت کا باغ ہی ایسا
مدام جس جگہ مہکے حضورؐ کی سیرت
جہاں کو کفر و ضلالت کے گھپ اندھیروں سے
نکال لائی ہے کب سے حضورؐ کی سیرت
انہی پہ چل کے حیاتِ دوام پاؤ گے
دکھا گئی ہے جو رستے حضورؐ کی سیرت
خدا کی ذات کو پہچاننا ہے ناممکن
نظر میں جب نہ ہو پہلے حضورؐ کی سیرت
رہِ خلوص کے جتنے ہیں راہوار ان کو
چراغِ طور ہے مرے حضورؐ کی سیرت

حضور ﷺ سرورِ کائنات فخر موجودات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرتِ اقدس تک رسائی پانے کا پہلا ذریعہ آپ کے وہ فرمودات ہیں جو آپ کی زبانِ اقدس سے ادا ہوئے۔ آپ کی تعلیمات نے بے شمار انسانوں کے دلوں میں یوں گھر کیا کہ پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آپ کی غلامی کو اپنے لئے سندِ اعزاز تصور کرنے لگے۔ حضور ﷺ کا اُسوۂ حسنہ کہ جسے خدا نے لَقَد کَانَ لَکُم فِی رسُولِ اللّٰہ اُسوۃٌ حَسَنہ فرما کر ہر عہد کے انسانوں کے لئے نمونۂ عمل قرار دیا ہے۔ ایک ایسے مینارۂ ایمان و یقین کی صورت اختیار کر گیا کہ جس سے پھوٹنے والی کرنیں ظلمت کدوں میں اُجالے لٹا رہی ہیں۔ اب ہم راجہ رشید محمود کے عنبر بار قلم سے پھوٹنے والے نعتیہ اشعار میں تعلیمات محبوبِ خدا ﷺ کی سربلندیاں دیکھتے ہیں۔

میرے آقا نے دیا ہے وہ اخوت کا سبق
غیر تھے سب ہو گئے ہیں آج ہم تم آشنا
آپ نے تہذیب انساں کو عطا کر دی زباں
جس قدر تھے گنگ وہ سب ہیں تکلم آشنا

......☆☆......

توڑنے کے لئے آئے تھے خدا کے محبوب
اہل دنیا نے جو معبود بنائے پتھر
ان کے اصحاب نے اپنایا مشقت کو اگر
بادشاہِ دوجہاں نے بھی اُٹھائے پتھر

......☆☆......

توڑ دی محکومئی انساں کی زنجیر آپ نے
آپ سے ہم کو نصیب آزادیء کامل ہوئی
سرورِ کون ومکاں کی اک نگاہِ لطف سے
آشنائے رازِ اِلاّ اللہ مشتِ گل ہوئی

......☆☆......

زندانِ حرص وآز میں محبوس تھی حیات
آقا حضورؐ آئے تو اس کو کیا رہا
خوں کے سمندروں میں اُترے ہوئے تھے لوگ
سرکار کے طفیل ہوئے مہر آشنا
مظلوم سر اُٹھا کے چلا آپ کے طفیل
عفریتِ ظلم و جور جو تھا سرنگوں ہوا

......☆☆......

آپ کے فیض سے ہم خلق میں اشرف ٹھہرے
آپ کے نور سے یہ خاک کا پیکر چمکے
دن پہ بھی رات کا منظر تھا مسلّط پہلے
روئے پُرنور سے جب صبح کے تیور چمکے

راجہ رشید محمود نعت کے فنی بانکپن سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگرچہ نعت ہر صنفِ سخن میں کہی جاسکتی ہے اور بے شمار نعت گوشعراء کی شعری کاوشیں اس امر پر شاہد ہیں۔ لیکن نعت کو جو سوز وگداز، ذوق وشوق اور وارفتگی کا اظہار غزل کے پیرایے میں عطا ہوتا ہے وہ کسی اور صنفِ سخن میں میسر نہیں آتا۔ اس لئے نامور نعت گوشعراء کا جو کلام آج زبان زدِعام ہے اس میں سے بیشتر

اندازِ غزل لئے ہوئے ہے۔ قافیہ اور ردیف کی پابندی اور بحر کی موزونیت سے نعتیہ کلام جاودانی تب وتاب سے ہمکنار ہونے لگتا ہے۔ حسنِ تغزل کی بدولت جذبے نکھرتے، احساسات مچلتے اور تصورات صداقتوں کے قالب میں ڈھلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ حسنِ تغزل کی بدولت گنگ جذبات قوتِ گویائی پاتے اور بے جان الفاظ تکلم کا لبادہ اُوڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رشید محمود اس حقیقت سے بھی باخبر ہیں کہ یہ حسن تغزل کسی دوکانِ آئینہ ساز سے مستعار نہیں ملتا بلکہ یہ تو دل کی گہرائیوں سے اُبھرتا اور ذوق وشوق کی پہنائیوں سے بحرِ بے کراں کی صورت نمودار ہوتا ہے۔ اس کی توفیق ارادتاً ارزاں نہیں ہوتی بلکہ یہ تو عشق وعقیدتِ رسول ﷺ کی رفعتوں سے اپنا خراج حاصل کرتا ہے۔ رشید محمود کا حسنِ تغزل کسی مجازی محبوب کی زلفوں کے پیچ وخم کا اسیر نہیں ہے اور نہ ہی کسی حسن فانی کی طلسم کاریوں کا مقید ہے۔ بلکہ انہوں نے عشق وعقیدت کی پہنائیوں سے اُبھرنے والے شعری ذوق کا رشتہ اس ہستی ءوالا صفات سے استوار کیا ہے جو محبوب ومطلوبِ کائنات ہے۔ جس کے چہرے کی تابانیوں سے مہرو ماہ ضیائیں مستعار لیتے اور جس کے نقوشِ قدم سے کہکشاں کو اذنِ وجود عطا ہوتا ہے۔ جب محبوبِ فکر ونظر وہ ذات ہو جس کے لئے کتاب ہستی تصنیف ہوتی ہے تو پھر حسنِ تغزل اپنی معراج کو کیوں نہ پہنچے گا۔ اسی حسنِ تغزل کی ایک جھلک نذرِ قارئین ہے۔

ذکرِ دنیا میں ترستے تھے جو شبنم کے لئے
خشک لب وہ مدحِ آقا میں ہیں قلزم آشنا
رات ان آنکھوں میں ہیں ذرّاتِ کوئے مصطفیٰ
میرا دامانِ نظر ہے ماہ و انجم آشنا

......☆☆......

آنکھیں ہیں ان کی یاد کے پانی سے باوضو
پہلی یہ شق شرائطِ ذوقِ نظر کی ہے
گہرے سمندروں میں ملے ساحلِ مراد
یادِ رسولؐ پاک میں خواہش گہر کی ہے
خیر البشر کے عشق وعقیدت کی لاگ ہو
لاریب احتیاج یہ اوجِ بشر کی ہے

کیا اور کوئی چہرہ سمائے گا نظر میں
سرکار کا ہے دل پہ سراپا اثر انداز

جب آپ اُمت کا استغاثہ حضورﷺ کے دربار میں پیش کرتے ہیں تو ایک دردمند مسلمان ہونے کے ناتے ان کی نظر ملکی مسائل پر بھی ہے اور پوری ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل کی شدت پر بھی، جس طرح ایک قطرہ کتنا بھی معمولی ہو آخر بحر آشنا ہوتا ہے اسی طرح رشید محمود اپنی ذاتِ تنہا میں اپنے مسائل کے حصار میں گھر کر بھی خود کو ملتِ اسلامیہ کا ایک فرد تصور کرتے ہیں۔ ایسا فرد جو پوری اُمت اسلام کے آلام و مصائب کو ذاتی رنج و غم کے حوالے سے دیکھتا ہے۔ اس لئے یہ دربار حضورﷺ سرورِ کائنات میں فسانۂ غم سناتے ہیں۔ ان کی فریاد میں کہیں کہیں حالی کی اس فریاد کا حسن جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

اپنے آلام و مصائب کی داستان بارگاہِ سرورِ عالمﷺ میں پیش کرتے ہوئے رشید محمود مسلسل اس احساس سے سرشار ہیں کہ اگر میرے دردوسوز نے حضورﷺ کی رحمت بے کراں تک رسائی حاصل کر لی اور آپ مہربان ہو گئے تو پھر رنج و غم کی تاریکیاں چھٹ جائیں گی، آلام و مصائب کے بادل چھٹ جائیں گے۔ مصائب خواہ قومی ہیں یا انفرادی یکا یک پیچھا چھوڑ دیں گے اور حالات کے اُفق پر عظمت اسلام کا روشن سویرا طلوع ہوگا۔

آپ کی چشم کرم سے مندمل ہو جائیں گے
جسمِ ملت پر اگرچہ زخم ہیں کاری بہت
اس کا دامن پیار کے پھولوں سے پھر بھر دیجئے
آپ کو اُمت ہمیشہ ہی سے ہے پیاری بہت
میرے آقا دیکھئے اُمت کا اب کیا حال ہے
سرد ہے جذبہ عمل کا، گرم گفتاری بہت
نام لیوا آپ کے ہیں کیجئے اب سرفراز
آہ اقوامِ جہاں میں ہو چکی خواری بہت

......☆☆......

اپنی اُمت پر نگاہِ لطف و رحمت کیجئے
ہے ستم ایجاد چرغِ نیلگوں میرے حضورؐ

......☆☆......

برہنہ پاہوں پیاسا پھر رہا ہوں دشتِ ہستی میں
خدا کے واسطے ابرِ کرم سے ہو مدد آقا
دھنک کے رنگ بخشیں گے طراوت میری آنکھوں کو
جو اشکوں کے سمندر سے اُٹھے گا جزرومد آقا

......☆☆......

حالت چھپی ہوئی کوئی سرکار سے نہیں
دنیا میں کیفیت جو یہ سب شور و شر کی ہے
حدّت میں معصیت کی جھلتے ہیں رات دن
خواہش جو ہے تو سایۂ دیوار و در کی ہے
ایسے میں اور کسی سے مدد ہم طلب کریں
محمود ان کے در سے تمنا ظفر کی ہے

عشقِ سرورِ کونین ﷺ کی روشنی سے احساسات کو منور کرنے والے ہر صاحب نظر کی یہی آرزو ہوا کرتی ہے کہ اسے حضور ﷺ کا دیدار میسر آ جائے۔ اگر یہ سعادت میسر آنی ممکن نہیں ہے تو پھر گنبدِ خضریٰ کی چھاؤں میں ہی زندگی گزارنے کا اِذن مل جائے۔ نعت گو شاعر اس ضمن میں کبھی تو حضرت حسانؓ بن ثابت کی سرفرازیوں کا تصور کرتا ہے اور کبھی حضرت کعب بن زہیرؓ پر ہونے والی نوازشاتِ نبوی کے احساس سے اپنی سعید بختی کی اُمید استوار کرنے لگتا ہے کبھی اسے امام بصیریؒ کو عطا ہونے والی چادرِ اقدس کا خیال آتا ہے اور کبھی مولانا جامیؒ کی شادکامی کا تذکرہ اس کا حوصلہ بندھانے لگتا ہے۔ مدحت نگار نے دیدِ حضور ﷺ یا ارضِ نبی ﷺ میں زندگی گزارنے کی جس منزل کا تصور حاصلِ آرزو بنا رکھا ہوتا ہے وہ بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہے اور پھر جسے میسر آ جائے وہ پھر عالمِ ہوش میں کب رہتا ہے کہ دوسروں تک اپنی شادمانی کے گلفشاں تذکرے پہنچا سکے۔ اسی لئے جب تک یہ مدّعائے مقصود حاصل نہیں ہوتا اس وقت تک ہجر و فراق اس صاحب نظر کا مقدر بنے رہتے ہیں۔

رشید محمود نے بھی اس خاورِ حجاز ﷺ کی تابانیوں کو دل و جان میں بسا رکھا ہے۔ ان کا حقیقی مقصد حیات حصول خوشنودیِ رسول ﷺ ہے۔ ان کا مدعائے عشق نگہِ الطاف حضور ﷺ ہے۔ ان کے تصورات تجلیات حسنِ حضور ﷺ سے آباد ہیں تو احساسات سیرتِ مصطفوی ﷺ کی جلوہ افروزیوں سے جگمگا رہے ہیں۔ ان کے نعتیہ مجموعوں کے مطالعہ سے قدم قدم پر یہی احساس اُبھرتا ہے کہ یہ اپنے آقا و مولا کی حیاتِ مقدسہ کے ہر پہلو کو حاصل ایمان بنائے ہوئے ہیں۔ جب راہوار عشق منزل شوق کی جانب آگے بڑھتا ہے تو انکے قلب و نظر سے بھی حضور سرورِ کائنات ﷺ کے نورانی جلوؤں سے مستنیر ہونے کی آرزو اُبھرتی ہے۔ مسلمان اسی آرزو میں جینا اور اسی آرزو میں مرنا عظمتِ ایمان تصور کرتا ہے۔ رشید محمود کے خلوت کدۂ حیات سے بھی یہی صدا اُبھر رہی ہے کہ حضور ﷺ اپنے غلام کو نواز دیجئے۔ اپنے درِ اقدس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بلا لیجئے کہ زندگی پھر وہیں پر تمام ہو جائے لیکن جب یہ سعید ساعتیں میسر نہیں آتیں تو مہجوری کی شدتیں رشید محمود کے قلم سے عقیدت و وارفتگی کا خراج لینے لگتی ہیں۔

فرقت و مہجوری کے مضامین کو گو شعراء نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ فرقت و مہجوری کا ہی فیضان ہوتا ہے کہ مہجوری و دُوری کی آتش شوق میں جلنے والا مسِ خام سے کندن بننے لگتا ہے اور صدفِ حیات میں تڑپنے والے قطرۂ ناچیز کو گہر کی آب و تاب میسر آنے لگتی ہے۔ محبت رسول ﷺ کو اعزازِ زندگی بنانے والے کے لئے یہ مہجوری کتنی حسرت آفریں کیوں نہ ہو بہر حال اس احساس سے ضرور سرشار کر جاتی ہیں کہ اس کا کام فقط اظہارِ مہجوری ہی ہے۔ اِذن باریابی عطا کرنا آقا کا کام ہے اور یقیناً وہ ایک دن ضرور اپنے چاہنے والے کو گوہر مراد عطا فرمائیں گے۔ رشید محمود بھی اس توقع پر مہجوری کی تلخیوں میں حضور ﷺ کی نوازشات کی جھلک دیکھ رہے ہیں۔ یہ مہجوری ان کے لئے کتنی ہی ناقابل برداشت کیوں نہ ہو۔ ان کے لئے اُمید الطاف حضور ﷺ کا سلسلہ بھی استوار کر رہی ہے کہ جس طرح ہر شب تاریک کے بعد دن کے اُجالے بکھرتے ہیں اس طرح یہ شب مہجوری بھی ایک دن ان کے لئے دیارِ رسول ﷺ کی زیارت سے سرفراز کئے جانے کا باعث بنے گی۔

گنبدِ خضریٰ سے دُوری کا الم کچھ کم نہیں
کیوں نہ ہو آنکھوں سے آخر اشک افشانی شروع
بعد طیبہ میں ہے سیلِ آب محسوسات کا
ہوگئی جذبات کے طوفاں سے طغیانی شروع

☆☆

دل کو ہے آنحضورؐ کی یادوں سے واسطہ
یہ بات ایک دن کی نہیں عمر بھر کی ہے
اک بار تو مجھے بھی مدینے بلایئے
یہ التجا مرے دلِ حسرت اثر کی ہے

☆☆

غمِ فراق دیارِ حبیب کے باعث
ہجومِ اشک رواں چشمِ تر میں رہتا ہے
مری نظر میں نم آلود سے دھند لکے ہیں
کہ دل فراقِ نبیؐ کے اثر میں رہتا ہے

☆☆

خامۂ احساس سے لکھتا ہوں مصحف ہجر کا
چشمِ پُرخوں سے ہوئی مرقوم یہ دل کی کتاب
خواہشِ دید نبیؐ دل میں جواں رکھتا ہوں میں
رنگ لے آئے گا آخر ان ارادوں کا شباب

☆☆

یا رب ذوالجلال دعا کو اثر ملے
وقفِ شبِ فراق نبیؐ ہوں سحر ملے

رشید محمود غمِ ہجر مدینہ میں کھو چکے ہیں کیونکہ یہ غم انہیں ہر پل ہر ساعت یادِ حضور ﷺ اور پھر ذکرِ حضور ﷺ کی سعادت بخشتا رہتا ہے۔ ہجر مدینہ کی تلخیاں آہستہ آہستہ ان کے لئے شادکامی کا ذریعہ بنتی جارہی ہیں کہ ان کے طفیل انہیں یادِ رسول کریم ﷺ سے ہٹ کر کسی اور طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ہے یہی مجبوری ان کے لئے لذت آفریں ہو چکی ہے اور حق تو یہ ہے کہ یہی عشق کا کمال ہے۔ رشید محمود دعا گو ہیں کہ یہ لذتِ غمِ ہجر مدینہ تمام عشاق مصطفےٰ ﷺ کو نصیب ہو جائے۔

دل میرا غمِ ہجرِ مدینہ میں مگن ہے
اللہ کرے سب پہ ہو لذتِ غم عام

محمود کہ ہے بندۂ خاص اپنے نبیؐ کا
ذکرِ شہِ ابرار ہی کرتا ہے رقم عام

جب مجبوری مقدر بن جائے تو پھر چاہنے والا اپنے محبوب کی یاد سے فکر ونظر کی خلوتیں آباد کر کے سرشاری وسرفرازی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے ہر ساعت سرورِ کائنات فخرِ موجودات ﷺ کی عنبر بار یادوں سے اپنے جذبات کو مہکائے رکھتا ہے۔ حضور ﷺ کی باتیں، حضور ﷺ کی یادیں حضور ﷺ کی صورت، حضور ﷺ کی سیرت غرضیکہ حضور ﷺ کی زندگی کا ایک ایک ورق اس کے لیے جمالِ آرزو بن جاتا ہے۔ رشید محمودؔ بھی محبوب خدا ﷺ کی حسین ودلآویز یادوں سے اپنے تصوّرات کو آباد رکھے ہوئے ہیں۔ حضور ﷺ کی گفتار کی شیرینی، آپ کے کردار کی دلنوازی، آپ کی حیاتِ مقدسہ کی جلوہ کاریاں ﷺ، آپ کی رحمت بے کراں، آپ کے فیوضِ لامتناہی، آپ کے شہرمقدس کی رعنائیاں، آپ کے روضۂ اقدس کی تابانیاں یہ سب رشید محمودؔ کی یاد کا حصہ بن کر انہیں زندہ رہنے کا سلیقہ عطا کرتے ہیں۔ حضور محمد مصطفےٰ ﷺ کی روشن روشن یادیں ان کے دل وجان کو بھی منور کرتی ہیں اور انہیں عشق مصطفےٰ ﷺ کی عظمتوں سے بھی ہمکنار کرتی ہیں۔ یادِ حضور ﷺ کے ضمن میں چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

یادِ سرکارِ دو عالم زیست کا حاصل ہوئی
مدحِ محبوبِ خدا وجہِ قرارِ دل ہوئی
اوّل اوّل روح وجاں پر تھا تلطف آپ کا
آخر آخر یاد آقا کی سراپا دل ہوئی
عافیت محمودؔ پائی ہے نبیؐ کے ذکر میں
نعت ہی سے زندگی میری کسی قابل ہوئی

......☆☆......

دل میں یادِ نبیؐ در آئی ہے
وا ہوا چشمِ نم کا دروازہ

......☆☆......

دن رات ہے حضوریٔ طیبہ کی کیفیت
اس کیفیت کو چشمِ تماشا سے کیا غرض

ذکرِ نبیؐ سے حال مرا مستنیر ہے
ماضی کی فکر کیا، غمِ فردا سے کیا غرض

شاعری کی ایک صفتِ خاص وہ مضمون آفرینی ہے جس کی بدولت شاعر اپنے مدعا و مفہوم کو ہر بار اُچھوتا رنگ دے کر بیان کرتا ہے۔ دوسری اصناف شاعری کی نسبت مضمون آفرینی صنف غزل میں اور ہی رنگ دکھاتی ہے۔ جدید نعت چونکہ غزل کے قالب میں قافیہ و ردیف کی پابند ہو کر قبولیت عام کی مصداق ٹھہر چکی ہے اس لئے نعتیہ کلام میں مضمون آفرینی سونے پہ سہاگہ ثابت ہوا کرتی ہے۔ ''حدیثِ شوق'' اور پھر'' ورفعنا لک ذکرک'' میں رشید محمود کے قلم عقیدت رقم سے مضمون آفرینی کی نہایت بلند پایہ مثالیں قلوب واذہان کو معتبر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

علامہ اقبال نے ایک مقام پر رب دو عالم سے التجا کرتے ہوئے کہا تھا کہ خدایا روزِ محشر تو میرا حساب حضور نبی کریم ﷺ سے چھپا کر لینا کہ اپنی گنہگاریوں کی بنا پر فرطِ ندامت سے میں ان کا سامنا نہیں کر سکوں گا۔

مکن رسوا حضورِ خواجہ ما را
حسابِ من زِ چشمِ اُو نہاں گیر

اسی مضمون کو رشید محمود یوں بیان کرتے ہیں۔

اور تو فردِ عمل کی بات کیا جو ہے سو ہے
دیکھ لیں گے سرورِ کونین ڈر اتنا تو ہے

مضمون آفرینی کی چند اور مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

خواب میں سرکارِ والا کی زیارت کیا ہوئی
آنکھ روشن ، قلب ہے مسرور ، چہرہ مطمئن
بے سبب اس کی سیہ پوشی نہیں اے دوستو
ہجر طیبہ میں کہاں آغوشِ طیبہ مطمئن

دیں دعائیں مرے آقا نے جو کھائے پتھر
پھول بخشے انہیں جن لوگوں سے کھائے پتھر
نصب آقا نے جو فرمایا خدا کے گھر میں
اہل اسلام کو کیونکر نہ وہ بھائے پتھر

معجزے دیکھ کر سرکار کے مبہوت ہوئے
اہل باطل جو تھے سارے نظر آئے پتھر

......☆☆......

دنیا کی فکر کیا غم عقبیٰ کا ذکر کیا
رحمت کناں یہاں ہیں تو شافع وہاں ہیں آپ
رب ہے رحیم آپ شفیع و کریم ہیں
ہم پر کرم خدا کا ہے اور مہرباں ہیں آپ

......☆☆......

آئے حضورؐ تو شب دیجور میں کھلا
کیا شے ضیا ہے نورِ سحر کس کا نام ہے

تشبیہات واستعارات برمحل تراکیب، بلندیء خیال یہ وہ خصائص ہیں جو شعری حسن کو دوبالا کردیتے ہیں۔ رشید محمود کی نعتوں میں ایک جھلک دیکھئے۔

نہیں کانٹے بیابانِ عرب میں
کھلے ہیں یہ گل و ریحانِ فردوس
گلستانِ عرب کا ایک غنچہ
ہوا ہے رشک صد بستانِ فردوس

......☆☆......

میں نے جب سلجھائی ہیں زلفیں عروسِ نعت کی
گیسوئے تقدیر میں پھر کس طرح خم رہ جائے گا

......☆☆......

پہنچو گے خاکِ راہ گزارِ حضورؐ تک
نکلو گے تم جو کحلِ بصر کی تلاش میں
باغِ حیات گلشن نا آفریدہ تھا
آمد سے ان کی گلِ تر مسکرا اُٹھا
منزل ملی مسافرِ شب ہائے تار کو
یعنی جمالِ صبح ازل کا نزول تھا

......☆☆......

چھینٹے جو ابرِ لطف پیمبر عطا کرے
کیا بحر سے ہے واسطہ دریا سے کیا غرض
دل ہوں سیاہ جن کے تکدّر کی دھوپ سے
نظروں کو ان کی گنبدِ خضریٰ سے کیا غرض

رشید محمود نے جہاں سرکارِ نامدار سید الابرار محمد مصطفےٰ ﷺ کے محاسن قدسیہ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ جہاں آپ کے فضائل و کمالات کو موضوعِ شاعری بنایا ہے، جہاں آپ کی سیرت مقدسہ کی طلعتوں سے قلب و جاں کے نہاں خانوں کو منوّر کیا ہے۔ جہاں آپ کی تعلیمات اور ارشاداتِ عالیہ کی کہکشاں بکھیری ہے۔ جہاں آپ کے فیوض و برکات کا تذکرہ کیا ہے۔ وہاں کس طرح ممکن تھا کہ یہ شاہِ خوبانِ دو عالم کے حسنِ ظاہری اور صورت پاکیزہ کو شعری صلاحیتوں کا خراج پیش نہ کرتے۔ حضور محمد رسول اللہ ﷺ تو خدا اور مخلوقاتِ خدا کے محبوب ہیں۔ قرآن حکیم کے مطالعہ سے آپ کے حسنِ ظاہری کی جلوہ افروزیاں اُبھرتی نظر آتی ہیں۔ آپ کا حسن بے مِثال خدائے کریم کی خلّاقی کا احسن ترین نمونہ ہے اور یہ آپ کے حسنِ ظاہری کا کمال تھا کہ بہت سے متلاشیانِ راہِ صداقت اسے دیکھتے ہی یہ کہتے ہوئے حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے کہ اس قدر حسین چہرہ کسی دروغ گو کا مقدر نہیں بن سکتا۔ گویا آپ کی غیر فانی سیرت کے ساتھ ساتھ آپ کی لاثانی صورت نے بھی تبلیغِ اسلام کے مشن کو آگے بڑھایا ہے۔ رشید محمود کی نعتیہ شاعری میں درجنوں ایسے اشعار ملتے ہیں۔ جن سے حضور ﷺ کے حسنِ ظاہری اور صورتِ اقدس کی پرانوار جھلکیاں ملتی ہیں۔

والضحیٰ ہے چہرۂ پر نور کا عکسِ جمیل
شرح ہے واللیل کی زلفِ معنبر مو بمو
گردشِ دوراں ہے ان کی جنبشِ ابرو کا نام
ان کے جلوؤں سے منور ہے جہانِ رنگ و بو

......☆☆......

اس سے پھر قائم ہوا دنیا میں خوشبو کا نظام
تھا پسینہ آپ کا بوئے گلابِ بزمِ قدس

......☆☆......

ان کی آنکھوں سے بھلا محجوب رہ سکتا ہے کیا
خالق و مالک کو دیکھا ہے جنہوں نے بے حجاب

......☆☆......

برائے بدر بھی ہے اک اشارۂ انگشت
پئے سلامی آقاؐ ہلال ہی تو نہیں

......☆☆......

ظاہر ہوا ہے آیۂ ماینطق سے راز
ہے گفتۂ رسولؐ سے وحیِ خدا مراد

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بڑی بحروں میں بڑے مضامین ادا کئے جا سکتے ہیں حالانکہ یہ بات محض ایک مفروضہ ہے یہ تو کہنے والے کی صلاحیت ہوتی ہے وہ کتنے لفظوں میں کون سی بات کہہ سکتا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تھوڑے لفظوں میں بڑا مفہوم ادا کرنا واقعی کارے دارد والی بات ہوتی ہے۔ کتنے ہی عظیم شعراء کی مثالیں موجود ہیں کہ جنہوں نے سہل ممتنع کا جادو جگاتے ہوئے چھوٹی بحروں میں آسان الفاظ اور تراکیب استعمال کر کے بلند پایہ مضامین ادا کئے ہیں۔ رشید محمود کے نعتیہ مجموعوں میں بھی ایسے بہت سے شعری نمونے نظر آتے ہیں جن سے شاعر کی قدرتِ فکر و فن اور شعری بانکپن اور نعت کے حوالے سے عقیدت کے والہانہ اظہار کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے سادہ لفظوں اور عام فہم تراکیب کا سہارا لے کر اپنا مفہوم و مدعا اس ادبی مہارت اور فنی چابکدستی سے بیان کیا ہے کہ بعض حالتوں میں ان کی استعمال کردہ بڑی بحروں کی نسبت یہ چھوٹی بحریں زیادہ لطف دیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ہم مثال کے طور پر صرف ایک نعت سے چند اشعار پیش کر رہے ہیں۔ اس نعت میں رشید محمود نے دورِ حاضر میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا استغاثہ دربار رسالتمآب ﷺ میں پیش کیا ہے۔

شاہِ کوہ و زمن مرے آقا
زیست کا بانکپن مرے آقا
رحم فرمایئے کہ دورِ جدید
ہے بہت پر فتن مرے آقا
زر کے لات و منات پوجتے ہیں
ہم کہ تھے خیبر شکن مرے آقا

ہر برائی سے ربط ہم کو ہے
بگڑا ایسا چلن مرے آقا
کس کو ناموسِ مصطفیٰؐ کا پاس
کس کو فکرِ وطن مرے آقا
ہم نے کتنے ہی جان جوکھوں سے
جو لیا تھا وطن مرے آقا
بے خبر اس کی سالمیت سے
آج ہیں مطلقاً مرے آقا
آپ کی اک نظر کا طالب ہے
مرا عجزِ سخن مرے آقا

غرضیکہ رشید محمودؔ کی نعتیہ شاعری عقیدت رسول کریم ﷺ کا ایک ایسا گلدستۂ صد رنگ ہے جس میں سجے ہوئے پھول اور کلیاں خوش رنگ بھی ہیں اور عنبر آفریں بھی۔ ان پھولوں میں حسن و جمالِ مصطفویٰ کی جمال افروزیاں بھی ہیں اور تعلیماتِ پاکیزہ کی مہکباریاں بھی۔ یہ گلدستۂ عنبر آفریں جہاں ایک نظر دیکھنے سے مرصّع کاری کا دلآویز نمونہ دکھائی دیتا ہے وہاں قریب جا کر بالا استیعاب مطالعہ کرنے سے اس کی لطافت میں کمی محسوس نہیں ہوتی بلکہ جوں جوں مطالعہ کرتے جائیں عقیدت وارادت کی پھوٹتی ہوئی روشنی اور جذب وشوق کی شدت سے پھوٹتی ہوئی مہک اس کو نکہت و نور کا مصداق بناتی نظر آتی ہے۔ رشید محمودؔ کا قلم جہاں عشق وعقیدت کی سر بلندیوں کو چھوتا ہے۔ وہاں ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' کے پیش نظر ادب واحتیاط کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ ان کی نعتیں محبتِ رسول ﷺ کی عظمتوں سے ہمکنار ہونے کے باجود تعلیماتِ حضور ﷺ کے تقاضوں سے تہی نہیں ہیں۔ محبتِ رسول ﷺ کے فکری وعملی تقاضوں سے باخبر ہونے کی بنا پر رشید محمودؔ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ محبت اپنے ممدوح سراپا سے روحانی وفکری وابستگی کے ساتھ ساتھ اس کی سیرت اور سنت سے غیر مشروط اور غیر متزلزل وابستگی بھی مانگتی ہے۔

اس لئے رشید محمودؔ کی نعتوں میں مقام مصطفےٰ ﷺ کی رفعتیں بھی ہیں اور نظام مصطفےٰ ﷺ کے روشن پہلوؤں کی طرف واضح اشارے بھی، آپ کے فضائل وکمالات کا تذکرہ بھی ہے اور آپ کے عادات وخصائل کا ذکر بھی آپ کے حسنِ صورت کی تجلیات بھی ہیں اور آپ کے کمالِ

سیرت کی جلوہ افروزیاں بھی۔ آپ کے نورِ ازلی کی لمعہ افشانیاں بھی ہیں اور آپ کی بے مثال بشریت کی سنتِ عالیہ کی تابانیاں بھی۔ ذاتی حوالے سے اپنے آلامِ فرقت کی داستاں بھی ہے اور ملّتِ اسلامیہ کے پرآشوب دورحال کا نوحہء غم بھی۔ رنگِ تغزل سے چھلکتے ہوئے ذوق وشوق کے غنچے بھی ہیں اور اسلام کی جاودانی تعلیمات سے بہاراں بہاراں شگوفے بھی۔ ان کی جملہ نعتوں کے تفصیلی مطالعے سے مرکزی تاثر یہی اُبھرتا ہے کہ رشید محمودؔ نے لازوال حسن وجمال سرورِ کونین کی جلوہ پاشیوں میں کھو کر ایک لمحہ کے لئے بھی اس حقیقت کو نگاہوں سے اُوجھل نہیں ہونے دیا کہ آقائے دو عالم ﷺ کی تشریف فرمائی کا مقصدِ اولیٰ جملہ اوصافِ انسانی سے بہرہ ور ایک عالمگیر اسلامی معاشرے کو وجود میں لانا تھا۔ ہم اپنی اس تحریر کا اختتام رشید محمودؔ کے ان اشعار پر کر رہے ہیں جن سے ان کی بلند فکری اور ایمانی پختگی کا اظہار ہو رہا ہے۔

حبِّ پیغمبرؐ پہ ہے حبِّ خدا کی انحصار
میرے آقاؐ کی اطاعت طاعتِ معبود ہے
شرطِ ایماں ہے کہ اقرارِ رسالت بھی کرو
صرف اقرارِ اُلوہیت یہاں بے سود ہے
ہم زمانے میں رہیں گے خستہ حال وخوار وزار
پیروی سیرت کی ہم میں جب تلک مفقود ہے

☆☆☆

ساغرِ کوثر کا تمنائی

قمر یزدانی

دنیا میں جو گلستان کھلتا ہے ایک روز نذرِ خزاں ہو جاتا ہے۔ مہکنے والا ہر پھول ایک روز مرجھا جاتا ہے مگر مدحتِ حضور ﷺ کا گلشن اس قدر سدا بہار ہے کہ اس پر کبھی خزاں نہ چھا سکے گی۔ ازل ہو یا ابد یہ گلشن ہر دور میں فصلِ گل ولالہ کے تصورات سے بے نیاز بہارِ جاوداں کا مسکن رہا ہے۔ اس گلشن بے خزاں کی عنبر بار فضاؤں میں چند لمحے گزارتے ہی غیر معمولی روحانی انبساط کا احساس ہونے لگتا ہے یہاں کی کلیوں، غنچوں اور گلہائے تازہ کی خوشبو اس قدر تاثر انگیز ہے کہ احساسات بے اختیار اس کی دائمی تاثیر سے معنبر ہونے لگتے ہیں۔ سیدنا حسان بن ثابتؓ سے لے کر عصرِ حاضر کی مدحت طرازیوں تک بے شمار اصحابِ ایمان کے عشق وعقیدت کی لازوال مہک اس گلزارِ مدحت کا جزوِ لازم بن چکی ہے۔ نعتِ رسول ﷺ اظہار عقیدت کا ذریعہ بھی ہے اور سرمایۂ آخرت بھی۔ اَدبی وشعری ذوق کی جلا کا باعث بھی ہے اور دامانِ رسول سے وابستگی کا بھی۔ نعتِ رسول کے نام پر درود وسلام کے پھول نچھاور کرتے ہوئے دل وجان کو روحانی کیف میسر آتا ہے کہ اس کی بدولت بندۂ ناچیز سنتِ خدا کی ادائیگی کا اعزاز حاصل کر رہا ہے۔ ملائک کی ہمسری ہو رہی ہے دونوں عالم میں سرخروئی میسر آ رہی ہے۔

یوں تو ہر صاحبِ ایمان کا مدعا ہی یہی ہے کہ اسے اپنے آقا ومولا کی مدحت وتوصیف کی سعادت میسر آئے اور اس مقصد کی خاطر وہ اپنی جملہ صلاحیتیں توصیفِ حضور ﷺ کی نذر کر دیتا ہے مگر بعض اصحابِ شوق ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کی آواز ان کے زمانے کی ترجمان بن کر گونجتی ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے اس آواز میں مزید توانائی آتی جاتی ہے حتیٰ کہ ہر آنے والا دوران کے آوازۂ توصیف حضور ﷺ ہی سے ان کے عہد کا تعین کرتا ہے۔ سیدنا حسانؓ بن ثابت کعبؓ بن زبیر، امام ابوحنیفہ، ام بوصیری، عبدالرحمٰن جامی، مولانا رومی، قدسی، کرامت علی شہیدی، محسن کاکوروی، علامہ محمد اقبال اور امام احمد رضا خاں ایسے ہی نمائندہ مدحت نگار ہیں کہ جن کے درود وسلام کے زمزمے آج بھی فضاؤں میں پورے ایمانی تزک واحتشام کے ساتھ گونج رہے ہیں۔ ان سربلند نفوس قدسیہ نے مدحت نگاری کے جو چراغ روشن کیے ہیں وہ ماضی کے مختلف

ادوار میں ضیا پاشی کرتے ہوئے عصرِ حاضر کے چراغوں کو بھی اسمِ احمد ﷺ کی روشنی عطا کر رہے ہیں۔ چراغ سے چراغ جلتے ہی رہے ہیں۔ دورِ حاضر کے نمائندہ نعت گو قمر یزدانی کا شمار بھی انہی خوش بختوں میں ہوتا ہے جن کو قدرت نے محبت حضور ﷺ کی روشنی سے اپنے چراغِ ایمان کو ضوبار کرنے کی سعادت ودیعت کر دی ہے۔

قمر یزدانی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے ہمیشہ نعت مصطفوی ﷺ کو اپنا اعزاز بنائے رکھا۔ تربیت اور پھر مزاج کے لحاظ سے نعت ان کے لئے زندگی کے ہر دور میں سرمایۂ افتخار بن گئی۔ اور یہ آقائے رحمت ﷺ کی مدحت و ثنا میں ایسے محو ہوئے کہ ذہن و فکر کو کسی اور کوچہ کی گدائی کی فرصت ہی نہیں ملی۔ زندگی کی تلخیوں کو نعت کی روحانی حلاوتوں میں سمو کر انہوں نے فکری آسودگی کا سامان مہیا کیا ہے۔ ثنائے سرورِ کونین ان کے نزدیک اتنی بڑی دولت ہے کہ اس کے سامنے دنیا کی ہر نعمت حقیر ہے اس سعادت کو اپنی خوش بختی سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

زباں ملی ہے مجھے حمدِ کبریا کے لئے
یہ لب کھلے ہیں ثنائے شہِ ھدیٰ کے لئے
شعورِ شعر ودیعت ہوا ہے جب سے قمر
قلم ہے وقف مرا نعتِ مصطفیٰؐ کے لئے

''ساقیءِ کوثر'' قمر یزدانی کی وارداتِ قلبی کا نہایت عقیدت آفریں اظہار ہے جس میں شاعری کے پیرائے میں انہوں نے لفظوں کے گلاب کھلائے ہیں ایسے گلاب جو کبھی نہیں مرجھاتے بلکہ ہر دوران کی لازوال مہک سے فکری تازگی کا سامان ڈھونڈتا ہے۔ قمر یزدانی نے ساقی کوثر ﷺ کی مدحت سرائی کرتے ہوئے ساغرِ کوثر کی تمنا کی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ نعت کا حقیقی مقصود خوشنودیٔ رسول کا حصول ہے اور حضور ﷺ کی رضا جوئی انجام کار رحمتِ ایزدی کا مصداق ٹھہرتی ہے۔ اسی لئے ان کی نعتیں محبت حضور کے نام پر اطاعتِ حضور کا تقاضا کرتی ہیں۔ کیونکہ تسلیم و اطاعت سے بڑھ کر رضا جوئی کا اور کوئی وسیلہ نہیں ہے۔

اہلِ ایمان کو ہے قرآن کی تعلیم یہی
ربِ اکبر کی اطاعت ہے اطاعت ان کی
جان جاتی ہے تو جائے کہ یہ جائے گی ضرور
حشر تک دل سے مگر جائے نہ الفت ان کی

قمر یزدانی کی نعتیہ شاعری بلاشبہ عظمت و شانِ رسالتمآب ﷺ کے اظہار کی شاعری ہے۔ حضور کے اوصاف و خصائص، آپ کے کمالات و فضائل اور محاسن و محامد قمر یزدانی کی نعت گوئی کا

موضوعِ خاص ہیں۔ قمر کو مقامِ رسولِ کریم کی رفعت کا غیر معمولی احساس ہے۔ حضور محبوبِ خدا ہیں۔ مطلوبِ دوسرا ہیں، شافعِ روزِ جزا ہیں، مظہرِ تجلیاتِ کبریا ہیں۔ آپ ازل سے ابد تک کے جملہ محاسن کا مجموعہ اور مصدرِ یٰسین وطٰہٰ ہیں۔ جب شاعر کا قلم توصیف حضور ﷺ کی انتہائی بلندیوں کو چھو کر بھی کوتاہ و عاجز رہتا ہے تو پھر "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" کہہ کر اپنی قلبی طمانیت اور سرخروئی کے اسباب ڈھونڈتا ہے۔ قمر یزدانی نے بھی حضور کی رفعتِ درجات کو دل کھول کر سپاسِ عقیدت پیش کیا ہے۔ خصائص و اوصاف مصطفوی ﷺ کو اپنی شاعری کا ارمغان پیش کرتے ہوئے انہوں نے دامانِ حضور سے اپنی وابستگی کو فراموش نہیں کیا اور ہمیشہ اس احساس سے شاد کام رہے ہیں کہ ایک روز یہی نسبت ان کی دائمی سرخروئی کا سبب ٹھہرے گی اور آفتاب نبوت ﷺ کی کوئی لازوال کرن اس ذرۂ ناچیز کو بھی مستنیر کر دے گی۔ ان کے کلام میں عظمتِ حضور ﷺ کی ایک جھلک ملاحظہ کیجئے۔

خامۂ فطرت کا نقشِ اوّلین تیرا وجود
ہے عیاں تیری نگاہِ پاک پر غیب و شہود
وجہِ تخلیق دو عالم مظہرِ نورِ ازل
تیرے جلوؤں سے ہوئی آراستہ بزمِ شہود
درد مندِ درد منداں چارہ سازِ بے کساں
ہے ترا بابِ مقدس منبعٔ فیضانِ وجود

☆

شرما ہی جائیں دیکھیں اگر حسنِ مصطفےٰ
آنکھیں ملائیں حوصلہ کیا مہر و ماہ کا
وہ مخزنِ جمال جدھر سے گزر گئے
ہر ذرۂ آفتاب بنا خاکِ راہ کا

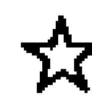
قمر یزدانی کی نعت نگاری عشق محمد مصطفےٰ ﷺ کے فکری عرفان سے بہرہ ور ہے۔ حضور ﷺ کی محبت بلاشبہ حاصلِ ایمان ہے اور اس میں معمولی سی کمی واقع ہو جائے تو ایمان کے نامکمل ہونے کا احساس ڈرانے لگتا ہے۔ قمر یزدانی نے اس محبت و ارادت کی دولت کو دل کے نہاں خانوں میں سنبھال کر رکھا ہے۔ اس مادی دور کی آلائشوں سے بے نیاز، عشق حضور ﷺ کی مہک سے گلزارِ آرزو کو ہر لحظہ شاداب رکھتے ہیں۔ سلطانِ دو عالم، ممدوحِ آدم و بنی آدم ﷺ سے ان کی محبت کسی عصری تقاضے کی مرہونِ منت نہیں بلکہ یہ محبت تو ان کے لئے تحدیثِ نعمت کا ذریعہ ہے

کہ اس کی بدولت مدحت وثنا کی سعادت میسر آئی ہے۔ حضورﷺ سے ان کی ارادت ان کے کمالِ شوق کی دلیل ہے جس میں اَدب واحترام کے تمام زاویوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ انتہائے شوق میں بھی چشمِ تمنا گستاخ نہیں ہوتی بلکہ پلکوں پر آنسوؤں کے آبگینے ٹکائے بارگاہِ حضور میں لرزیدہ رہتی ہے۔ قمر یزدانی سمجھتے ہیں کہ یہی تو وہ بارگاہِ قدس ہے جہاں ملائکہ بھی خمیدہ سر حاضر ہوتے ہیں جہاں جنیدؒ و بایزید نفس گم کردہ رہتے ہیں، جہاں زندگی خود اذنِ وجود کی طلبگار رہتی ہے اور جہاں لفظ ناکام اور جذبے باریاب ہوتے ہیں۔ اس احساس نے قمر یزدانی کے قلم کو حقیقی نعت نگاری کی توفیق عطا کی ہے۔ نمائشی جذبوں اور تصنع آمیز مضامین سے پاک اُجلی اُجلی پاکیزہ پاکیزہ نعتیں شاعر کے والہانہ پن کے ساتھ ساتھ اس کے حسنِ اخلاص کی غماز ہیں۔ قمر یزدانی کا حضورﷺ سے اظہارِ عقیدت ایک ذرۂ ناچیز کا آفتابِ عالمتاب سے تمنائے وابستگی کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ عامیانہ تراکیب، پامالیءِ خیالات اور مصنوعیت سے مبّرا، عجز واحترام کی تمام تر شدتوں کے ساتھ محبتِ رسولِ کریمﷺ کے قدسی جذبے کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

عشقِ حبیب خالقِ ہر دوسرا ملا
شکرِ خدا کہ مجھ کو مرا مدعا ملا
ہم نے وہیں پہ سجدۂ الفت ادا کیا
ان کا رہِ طلب میں جہاں نقشِ پا ملا
آئے جو میرے ہاتھ غبارِ رہِ حبیب
سمجھوں گا مجھ کو سرمۂ چشمِ وفا ملا



پیکرِ نور ہے تو طاقتِ دیدار کسے
باوجود اس کے نظر پھر بھی تماشائی ہے
کچھ ضرورت ہی نہیں شوکتِ شاہی کی اسے
شاہ لولاک! قمر تیرا ہی شیدائی ہے



دل وہی دل ہے تری جس میں ہے الفت محفوظ
آنکھ وہ جس میں تری دید کی حسرت محفوظ
یورشِ غم سے وہ کیوں ہوگا پریشاں خاطر
جس کے سینے میں رہی تیری محبت محفوظ

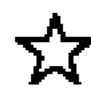
آ گیا جو ترے دامن میں رکھے گی اس کو
فتنۂ دہر سے اللہ کی رحمت محفوظ

....

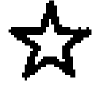
جھک جاتے ہیں جبریل امیں بھی روبرو جن کے
قلم میرا بھی ان کی نعت میں جھک جھک کے چلتا ہے

قمر یزدانی کی نعتیہ شاعری میں تمام مروّجہ مضامین اور اسالیب ملتے ہیں۔ خیال آرائی اور مضمون آفرینی کی بدولت شاعر اپنے قلم سے اسرارِ فطرت کو منکشف کر سکتا ہے مگر نعت نگاری میں چونکہ ہر گام پر اَدب واحتیاط اور احترام شریعت رسولؐ دامنگیر ہوتے ہیں اس لئے شاعر کے لئے محض داد و تحسین کی خاطر حقائق سے انحراف ممکن نہیں ہوتا۔ قمر یزدانی نے آدابِ عقیدت واحترام بجالاتے ہوئے بھی مضمون آفرینی کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ عظمت وشان حضورﷺ کو اپنے قلم کا ارمغان پیش کرتے ہوئے انہوں نے اپنے راہوار تخیل کو منزل شوق کی جانب دیوانہ وار سفر کے آداب سکھائے ہیں۔ اپنی رفعت' خیالی ندرتِ فکر، جودتِ طبع اور شکوہِ الفاظ کی بدولت اس سفر شوق کے دوران میں اُبھرنے والے نقوش کو انہوں نے تب وتاب جاودانی عطا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان کی نعتوں میں ایسے خوبصورت مضامین بھی بکثرت نظر آتے ہیں جو قاری کے ذہن کو مقاماتِ مصطفےٰﷺ کی انتہائی بلندیوں سے آشنا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ مضمون آفرینی کے سفر کو زیادہ موثر، دلکش اور محترم بنانے کے لئے انہوں نے شعری صنائع بدائع، خوبصورت تراکیب، برمحل استعارات اور دلآویز تشبیہات کا سہارا لیا ہے جن کی بدولت ان کی نعتیں قاری کے دل کی خلوتوں میں پر تاثیر لہجے کی جوت جگانے لگتی ہیں۔ اس ضمن میں چند مثالیں پیش ہیں۔

جس کی شمیم سے یہ فضائیں ہیں عطر بار
باغِ جہاں میں وہ گلِ رعنا کھلا ہے آج
زینت فزائے دہر ہے تنویرِ حسن وعشق
ہر سمت نورِ ایزدی جلوہ نما ہے آج



تو ہے وجہِ رونقِ گلستاں لب گل پہ ہے تری داستاں
کلی کہہ رہی ہے چٹک کے ہاں یہ ترا ہی فیضِ بہار ہے
اے حبیب خالقِ دو جہاں ترا آستاں ہے وہ آستاں
کہ بلندیء ہمہ آستاں دل وجاں سے جس پہ نثار ہے



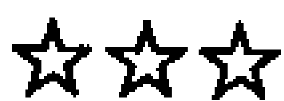
کلیم طور پہ جلووں کی تاب لا نہ سکے
پہ تو نے عرشِ معلیٰ پہ ہے کلام کیا



بزم کونین میں ہر سمت ہے جلووں کا ہجوم
پیکرِ حسن ہوا جلوہ نما آج کی رات
عرشِ اعظم بھی ہے مشتاقِ قدومِ عالی
فرطِ بہجت سے ہے سجدے میں جھکا آج کی رات

یہ عشق و عقیدت کی جلوہ گری ہے کہ قمر یزدانی انداز بدل بدل کر حضور ﷺ کی بارگاہِ قدس میں اپنی ثنا گوئی کی سوغات پیش کرتے ہیں۔ کبھی آپ کے حسنِ صورت کے حوالے سے، کبھی سیرت کے ناتے سے، کبھی انوار تجلیات حضور ﷺ کی ضیا پاشیوں کے نام پر، کبھی آپ کی عنایاتِ کریمانہ کے تعلق سے، کبھی آپ کی سیادت و قیادت کے حوالے سے اور کبھی آپ کے ظاہری و باطنی محاسن اور مقاماتِ قدسیہ کی رفعتوں کی نسبت سے، صفت و ثنائے حضور کے لئے یہ نئے سے نئے مضمون اور اسلوب کو اپناتے ہیں مگر ذوق و شوق کی لذت میں کمی نہیں آتی۔ بلکہ یہ مدحت و نعت کی منزل کی جانب جوں جوں آگے بڑھتے ہیں ان کا راہوارِ فکر ہر آن تیز تر ہوتا اور شہبازِ تخیل پہلے سے کہیں زیادہ ذوقِ پرواز کا حامل بنتا نظر آتا ہے۔ قمر یزدانی کی یہ عظمت و سربلندی اس محبت رسول ﷺ کا انعام ہے جو ان کے گلشن زیست پر بہار لازوال کا عنوان بن کر سایہ فگن ہے۔

شاعر بارگاہِ رسالت قمر یزدانی کی نعت نگاری نے ایک زمانے کو متاثر کیا ہے۔ ان کا ماضی مدحتِ حضور ﷺ کے احساس سے آباد ہے اور ان کا حال ثنائے رسول ﷺ کی رفعتوں سے بہرہ ور ہے اور مستقبل کا پھوٹتا ہوا سویرا ان کی دنیوی و اخروی سرخروئی کی نوید دے رہا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ قمر یزدانی کا قلم اسی طور توصیفِ مصطفےٰ ﷺ کے حقائق رقم کرتا رہے، عشق و عقیدت کی خوشبو پھوٹتی رہے۔ جذباتِ شوق کی چاندنی چٹکتی رہے اور اہل نظر اس مدحت نگار کی نعتوں کے مطالعہ سے اپنی تمناؤں کے گلزار مہکاتے رہیں۔



عابد نظامی اور فیضانِ کرم

صفت وثنائے حضور سرور کائنات ﷺ کا سلسلہ دراز ہو تو شاعر کا نطق بے اختیار سیدنا حسانؓ بن ثابت کے ذوقِ سلیم کی آرزو کرنے لگتا ہے جن کی مدحت طرازیوں نے عقیدت ومحبت حضور ﷺ کا ایک ایسا سدا بہار گلستان کھلا دیا تھا جس کی خوشبوئے جاں نواز ابدالآباد تک مشامِ فطرت کو عنبر بار کرتی رہے گی۔ نعتِ سرکار دو عالم ﷺ نے لاتعداد شعراء کے قلوب واذہان کو دینی ودنیوی سرخروئی اور خوشنودئ رب کائنات کا سامان مہیا کیا ہے۔ مشرق ہو یا مغرب، عرب ہو یا عجم ہر جگہ ہر زماں اسم محمد ﷺ کے اُجالے دانشورانِ عالم کے فکر ونظر کو مستنیر کر رہے ہیں۔ نعتِ رسولِ مقبول ﷺ عظمتِ فکر وفن کا اظہار بھی ہے اور دائمی سرخروئی کا ذریعہ بھی اس لئے شعرائے اسلام نے اسے ہمیشہ دلوں کی دھڑکنوں کا عنوان بنائے رکھا ہے انہی ثنا گویانِ دربارِ رسالت مآب میں سے ایک خوش بخت نام صاحبِ اسلوب شاعر عابد نظامی کا ہے۔

عابد نظامی کی زندگی ایک طویل علمی وادبی پس منظر پر محیط ہے۔ آپ ایک ممتاز شاعر ہی نہیں معروف ادیب بھی ہیں۔ فکری صلاحیتوں سے بہرہ ور مصنف ہی نہیں، انتظامی خوبیوں سے بہرہ یاب مدیر بھی ہیں۔ ارتقائے علم وادب کے سلسلے میں آپ کی خدمات کا احترام ہر صاحب فکر کو ہے۔ آپ کی اُدبی بادیہ پیمائی کے یہ تمام پہلو قابل ستائش سہی، لیکن آپ کی جو خصوصیت آپ کو ممتاز تر بناتی ہے وہ آپ کا جذبہ عشق رسول کریم ﷺ ہے جو آپ کی نعتوں میں جھلکتا اور آپ کی شاعری کو عقیدت کا حسن بخشتا دکھائی دیتا ہے۔ عابد نظامی ایک طویل عرصہ سے نعتِ رسول ﷺ کو اپنی شاعری کا اعزاز اور جذبات محبت کا ترجمان بنائے ہوئے ہیں یہ نعتیہ شاعری ان کے لئے اپنی فکری وفنی صلاحیتوں کے اظہار کا ذریعہ ہی نہیں رہی بلکہ انہوں نے اسے ہمیشہ اپنی خوش بختی اور سعادتِ عظمیٰ سے تعبیر کیا ہے۔ نعت گوئی کی یہ سعادت ان کے نزدیک انعام خداوندی سے کم نہیں جبھی تو کہہ رہے ہیں۔

مجھ پر ہے خاص فضل خدائے عظیم کا
ہوں نعت گو جنابِ رسولِ کریمؐ کا

خلق جبریل سے تائید کا طالب ہے قلم
آج لکھنی ہے مجھے نعت رسول اکرمؐ
کس بشر میں ہے یہ طاقت کہ لکھے نعت اُن کی
ہاں جسے بخشے یہ توفیق خدائے عالم

''فیضانِ کرم'' کی صورت میں عابد نظامی نے جو گلدستہ نعت ترتیب دیا ہے اس کا ہر پھول مہکبار، حسین وجمیل اور عطر بیز ہے۔ ان پھولوں کی خوشبو محسوسات کو عشق وعقیدت کی اُن وادیوں میں لے جاتی ہے۔ جہاں محبت رسول ﷺ عملی تقاضوں میں ڈھلتی اور دلوں میں سوز وساز کا حاصل بن کر مچلتی ہے۔ جہاں حضور ﷺ سے نسبت کے طفیل ذروں پر مہر وخورشید کا گمان گزرتا اور حرماں نصیبوں کا مقدر سنورتا ہے۔ جہاں فکر بے مایہ شوق بے کراں سے ہمکنار ہوتی اور وسعت ایمان ویقین کو اپنے قالب میں سموتی ہے۔ جہاں کی فضاؤں میں بہار خلد سے بڑھ کر رعنائی اور حسن فطرت سے بڑھ کر دلآ رائی جلوہ فگن ہے۔ جہاں زندگی کو دوام اور وقت کو قیام میسر ہے۔ جہاں دعائیں مستجاب اور تمنائیں باریاب ہوتی ہیں۔ جہاں تصورات حقائق کا پرتو لیتے اور جذبات آسودگی کی ضو دیتے ہیں۔ جہاں رحمت ایزدی عصیاں کاروں کا احاطہ کرتی اور سائلوں کے دامانِ مراد کو جواہر قبولیت سے بھرتی ہے۔ بلاشبہ یہ وادیٔ جاں نواز ارض مدینہ ہے جس کا تذکرہ کرتے ہی عابد نظامی کا قلم شہپر جبریل کی صورت حسنِ تخئیل کو چھونے لگتا ہے ایک ایمان افروز جھلک ملاحظہ فرمایئے۔

جچے نہ جنت فردوس ان کی نظروں میں
جو چند لمحے ترے شہر میں گزار آئے
حضور! آپ بلائیں اگر مدینے میں
تو دل کو چین ملے، روح کو قرار آئے
نگاہِ لطف کا محتاج ہے ترا عابد
خدا کرے وہ مدینے میں بار بار آئے

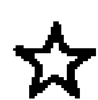
حضور محمد مصطفےٰ ﷺ کی شخصیت حسنِ صورت وسیرت کا دلآ ویز مرقع ہے۔ ایک طرف آپ ﷺ کے حسن وجمال کا یہ عالم ہے کہ انوار خداوندی جھلکتے اور شمس وقمر خیراتِ حسن طلب کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ عشاقِ سرمست رخ پرانوار کی ایک ایک جھلک پر فدا اور ایک ایک لمحہ

فشانی پر تصدق ہیں اور دوسری طرف آپ ﷺ کے حسنِ سیرت و کردار کی سر بلندیوں سے ہر زمانہ فیضیاب ہو رہا ہے۔ آپ ﷺ کی صورت ازل سے ابد تک کی جمال افروزیوں کا مرقع ہے تو آپ ﷺ کی سیرت جملہ محاسن و محامد کائنات کا مجموعہ، عابد نظامی نعت رقم کرنے بیٹھتے ہیں تو حسن و جمال مصطفوی ﷺ کے جلوؤں میں کھو جاتے ہیں، جی بھر کے قلب و نظر کی شاد کامی کا اہتمام کرتے ہیں۔ تصورات کے خلوت کدوں میں انوار و تجلیات نبوی ﷺ کو جلوہ آرا دیکھتے ہیں۔ کتنے ہی نعت گو شعراء ہیں جو حضور سرورِ کائنات کے حسنِ صورت کی تجلیات میں گم ہوئے تو پھر راہِ عشق میں آگے قدم نہ بڑھا سکے، مگر عابد نظامی عین وصال میں بھی حوصلۂ نظر رکھتے ہوئے آپ ﷺ کے حسن سیرت و کردار کو خراجِ عقیدت پیش کرنا فراموش نہیں کرتے بلکہ آپ کے جمال جہاں افروز کی تابانیوں سے قلب و نظر کو مستنیر کرتے ہوئے آپ کے انوارِ سیرت سے بھی جی بھر کر خوشہ چینی کرتے ہیں۔ عابد کے کلام میں حسنِ صورتِ رسول ﷺ کی جلوہ افروزی کا انداز دیکھئے:

محمد مصطفےٰ ﷺ کو مظہرِ شانِ خدا دیکھا
جہاں کے ذرے ذرے میں اُنہیں جلوہ نما دیکھا
وہ ہیں مخلوق میں سب سے حسیں تخلیق خالق کی
خدا کی کل خدائی میں نہ ان سا دوسرا دیکھا
کہیں مزمل و طٰہٰ ، کہیں یٰسین و مدثر
کتابِ حق کے ہر پارے میں ان کا تذکرہ دیکھا

صورت حضور پرنور سید یوم النشور ﷺ کی طلعتوں کو دل و جان میں بساتے ہوئے عابد نظامی آپ ﷺ کی سیرت مقدسہ کو کس طور ہدیۂ توصیف پیش کرتے ہیں ملاحظہ کیجئے:

نبیؐ کی ذات نمونہ ہے آدمی کے لئے
یہی چراغ ہے دنیا میں روشنی کے لئے
فقط حضورؐ کی سنت ہے قابلِ تقلید
فقط حضورؐ ہیں انساں کی رہبری کے لئے



دو عالم کے سلطان اور اتنے سادہ
کہ خادم سوار اور خود ہیں پیادہ

نعت سرورِ دو عالم ﷺ صنفِ شاعری کے کسی بھی پیرائے اور انداز میں کہی جائے بہر حال شاعری کا افتخار اور مدحت نگاران عالم کی فکری کاوشوں کا نکھار ہے لیکن نعت کو جو غیر معمولی پذیرائی غزل کے قالب میں عطا ہوئی ہے وہ اور کہیں نظر نہیں آتی۔ فارسی اور پھر اردو کے شعراء نے غزل کے اسلوب میں صفت و ثنائے مصطفوی ﷺ کی خوشبو لٹاتے ہوئے خود کو شہرت عام ہی نہیں بقائے دوام کا مستحق بھی ٹھہرا لیا ہے۔ جامی، قدسی، کرامت علی شہیدی بیدم وارثی، احمد رضا خاں، امیر مینائی، علامہ اقبال، ظفر علی خاں، حافظ مظہر الدین' حفیظ تائب وغیرہم کے لافانی نعتیہ کلام کا غالب حصہ اسی اسلوب غزل پر مشتمل ہے۔ عابد نظامی بھی حسنِ تغزل کے نام پر حضور ﷺ کی بارگاہِ ناز میں اس طور پر ارمغانِ نیاز پیش کرتے ہیں کہ قاری کا ادراک شدت احساس سے مستنیر، فکر نورِ یقیں سے منور اور جذبات سوزِ عشق کے مظہر ہونے لگتے ہیں۔ دراصل محبوب جس قدر حسین ہوگا عشق اسی قدر پختہ اور کامل ہوگا اور جب تختِ محبوبیت پر وہ ذاتِ والا صفات فائز ہو جو مطلوب کائنات ہی نہیں محمود خدا و ملائکہ بھی ہے جو باعث تخلیق عالم اور زینت سرائے بنی آدم ہے۔ جس کا چرچا ہر دور کی آبرو اور جس کی رضا میں ہر عہد ذوقِ جستجو ہے۔ جس کا ذکر پاک عبادت، جس کی تقلید عین سعادت اور جس کی خوشنودی پیامِ رحمت ہے تو پھر عابد نظامی کے قلم سے تغزل کی کہکشائیں اُبھرنے لگتی ہیں۔ تغزل جو شاعری کا حسن اور لطافت فکری کی جان ہے، اس کی تب و تاب نعت کے حوالے سے عابد نظامی کے قلم سے پھوٹتی ہوئی دیکھئے:

نظر کے سامنے یوں روضۂ خیر البشرؐ آئے
کہ اس کا عکس آنکھوں سے میرے دل میں اُتر آئے
ولاتی ہے مجھے عرصے سے یادِ گنبد خضریٰ
الٰہی ختم ہو اب یہ شب فرقت، سحر آئے
پھلے پھولے نہ کشتِ آرزو کیوں اُن کی اے عابد
حریم قدس میں آنکھوں سے جو برسات کر آئے

....

آئیں درِ حضورؐ سے خوشیاں سمیٹ لیں
جو لوگ غمزدہ ہیں، حزیں ہیں ملول ہیں
میں نے سنی ہے بات یہ اسراء کی رات سے
ماہ و نجوم آپ کے قدموں کی دھول ہیں

عابد نظامی نے سلاطین زمن کے قصائد نہیں لکھے بلکہ شہنشاہِ شاہانِ عالم کی مدح سرائی کی ہے۔ حسنِ بتاں کو دل میں نہیں بسایا، بلکہ حسنِ محبوب حجازی سے لو لگائی ہے۔ فکر و نظر کو محبوبان مجازی کے کاکل و رخسار کا طواف نہیں کرنے دیا بلکہ زلفِ مشکبوئے رسول ﷺ کے حلقۂ خم میں اپنے طالع مسعود کو تلاش کیا ہے۔ اپنے قلم کو فسانۂ دنیا کے تذکرے سے آلودہ نہیں ہونے دیا بلکہ والیٔ بطحا کے جلال و جمال کو اشعار کا پیرہن بخشا ہے۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری ان کی نعتیہ شاعری کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

''حسن کی دلنوازیوں نے جناب عابد کے قلب و نگاہ کو یوں مستغنی کر دیا ہے کہ کسی دارا و جم کی شوکت شاہانہ اس کی نگاہ میں نہیں جچتی۔ اسے اپنا چاک گریباں بہت عزیز ہے جو اس کے محبوب کی نگہِ کرن کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس کے دل کے کسی گوشہ میں گنجائش ہی نہیں رہی کہ وہ لذاتِ دنیا یا عیش و عشرت کی زندگی کی خواہش کر سکے۔ محبوب کی راہ منزل کے ببول اسے اطلس و پرنیاں سے کہیں پیارے ہیں۔''

عابد نظامی عشق و بے خودی کے عالم میں جہاں اپنی داستان شوق دربار رسالت مآب ﷺ میں پیش کرتے ہیں وہاں ملت اسلامیہ کے رنج و آلام کو بھی فراموش نہیں کرتے۔ عابد ایک راست فکر ادیب اور شاعر ہیں۔ اسلام کی عظمت و حقانیت پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہیں۔ فکری و روحانی رہنمائی کے لئے ان کی نگاہیں ماسکو یا واشنگٹن کی طرف نہیں اُٹھتیں بلکہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ ان کی نظریاتی منازل ہیں۔ اُمت مسلمہ جن مسائل و مصائب سے دوچار ہے ان کا ادارک عابد کو خون کے آنسو رلاتا ہے۔ گروہی، جغرافیائی عصبیتیں مسلمانوں کا باہمی انتشار و افتراق، اغیار کی ریشہ دوانیاں، باطل قوتوں کی یلغار اور غلامانِ احمد ﷺ کی احساس زیاں سے محرومی پر عابد کا دل تڑپ اُٹھتا ہے۔ وہ اُمت اسلامیہ کا استغاثہ بحضور سرکارِ دو عالم ﷺ پیش کرتا ہے۔ اپنی فریاد کو آنسوؤں کی زبان دے کر حضور ﷺ سے دستگیری کا سوالی بنتا ہے۔ مسائل کا حل اور مصائب کا مداوا مانگتا ہے۔ پوری دلسوزی و عجز سامانی کے ساتھ ملت اسلام کی ترقی و خوشحالی کا تمنائی بنتا ہے۔ ذاتی غم کے اظہار سے لے کر عالمِ اسلام کے استغاثۂ پُرغم تک عابد کی جذبات آفرینی کس طور آنسوؤں کی مالائیں پروتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

اے سید مکی نگہِ لطف و کرم کر
اب ہم سے یہ صدمات اُٹھائے نہیں جاتے

اب گردشِ حالات نے وہ حال کیا ہے
آنسو بھی آنکھوں سے بہائے نہیں جاتے
عزت نہیں دنیا کی نگاہوں میں ہماری
اب شرم سے چہرے بھی دکھائے نہیں جاتے
امداد کا خواہاں ہوں اے رحمتِ عالم!
اُمت سے ستم اور اُٹھائے نہیں جاتے

تخئیل کے دریچے وا ہوں، وادیٔ بطحا سے نسیمِ جانفزا کے جھونکے قلب بسمل کو شادمانی بخشتے محسوس ہو رہے ہوں، محبوب نظر تصورات رو برو ہوں، درود و سلام کی ڈالیاں نذر کی جا رہی ہوں، عشق و عقیدت کی بارات سجی ہو، صلوٰۃ و تحیات کے زمزمے سماعت نواز ہو رہے ہوں، ناز کے حضور نیاز فرشِ راہ ہو، ناپائیدار لمحوں کو دوام اور ساعت گزراں کو قیام نصیب ہو رہا ہو تو پھر یارائے ضبط کسے رہتا ہے۔ خوش بخت ہیں وہ شعراء جوان کیف آگیں ساعتوں کو نذرِ قارئین کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں کہ دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے۔ عابد نظامی نے متعدد مقامات پر ایسی ہی روحانی سرخوشی و سرشاری کی کیفیات کو نظم کا ملبوس عطا کیا ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری اگر ان کے عشق ذاتی کے لحاظ سے سرمایۂ نجات ہے تو اُمت مسلمہ کی عقیدت کے حوالے سے جلوہ گاہِ شوق ہے جس میں زبان و بیاں کی گلکاریاں بھی ہیں اور صنائع بدائع کی شہکاریاں بھی، برمحل تراکیب و معانی کی جگمگاہٹیں بھی ہیں اور موزوں تشبیہات و استعارات کی سجاوٹیں بھی، قلب و نظر کی تازگی کا سامان بھی ہے اور ایمان و یقین کی سرخروئی کا عنوان بھی، مہجوری طیبہ میں تڑپنے والوں کی داستانِ الم بھی ہے اور زیارتِ شہر رسول ﷺ سے بہرہ ور ہونے والے سعید بختوں کا مقدر بننے والا فیضانِ کرم بھی، جذبات آفرینی شاعری کا خاصۂ امتیاز ہوتی ہے۔ منظرِ التفات تمناؤں کے پس منظر میں عابد نظامی کے جذبات کا ایک پرتو دیکھئے:

میں سر کے بل چلوں طیبہ کی گلیوں اور کوچوں میں
بصد تعظیم شہر خلد کی ہر رہگذر دیکھوں
مرے آقا نے انگلی سے کیا جس چاند کو ٹکڑے
اسی کی چاندنی میں سبز گنبد رات بھر دیکھوں
تمنا ہے کہ گزریں زندگی کے دن مدینے میں
اُنہی کا جلوۂ نوریں نظر آئے جدھر دیکھوں

اب ذرا تمناؤں کی قبولیت اور آرزوؤں کی پذیرائی کے حوالے سے شاعر کی شاد کامیٔ احساس پر ایک نظر ڈالئے:

مل رہا ہے گنبد خضریٰ کے سائے میں سکوں
راحتِ جاں ہے سنہری جالیوں کے سامنے
بار بار اُن کو میں چوموں اپنی آنکھوں سے ملوں
کتنا ارماں ہے سنہری جالیوں کے سامنے
جگمگاتے ہیں سر مژگاں مسرت کے دیے
کیا چراغاں ہے سنہری جالیوں کے سامنے

اگر چہ تمام ادوار نعت کی عظمتوں کے امین رہے ہیں مگر دورِ حاضر کے شعراء نے نعتِ رسول ﷺ کو جس شدت کے ساتھ اپنے فکروفن کا افتخار بنایا ہے وہ لائق صد ستائش ہے۔ اوہام باطل کی طلسم کاریوں میں بھٹکنے والے دانشورانِ ملت اس امر سے باخبر ہو چکے ہیں کہ جادۂ نبوی ﷺ ہی وہ صراطِ مستقیم ہے جو انہیں منزل آشنا کر سکتی ہے۔ اس لئے آج کا شاعر تمام تر ارادت قلبی اور مودت روحانی کو اپنی التجاؤں میں سموتے ہوئے اس درِ اقدس کی طرف لپک رہا ہے۔ جہاں جنیدؒ و بایزیدؒ "نفس گم کردہ آتے ہیں۔ عابد نظامی اپنے عہد کے ترجمان اور فنِ نعت کی رفعتوں کی پہچان بن کر عرض گزر رہیں:

گھرے ہیں دستِ مصائب میں کوئی راہ ملے
غموں کی دھوپ میں سرکار کی پناہ ملے
کوئی طلب ہے مجھے زیست میں تو اتنی ہے
نبیؐ کی چاہ ملے اور بے پناہ ملے

عابد کے ہاں کمال کی روانی اور آمد ہے۔ وہ نئی نئی شگفتہ وشاداب زمینیں نکال کر ان میں بے تکلف شعر کہہ لیتے ہیں۔ قدم قدم پر مضمون آفرینی، رعنائی خیال، شوکتِ الفاظ اور ندرتِ فکر کا احساس ہوتا ہے۔ فیضانِ کرم ﷺ میں شاعر کہیں تو دشتِ طیبہ کی سیر کر رہا ہے اور کہیں حریم ناز میں سجدہ ریز دکھائی دیتا ہے۔ عشق رسالت مآب ﷺ کی رفعتوں پر خندہ زن دکھائی دیتی ہے۔ عابد نے جہاں شمائل وفضائل نبوی ﷺ کے بیان کی صورت میں جذبات عشق کی ترجمانی کی ہے۔ وہاں حضور ﷺ کے اُسوۂ اور خلقِ عظیم کی پاکیزہ یادوں کو دل وجان میں بساتے ہوئے اپنے گرد و

پیش کی عملی واخلاقی کیفیت کا احتساب بھی کیا ہے۔ انہوں نے اسمِ محمد ﷺ کی ضیا پاشیاں ہمیشہ محسوسات کے نہاں خانوں کو منور کرتی ہوئی محسوس کی ہیں۔ یہ مقدس نام جو روحِ ارضی کا اسمِ اعظم ہے۔ عابد کے قلم سے جس طور خراجِ عقیدت کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ وہ قابلِ غور بھی ہے اور حاصل مطالعہ بھی۔

اس نام سکوں بار میں تاثیر عجب ہے
کھل جاتا ہے تقدیر کا ہر جادۂ مسدود
اخلاص سے جو اسمِ محمد کا کرے ورد
قدسی ہیں کئی اس کی مدد کے لئے موجود

جب قافلہ منزل مقصود کی جانب رواں ہو تو شب کے سناٹوں میں حدی خوانوں کی لے مسافروں کے قدموں کی رفتار کو تیز تر اور ان کے ذوقِ عمل کو پختہ تر کر دیتی ہے۔ یہاں بھی ایک کاروانِ شوق ہے جو منزل طیبہ کی جانب سرمایۂ عقیدت لئے چل رہا ہے۔ دلوں میں ارمان مچل رہے ہیں اور نگاہوں میں تصورات کے نجوم رقصاں ہیں۔ دستِ تمنا میں محبت رسول ﷺ کے پھول لئے قافلے کا ہر مسافر اپنے آقا و مولا حضور صاحب لولاک ﷺ کی نگہِ کرم کا سوالی ہے۔ دشتِ مہجوری میں سرگرداں ہوتے ہوئے جب رہ نوردانِ شوق کے جذبات بوجھل اور پاؤں شل ہونے لگتے ہیں تو عابد نظامؔی کے قدسی زمزمے حدی خوانی کا حق ادا کرتے ہوئے فکر و نظر کو لامتناہی تابانی شوق سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔

''فیضانِ کرم'' کی صورت میں عابد نظامؔی نے جو ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ خدا کرے اس سے فیضیابی ہر صاحب ایمان کا مقدر بن جائے اور عابد کا یہ اعزاز جملہ شاعرانِ اسلام کا افتخار بن جائے کہ:

نہ کرے مدح کبھی اہل جہاں کی عابدؔ
نعت گو ہے مرے آقا مرے مولا تیرا

☆☆☆

سید محمد ابوالخیر کشفی کا نذرانہ مدحت

حضور سلطان دوعالم ﷺ کی مدحت وتوصیف کا چمن ہمیشہ سے خزاں ناآشنا رہا ہے۔اس گلزار سدا بہار کو عشاق حضور صدیوں سے اپنے آنسوؤں کا نم پیش کرتے رہے ہیں۔آنسوؤں کا یہی نم مدحت وتوصیف حضور ﷺ کے مہکتے ہوئے گل ولالہ میں اپنی عقیدت آفرینی دکھاتا ہوا نظر آتا ہے۔عشق مصطفےٰ ﷺ میں پلکوں پہ لرزنے والے آنسو خلاق مصطفےٰ ﷺ کا خصوصی کرم ہیں یہ کرم انہی خوش بخت قلم کاروں کا اعزاز بنتا ہے جنہیں سرورِ کونین ﷺ کی عنبر فشاں یادوں سے اپنے قلب وجان کے خلوت کدوں کو آباد کرنے کا ہنر آتا ہے۔اس گلستان صدرنگ پر ایک نظر ڈالتے ہی اصحاب ایمان کے افکار مہکنے اور آنکھوں سے عقیدت کے آبگینے ٹپکنے لگتے ہیں۔اس گلشن کی بہار سامانی جہاں رب کونین کا لطف خاص ہے وہاں وہ سعید قسمت مدحت نگار بھی وقت کے افق پر اپنی جگمگاہٹ کا احساس دلاتے نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنی فکر وبصیرت کی بہترین توانائیاں عشق رسول ﷺ کی نذر کر دی ہیں۔ممتاز شاعر اور محقق سید محمد ابوالخیر کشفی بھی اسی بلند بخت قافلے کے رکن ہیں۔

سید محمد ابوالخیر کشفی سے ذاتی تعارف نہیں مگر نعت مصطفےٰ ﷺ وہ وسیلۂ خاص ہے جو زمان ومکان سے ماورئی ہو کر مداح وممدوح کو پل بھر میں قریب سے قریب تر کر دیتا ہے ان کی نعت نگاری مدت سے رسائل وجرائد کے ذریعہ سے قارئین کے فکر ونظر کی زینت بن رہی ہے۔بکھری ہوئی شعری نگارشات اپنی جگہ اس وقت ان کا نعتیہ مجموعہ ''نسبت'' مرے پیش نظر ہے جو ضخامت میں مختصر ہونے کے باد جود اپنی معنویت فکری جامعیت اور محبت حضور ﷺ کی فراوانی کی بدولت اپنے بھرپور اور ہمہ پہلو وجود کا احساس دلا رہا ہے۔اس مجموعہ نعت کا نام ہی بذاتِ خود نعت کی روحانی معنویت کا شعور بخش رہا ہے۔بارگاہ مصطفوی ﷺ مرجع نعت کے حضور نعت پیش کرنے والے اصحاب نعت سے لے کر عصر حاضر کے نعت گو شعراء تک سب کی مدحت نگاری کا مقصود ومدعا یہی ہے کہ انہیں آقا ومولا ﷺ سے نسبت عطا ہو جائے' وہ نسبت جو ذروں کو آفتاب کی چمک اور قطروں کو سمندروں کی گہرائی عطا کرتی ہے۔وہ نسبت جو غلاموں کو آقائی اور عرب کے بادیہ نشینوں کو شانِ وارائی عطا کرتی ہے۔وہ نسبت جو حدود وقیود سے ماورئی اور زمان ومکاں کے تصورات

سے بے نیاز ہوتی ہے۔ وہ نسبت جو چودہ صدیوں کے فاصلوں کو پھلانگ کر دامانِ سرورِ دوعالم ﷺ سے وابستگی کا اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے یہی نسبت سید محمد ابوالخیر کشفی کی شاعری کا افتخار نظر آتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

اس نام سے وابستہ ہوں نسبت پہ نظر ہے
عاصی ہوں مگر ان کی شفاعت پہ نظر ہے
طیبہ سے بہت دور ہوں اور ذوقِ حضوری
اس صاحبِ معراج کی نسبت پہ نظر ہے

....

دیکھو تو ذرا نسبتِ سلطانِ مدینہ
طیبہ میں ملی جنت سلطانِ مدینہ
یہ جان ہے سرکار کی حرمت پہ تصدق
ایمان ہے مرا حرمتِ سلطانِ مدینہ

سید محمد ابوالخیر کشفی اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ وہ جس ہستی عظیم سے نسبت کا اعزاز رکھتے ہیں وہ کس قدر عظیم اور سربلند ہے۔ وہ عظمتِ حضور ﷺ کا تصور کرتے ہیں اور ساتھ ہی خستہ سامانی پر بھی نظر ہے۔ ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور ایک محب سلطان مدینہ کی حیثیت سے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا محبوب محبوبِ کائنات ہے۔ ان کا محبوب بلاشبہ محبوبِ شششِ حیات ہے۔ ایک طرف وہ اپنے آقا و مولا ﷺ کی لافانی رفعتوں کا ادراک کرتے ہیں تو دوسری طرف انہیں یہ بھی احساس ہے کہ وہ اس آفتابِ حرا ﷺ کی ابدی طلعتوں کے مقابل ایک ذرہ ناچیز ہیں مگر ان کے لئے یہی اعزاز کیا کم ہے کہ انہیں نسبت کا شرف تو حاصل ہے۔ اسی نسبتِ خاص کے حوالے سے ان کے باطن میں آرزوئیں مچلتی ہیں، تمنائیں ابھرتی ہیں۔ تصورات کی جلوہ سامانیاں اپنا وجود منواتی ہیں اور کیف و انبساط کی انہی ساعتوں میں ان کا قلم یوں جواہر لٹانے لگتا ہے۔

وہ ایک نام جو آبِ حیات ہے لوگو
ترے لہو میں میری آرزو میں زندہ رہے
دیارِ مشرق سے لے کر دیارِ مغرب تک
یہ مشتِ خاک تری جستجو میں زندہ رہے

تمہاری یاد ہے جس کے لئے مثالِ حرا
وہ کس وقار سے اس ہاؤ ہو میں زندہ ہے

''ایک دعا ایک نعت'' کے عنوان سے ان کی آرزوؤں کی بلند پروازی ملاحظہ ہو۔ یہ ایسی آرزو ہے جو دعا کی صورت میں ان کے لبوں سے اُبھرتی اور ان کے قلم سے عقیدت کا خراج لیتی ہے۔

وہ بصیرت اے خدا منزل نما ہم کو ملے
خاک طیبہ میں کسی کا نقش پا ہم کو ملے
رحمتہ للعالمین کے نور سے رخشندہ ہو
ایسا انداز نظر سب سے جدا ہم کو ملے
ہم قیامت کی تپش میں مسکرا اُٹھیں اگر
سرورِ دنیا و دیں کا آسرا ہم کو ملے
ہم مدینے کی زمیں میں اس طرح مدفون ہوں
خاک پاک مصطفےٰ بس یہ صلہ ہم کو ملے
قرب احمد ﷺ کے ہزاروں سلسلے رب کریم
ہم پہ جو روشن نہیں وہ مدعا ہم کو ملے

''نسبت'' کے نام سے سید محمد ابوالخیر کشفی کا مجموعہ نظر دلکش اور ایمان آفریں نعتوں کی بہار اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہ ایسی بہار ہے جو خزاں کے تصور سے بھی نا آشنا ہے۔ یہ ایسی بہار ہے جو ظاہر اور باطن کو یکساں طور پر معنبر کرتی ہے۔ یہ ایسی بہار ہے جس کے احساس سے ہی آرزوؤں کی پژمردہ کلیاں زندگی پانے لگتے ہیں۔ سید کشفی نے اس مجموعہ نعت میں عشق و عقیدت حضور کا چمن کھلا دیا ہے۔ نقد و نظر کے حوالے سے آگے بڑھتے ہوتے ہوئے ہم ایک نظر سید کشفی کے نظریۂ نعت گوئی پر روشنی ڈالنا چاہیں گے۔ پیش گفتار کے عنوان سے کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں۔

''نعت گوئی اپنی جان کی قیمت پر سرور دنیا و دیں ﷺ کے جوار میں پہنچنے کا نام ہے۔ ہم اسی سفر میں مصروف ہیں اور منزل بہت دور ہے۔ نعت گوئی اپنے وجود کی سچائیوں کے ساتھ ان کی خدمتِ عالیہ میں حاضری کا نام ہے۔ شاید حضوری کا یہ لمحہ ہمیں حرف و صوت کی دنیا میں کبھی مل جائے۔ نعت گوئی مواجہ شریف میں قیام کے ان چند لمحوں کا نام ہے جو وقت گزراں کے تصور کو مٹا

دیتے ہیں۔ نعت گوئی اُس انتظار کا نام ہے جس کا پورا مفہوم ہمیں نہیں معلوم۔ رحمت اور عطائے بے کراں کا انتظار، نعت دلِ زندہ کے ساتھ بیداری کی ساعت کا نام ہے۔"

نگاہ ہے یا رسول اللہ نگاہ ہے

ہم نے "پیش گفتار" کی تمام سطور ایک مہکبار احساس کے ساتھ نقل کر دی ہیں۔ یہ نثری نعت کا اس قدر ایمان افریں شہ پارہ ہے کہ ایک ایک لفظ دامانِ بصیرت کو سلطان دو عالم ﷺ سے نسبت اور ارادت کی غمازی کرتا محسوس ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا سطور بلاشبہ کتاب نعت کا دیباچہ اور محبت رسول ﷺ کے جذبات کا خلاصہ ہیں۔ کیف و وجدان کا نور لٹاتی ہوئی یہ سطور ہم جیسے خستہ سامانوں کو آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کر رہی ہیں۔ سید کشفی نے اس شہ پارہ میں جس طور حسنِ نعت کی جلوہ کاری لٹاتی ہے۔ وہی جلوہ کاری ان کی تمام نعتوں اور ان کے اسلوب کی پہچان بنی ہوئی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ نعت اسمِ محمد ﷺ کی جلوہ گری اور اس کے ادراک کا نام ہے۔ علامہ اقبال کے لفظوں میں۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھرے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
بزمِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

اور پھر اقبال ہی کا ایک منفرد تاریخ ساز شعر بھی دیکھئے۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اُجالا کر دے

اسم محمد ﷺ کی تابانیوں سے اُجالا کرنے کی تمنا سید کشفی کے افکارِ نعت میں جگمگاتی نظر آتی ہے۔ یہی نام ان کا آرزوؤں کا حاصل اور ان کی تمناؤں کا مرکز ہے۔ یہی نام دنیا و آخرت میں ان کا سہارا اور ان کے لئے لطف و کرم کا نظارا ہے۔ یہی نام عظمت نعت اور شوکت جذبات ہے۔ اسی نام کے وظیفہ سے ان کے جذبے مچلتے اور ان کے خیالات اشعار میں ڈھلتے ہیں۔ یہی نام ان کے لئے وقارِ آرزو اور انتہائے جستجو ہے۔ اسم محمد ﷺ سے تابندہ اُن کے قلم کی جولانیوں کی ایک جھلک پیش خدمت ہے۔

غمِ جہاں سے یہ کہہ دے مری طرف سے کوئی
میں آج اسم محمد ﷺ کے سائبان میں ہوں
زماں مکاں پہ تسلط مرے نبیؐ کا ہے
غریب شہر ہوں اور اپنے مکان میں ہوں
سلام جس کو کریں ہفت آسماں کشفی
اسی کا خون ہوں اور اس کے خاندان میں ہوں

....

مرا وجود محمد ﷺ کے نام سے قائم
چراغ کعبہ سے روشن ہیں سب شجر میرے
جہاں مسافتیں منزل غبار نورِ سحر
خیال وخواب میں بستے ہیں وہ نگر میرے

....

ہر مطلعِ نور اُسی نام سے روشن
خورشید کو خیرات ملی اُس کی جبیں سے
ہاں اسم محمد ﷺ ہے مرے نطق کی تاثیر
الفاظ کو مفہوم ملا سرورِ دیں سے

....

ہر صدا حشر کے میدان میں پتھر ہو گی
نغمۂ رسلِ آخر ہی سنائی دے گا
میرا دل اسم محمد ﷺ سے سکوں کا مرکز
ذہن بے مایہ بھی اب اس کی دہائی دے گا

....

ذہن کو اپنے اُجالوں تو ترا نام لکھوں
اپنے لمحوں کو اُجالوں تو ترا نام لکھوں
گنبدِ خضریٰ کے سائے میں وہ صدیوں کا خرام
اس کی تصویر بنا لوں تو ترا نام لکھوں

....

اک اسم محمد ﷺ کے سوا لوحِ ابد پر
دیوار و در و بام حرم کچھ نہیں لکھتے
ہر سانس عبارت ہے محمد ﷺ کی ثنا سے
رودادِ شہاں قصہ جم کچھ نہیں لکھتے
کرب کی رات میں اک نام سہارا تو بنا
ہر بنِ مو سے محمد ﷺ کی صدا آتی ہے
مرے سرکار نے پھر مجھ کو بلایا ہو گا
ایک پیغام لئے بادِ صبا آتی ہے

محبوب دو عالم ﷺ سے نسبت کے سبب سے محبت صادق کو اپنے محبوب کی ہر ادا عزیز تر ہوتی ہے اور یہاں تو وہ محبوب ہے جس کی ہر ادا اس کے خالق کو بھی محبوب ہے اور جس کی اداؤں کے تذکرے قرآن حکیم کے نورانی مصحف سے اُبھرتے ہیں۔ عشاق کو اس سرزمین سے پیار ہوتا ہے۔ جہاں ان کا محبوب رہتا ہے۔ وہ گلیاں وہ کوچے عزیز ہوتے ہیں جنہیں محبوب سے نسبت ہوتی ہے۔ ان راہگزاروں پر پیار آتا ہے جنہیں محبوب کے قدموں کو بوسہ دینے کا شرف عطا ہوتا ہے۔ یہ تو داستانِ شوق ہے جو بکھرے تو بکھرتی چلی جاتی ہے، پھیلے تو پھر رکنے کا نام نہیں لیتی۔ سید ابوالخیر کشفی بھی ان کیفیات روحانی سے آگاہ ہیں۔ اس لئے شہر محبوب دو عالم ﷺ کا تذکرہ بطور خاص ان کے قلم سے عقیدت کا نور بن کر فروزاں ہوتا ہے۔ یہی شہر محبوب ہے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔ ترجمہ

(قسم ہے مجھے شہر محبوب کی، جس میں آپ مقیم رہے) (پارہ ۳۰، سورہ البلد)

اور جب ایک عاشق خستہ جاں سے پوچھا گیا کہ کائنات میں بڑے بڑے عظیم الشان شہر ہیں جو حسن عمارتوں اور دلفریب نظاروں کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہیں۔ بتاؤ تو سہی کہ ہمیں کون سا شہر عزیز ہے تو اس عاشق نے محبت و وارفتگی کے عالم میں جواب دیا کہ

آں خنک شہرے کہ دروے دلبرست

یعنی شہر تو بے شمار ہیں مگر اس شہر کی عظمتوں کا کیا کہنا جن میں میرا محبوب رہتا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے کر تابعین تک اور پھر ان کے روشن ادوار سے لے کر آج تک شہر رسول ﷺ عشاق جاں نواز کی نگاہوں کا مرکز اور عمل کا محور بنا ہوا ہے۔ سیدنا امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدینہ طیبہ سے محبت بلاشبہ عشق و عقیدت کا روشن ترین باب ہے۔ امام احمد رضا خاں کی

نعتیہ شاعری میں مدینہ منورہ کا خوب ذکر ملتا ہے۔

مدینے کے خطے خدا تجھ کو رکھے
غریبوں فقیروں کے ٹھہرانے والے
حرم کی زمیں اور قدم رکھ کے چلنا
ارے سر کا موقعہ ہے او جانے والے

....

جان و دل ہوش و خرد سب تو مدینے پہنچے
تم نہیں چلتے رضا سارا تو سامان گیا

دیکھئے ابوالاثر حفیظ جالندھری مدینہ طیبہ کی عظمتوں کو کس طور خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

کہاں ایسے نصیب اللہ اکبر سنگِ اسود کے
یہاں کے پتھروں نے پاؤں چومے ہیں محمد ﷺ کے

ان مثالوں سے ہمارا مقصود مضمون کو طوالت دینا نہیں بلکہ فقط یہ عرض کرنا ہے کہ شہر محبوب کا تذکرہ ہر محب کی آرزوؤں کا حاصل ہوتا ہے۔ سید ابوالخیر کشفی کے ہاں اسی نسبت مدینہ منورہ طیبہ کی جلوہ کاری بڑی وضاحت کے ساتھ ملتی ہے۔ انہوں نے شہر مدینہ سے محبت و وارفتگی کے خوبصورت نظائر پیش کئے ہیں۔ مدینہ طیبہ کی گلیاں اور کوچے، اس کی مساجد اور بازار، اس کے صحرا اور سبزہ زار، اس کی وادیاں اور ریگزار، سب کی جھلک ان کے کلام میں ملتی ہے خاص طور پر جب یہ گنبد خضریٰ کے قریب ہوتے ہیں تو ان کی کیفیات قلبی دیدنی ہوتی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

مدینہ شہر نہیں ہے مری تمنا ہے
مدینہ ایک اشارا ہے روشنی کی طرف
مدینہ ایک کنایہ ہے زندگی کے لئے
مدینہ صوت و صدا کے بغیر حسن کلام
مدینہ حسن سماعت کو اک پیام بھی ہے

....

تسکین دل و جاں کی ہر اک صورت مطلوب
طیبہ کی ہوا ہے مرے مولا مرے آقا
وہ گنبد خضریٰ کے قریں طائر تنہا
کشفی کی نوا ہے مرے مولا مرے آقا

فضا میں ان کے ہونٹوں کی صدا رہے
مدینے کی سحر ہے اور میں ہوں
حرا سے سبز گنبد تک مسلسل
سفر اندر سفر ہے اور میں ہوں

....

آسماں گنبدِ خضریٰ سے فرو تر نکلا
یہ حقیقت ہے ہمیں کوئی نظر کا نیرنگ
غیب بھی ان کے کرم سے مری نظروں پہ کھلا
میں نے دیکھی ہے مدینے میں بہشت صدرنگ

....

روشن ہے میرے خواب کی دنیا مرے آگے
تعبیر بنا گنبدِ خضریٰ مرے آگے
افلاک کو جھکتے ہوئے دیکھا ہے نظر نے
ہے خواب گہ شہر مدینہ مرے آگے

حضورﷺ سے نسبت کا شرف رکھنے والے سید کشفی مدینہ طیبہ کی فضاؤں میں کیا کچھ محسوس کر رہے ہیں۔ اس کا تذکرہ متذکرہ بالا اشعار سے بخوبی ہو رہا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ مدینہ منورہ تو حضور نبی کریم ﷺ کی آمد سے پہلے ''یثرب'' تھا۔ وہ یثرب جو بیماریوں کا مرکز اور ظلمتوں کا گہوارہ تھا مگر جب حضورﷺ کے قدم مبارک اس سرزمین پر پہنچے تو یہ شہر نبی یک بیک مدینہ منورہ بن گیا۔ یہی مدینہ منورہ عالم اسلام کی تمناؤں کا مرکز اور آرزوؤں کا حاصل بن گیا۔ یوں تو خاکِ حرم کا ہر ذرہ صورتِ نجم ہدایت ہے اور یہاں کے کنکروں پر لعل و جواہر تصدق ہوتے ہیں مگر اس مقام نور کا کیا کہنا کہ جہاں محمد دو عالم ﷺ حیات ظاہری کے تریسٹھ برس گزار کر آرام فرمائیں۔ یہ مقام سجدہ گاہِ قدسیاں ہے۔ سراسر عرش نشاں ہے۔ باعث رشک باغ جناں ہے۔ ایک شاعر کے بقول،

نبی کا جس جگہ پر آستاں ہے
زمیں کا اتنا ٹکڑا آسماں ہے

زمین کا یہی ٹکڑا جو گنبد خضریٰ ہے۔ مواجہ شریف کی صورت میں عشاق کو دعوتِ نظارا دے رہا

ہے۔ ایسا نظارہ جو مودب نظروں کا قبلہ اور باوضو قلوب کا کعبہ ہے۔ یہی مواجہ شریف ہے جہاں درودوسلام کی ایمان آفریں صدائیں ہر لحظہ اور ہر آن اُبھرتی ہیں۔ چودہ سو سالوں پر محیط شب وروز کا ایک لحہ بھی ایسا نہ ہوگا جب درودوں کے گلاب بارگاہِ حضورﷺ میں نذر نہ کئے گئے ہوں جب سید کشفی کے قدم اس مقام سربلند تک پہنچتے ہیں تو جذبات اشکوں میں ڈھل جاتے ہیں، سانس رک رک کر چلتا ہے۔ بے زبانی ہی ترجمانِ شوق بن جاتی ہے۔ اس موقعہ پر ''مواجہ شریف میں ایک آواز'' کے عنوان سے اپنے جذبات کو ایک زمانے کے جذبات میں ڈھال دیتے ہیں۔

دیارِ غرب میں آنکھیں کسی کی اشک افشاں
دیارِ پاک میں نغمہ کسی زباں پہ ہے
کسی ضعیف کی بے نور ہوتی آنکھوں میں
جمالِ گنبدِ خضریٰ ابھی منور ہے
وہ خوش نصیب ہیں جن کو ترا پیام ملے
''ہزار بار برو صد ہزار بار بیا''

....

ستونِ توبہ پہ ہونٹوں کو رکھ دیا میں نے
خبر ملی کہ تمنائے سیدِ والا
مری نجات کا رستہ بھی ہے، وسیلہ بھی
ستونِ توبہ کے ہونٹوں سے یہ صدا آئی
''ہزار بار برو صد ہزار بار بیا''

یہی مواجہ شریف ان کی تمناؤں کی نظری جنت ہے وہ جنت کہ جس کا ایک ایک نظارا انہیں حیاتِ نو کی بشارت دے رہا ہے۔

روشن ہے مرے خواب کی دنیا مرے آگے
تعبیر بنا گنبدِ خضریٰ مرے آگے
افلاک کو جھکتے ہوئے دیکھا ہے نظر نے
ہے خواب گہ شاہِ مدینہ مرے آگے

ایک محبّ صادق کی طرح سید ابوالخیر کشفی کو احساس ہے کہ حضورﷺ توحید خداوندی کے انوار

کو دلوں میں اُجاگر کرنے کے لئے آئے تھے۔ آپ کی تعلیمات ایک ایک حرف شہپارۂ قدسی ہے۔ آپ کی سیرت وہ مینارۂ نور ہے۔ جس سے پھوٹنے والی روشنی ابد تک سفر کرنے والے قافلوں کو انسانیت نوازی کے آداب عطا کرتی رہے گی۔ رب کریم نے اپنے محبوب ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو عالمِ انسانیت کے لئے ہر دور میں وجہ سرفرازی قرار دیا تھا۔ آپ کا کردار قرآنِ مجید کی تفسیر تھا۔ قرآن مجید کا حقیقی متن اُسوۂ حضور ﷺ ہی میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اسی لئے تو حضور ﷺ کی ذات والا صفات کو بولتا ہوا قرآن کہا گیا ہے۔ اسی قرآن ناطق نے اپنی تعلیمات سے زمانے کا رخ تبدیل کر دیا۔ بڑوں کو دانائی اور عرب کے شتر بانوں کو شوکت و دارائی عطا کی۔ آپ کی سیرت اور آپ کے ارشادات وہ صحیفۂ رشد و ہدایت ہیں کہ جن سے بڑھ کر عام کرنے والے کسی منشور کا تصور بھی ہیں کیا جا سکتا۔ ایک شاعر کے لفظوں میں۔

ترے در کے سوا آسودگی دل کہاں ملتی
زمانہ تیرے در پر ٹھوکریں کھاتا ہوا آیا

سید ابوالخیر کشفی کے لئے ذکرِ رسول ﷺ سیرت و کردار کی انسانی سربلندیوں کو اُجاگر کرنے کا ذریعہ ہے۔ سیرت حضور کی لمعہ افشانیوں کو قلب و جان کا اعزاز بناتے ہوئے کہتے ہیں۔

یہ سلسلۂ صدق و صفا کس سے ملا ہے؟
افکار کو اندازِ حیا کس سے ملا ہے؟
سرکارِ دو عالم کے سوا کون امیں ہے
اللہ کا پیغام ہدیٰ کس سے ملا ہے
ہر نقش میں اک شان کریمی ہے خدا کی
یہ پردۂ انوار و ضیا کس سے ملا ہے

....

ہر غیب اک شہود تھا جس شخص کے لئے
وہ رحمت تمام تھا بینائی دے گیا
وحشت کدے میں صاحب معراج آدمی
انسانیت کو انجمن آرائی دے گیا
حرف و بیاں میں جس کو سمیٹا نہ جا سکے
وہ شخص کائنات کو گویائی دے گیا

حسن تغزل شاعری کی جان ہے۔ غزل اور نعت میں تغزل کے پیرائے مختلف ہوتے ہیں۔ غزل میں محبوبانِ مجازی کی توصیف میں شاعر کے قلم کا راہوار جہاں تک پہنچنا چاہیے۔ پہنچ سکتا ہے مگر نعت میں شریعت اور عقیدت کو زادِ سفر بنا کر آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ ابوالخیر کشفی ایک سکہ بند نقاد' نثر نگار اور شاعر ہیں۔ وہ نعت میں تغزل کی طہارت فکر کو سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ حسنِ تغزل کی جلوہ سامانی مصنوعی جذبات کے اظہار سے نہیں بلکہ کمال عقیدت کے اقرار سے ہوتی ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ انوارِ قرآن سے راہنمائی لے کر محبت رسول کے قلزم نور میں غوطہ زن ہو کر اپنے وجدان کو تجلیات حضور ﷺ کی نذر کر دے تو پھر قلم کی نوک سے الفاظ کی جگہ گلاب نکھرتے ہیں۔ جذبوں کی ہوک عشق کی کوک بن جاتی ہے۔ ''نسبت'' کا شاعر فکر دین کے امتزاج سے ایسی کیفیات سے گزرتا نظر آتا ہے۔

ہر ایک خلوت جاں میں اسی کی محفل ہے
ہر ایک شخص کو اپنا دکھائی دیتا ہے
غبارِ تشنہ لبی میں نگاہِ اُمت کو
اسی کی ذات کا دریا دکھائی دیتا ہے
جہاں میں ذات محمد ﷺ کے سینکڑوں جلوے
نگاہِ شوق کو کیا کیا دکھائی دیتا ہے

....

خاکِ درِ سرکار سے نسبت ہے کچھ ایسی
عنوان مرے دل کے مقالے کے لئے ہے
بے چہرہ سہی عالمِ اسلام کا امروز
پر گنبد خضریٰ تو حوالے کے لئے ہے
میں خواب میں سرکار کو دیکھوں گا کسی دن
معراج یہی چاہنے والے کے لئے ہے

سید ابوالخیر کشفی گنگ جذبوں کو گویائی اور بے جان لفظوں کو مسیحائی دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ الفاظ اور جذبے بذاتِ خود کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ سرزمین غزل کے مسافر بھی بن سکتے ہیں اور منزل طیبہ کے پرشوق نظاروں کی جانب اپنا رخ بھی موڑ سکتے ہیں۔

بات تو فقط نسبت کی ہے؟ ان جذبوں کا حاصل کون ہے؟ ان تمناؤں کا محور کون ہے؟ ان تخیلات کا بحرِ بے کراں کا ساحل کون ہے؟ بات کس کی ہو رہی ہے اور بلندیوں کی جانب اُڑان کا جذبہ رکھنے والے طائرانِ سدرہ پرواز کی نگاہوں میں کسی کی تجلیات بسی ہوتی ہیں۔ ''نسبت'' کا مطالعہ سید کشفی کے جذبات عقیدت کی رفعتوں کا واضح اعلان ہے۔ وہ رفعتیں جو سرزمین طیبہ کے ذرات رہگزار کو بوسہ دے کر اپنے وجود سے آشنا ہوتی ہیں۔

''نسبت'' کا مطالعہ قاری کے افکار کو ذوق وشوق کی لذت، احساسات کو وارفتگی کی عظمت، اور سوچ کے دائروں کو قربت مدینہ کی سعادت عطا کرتا ہے۔ مہکتے ہوئے اشعار پڑھنے والوں کے قلوب کو روحانی تسکین سے بہرہ ور کرتے ہیں۔ نظریاتی شادمانی اور فکری شادکامی کا مسلسل اور بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ قاری ''نسبت'' کے حوالے سے جوں جوں آگے بڑھتا ہے اس کے جذبات بھی شہر محبوب کی زیارت کے لئے مچلنے لگتے ہیں۔ سید کشفی ایجاز واختصار کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ وسعت پذیر موضوعات کو چند لفظوں میں سمیٹنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ خصائل وشمائل حضور سے سیرت مصطفیٰ ﷺ تک اور زبان بیان کی حلاوت اندرتریوں سے نسبت سرورِ کونین ﷺ کے ضو بار ادراک تک انہوں نے منور منور اشعار کی کہکشاں سجائی ہے۔ ایسی کہکشاں کہ جس کا ہر ستارہ ماہتاب سخن گوئی کی تب وتاب رکھتا ہے۔

☆......☆......☆

سید صبیح الدین صبیح رحمانی

توصیفِ حضور ﷺ سے نعت رنگ کی ادارت تک

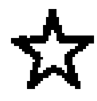
تاریخ شاہد ہے کہ محبت رسول ﷺ سے فکری اور عملی وابستگی ہمیشہ بلند مقام عطا کرنے کا باعث بنتی ہے اس لحاظ سے وہ فرزندانِ اسلام نہایت خوش بخت ہیں جو اپنی عملی اور نظریاتی صلاحیتوں کو ذکر و فکرِ رسول ﷺ کی نذر کر دیتے ہیں۔ ان کی آنکھ سے ٹپکنے والے آنسو، زبان سے اعجاز بیان بن کر اُبھرنے والے دلکش و دلآویز جملے ہیں یا قلم کی نوک سے نعت مصطفوی ﷺ کے مچلنے والے ستارے یہ سب محبتِ حضور ﷺ کے سبب سے عطا ہوتا ہے۔ سید صبیح الدین صبیح رحمانی بھی اسی سلسلہ نور کے قابلِ فخر رکن ہیں جن کی نعت خوانی اور نعت گوئی سے ایک زمانہ فیضیاب ہو رہا ہے۔

جس طرح شاعری بحور اور اوزان کی پابند ہوتی ہے اسی طرح نعت خوانی بھی مخصوص آہنگ اور جمالِ صوت کے قالب میں ڈھل کر اپنا وجود منواتی ہے۔ اگر نعت خوانی میں اسلوب نعت خوانی اور اس حوالے سے جملہ پابندیوں کو ملحوظ رکھا جائے تو پھر اچھا نعت خواں ایک وقت آنے پر قابلِ فخر نعت گو شاعر بھی بن سکتا ہے۔ صبیح رحمانی اس کی روشن مثال ہیں۔ انہوں نے ارادات ِحضور ﷺ کے اظہار کا ذریعہ شروع میں نعت خوانی کو بنایا۔ فیاضیٔ قدرت نے نوازشوں کے در کھول دیئے اور وہی صبیح رحمانی جو محفل میں دوسرے نعت گو شعراء کا کلام سنایا کرتے تھے۔ بہت جلد اس قابل ہو گئے کہ اپنے نعتیہ کلام سے سامعین کے احساسات کو ضوبار کرنے لگے اور پھر ان کی نعت کا سلسلہ تو پھیلتا ہی گیا۔ اس وقت ان کا شمار گنتی کے ایسے اصحابِ نعت میں ہوتا ہے جو ایک ہاتھ میں نعت گوئی اور دوسرے ہاتھ میں نعت خوانی کا پرچم تھامے گنبدِ خضریٰ کی جانب دیوانہ وار لپک رہے ہیں۔ ان کے اندر یہ احساس پوری شدت کے ساتھ اُجاگر ہے کہ یہ سب عطائے رسولؐ ہے اور نبی رحمت ﷺ کی عطاؤں نے انہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے یہی احساس ان کی متاعِ فکر و فن ہے۔

ملی ہے کاسۂ فن کو مرے خیرات طیبہ سے
مرا دیوان ہے ان کی عطا اوّل سے آخر تک

یہ اوّل سے آخر تک عطائے رسول ﷺ کا سلسلہ ہے جو صبیح رحمانی کی صلاحیتوں کو جگمگاتا ہوا پھیلتا ہی جاتا ہے۔ صبیح نے معلوم نہیں کن بہار آفریں ساعتوں میں مداحِ حضور ﷺ کے گلستان میں قدم رکھا تھا کہ خوش بختیاں ان کا مسلسل احاطہ کرتی گئیں۔ نعت خوانی سے نعت گوئی تک ان کا سلسلہ اس قدر دراز اور گداز آفریں معلوم ہوتا ہے کہ گمان ہی نہیں گزرتا کہ اس سعید بخت انسان نے یہ سب کچھ مختصر سے عرصے میں حاصل کرلیا ہے۔ سرچشمۂ محبت رسول ﷺ سے سیرابیٔ افکار کا سامان حاصل کرتے ہوئے ان کے باطن سے مسلسل یہی صدا اُبھر رہی ہے۔

قلم کی پیاس بجھتی ہی نہیں مدحِ محمد ﷺ میں
میں کن لفظوں میں اپنا اعترافِ تشنگی لکھوں



قلم خوشبو کا ہو اور اس سے دل پر روشنی لکھوں
مجھے توفیق دے یارب کہ میں نعتِ نبیؐ لکھوں

اور اب ایک نظر صبیح رحمانی کی نعت کے حوالے سے کی جانے والی کاوشوں پر بھی ہو جائے۔ صبیح رحمانی بلاشبہ جمالِ نعت کے جلوؤں میں گم رہنے والے خوش بخت شاعر ہیں۔ انہوں نے تدریجی انداز سے نئی منزلوں کی جانب اپنا سفر جاری رکھا۔ نعت خوانی میں اپنا منفرد مقام اس حیثیت سے اُجاگر کیا کہ قدرت ان پر از خود مہربان ہوتی گئی اور پھر نعت گو شاعر کی حیثیت سے ان کا نام اُبھرا۔ پہلے تو بہت سے لوگوں کو یقین ہی نہ آیا کہ چھوٹی عمر کا نوجوان (جو ابھی جوانی کے مراحل طے کررہا ہے) کس طرح اتنی خوبصورت نعتیں کہنے لگا ہے۔ نعت گوئی حیثیت سے اپنا مقام منوالیا تو پھر ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اب ان کی منزل فروغِ نعت تھی اگرچہ نعت خوانی اور نعت گوئی بذاتِ خود فروغِ نعت ہی کا حصہ ہیں لیکن انہوں نے ''نعت رنگ'' کا اجراء کرکے نعت گو شعراء کو انتہائی موثر پلیٹ فارم مہیا کردیا۔ اگرچہ اس سے قبل کئی رسائل وجرائد نعت کی اشاعت کر رہے تھے مگر صبیح رحمانی کا فروغِ نعت کا مشن اوروں سے بہت حد تک جدا تھا۔ انہوں نے نعت رنگ کو فقط نعتیہ شاعری کا صحیفہ ہی نہیں بنایا بلکہ اس کے صفحات کا بیشتر حصہ نعت کے حوالے سے لکھے جانے والے مقالات اور مضامین کے لئے وقف کردیا۔ اس ضمن میں فقط نعت گو شعراء کے تذکار پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ نعت کے حوالے سے مختلف عنوانات کے تحت مضامین پیش کئے جانے لگے ایسے مضامین کو خصوصی اہمیت دی جانے لگی جن میں فروغِ نعت اور نعت گو شاعروں کی

تخلیقی کاوشوں پر ناقدانہ انداز اپنایا گیا تھا۔ تنقید نعت کا انداز پہلی مرتبہ اُجاگر ہوا چونکہ یہ روش نئی تھی اس لئے بہت سے اصحابِ فکر چونک پڑے بعض نے سخت رویہ بھی اپنایا مگر صبیح رحمانی کے پیشِ نظر فقط شخصیات نہیں تھیں بلکہ ان کی عملی کاوشیں تھیں اس لئے آہستہ آہستہ ان کا انداز پُر تاثیر لے کی صورت میں دلوں میں اُترتا گیا۔

صبیح رحمانی نے نعت رنگ کو معمول کا ہلکا پھلکا رسالہ نہیں بنایا بلکہ اسے آہستہ آہستہ تحقیقی دستاویز کی صورت عطا کر دی۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے انہوں نے ممتاز قلم کار شعراء اور اصحابِ نقد و نظر کا تعاون حاصل کیا۔ اس طرح نعت رنگ نے بہت جلد ایسے فکری پلیٹ فارم کی حیثیت حاصل کر لی جس سے اُبھرنے والے پیغام سے کوئی بھی صاحبِ فکر صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ آج یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نعت رنگ محض ایک رسالہ نہیں بلکہ ایک تحریک بن چکا ہے ایسی تحریک جو ابلاغِ نعت اور فروغِ نعت کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہے۔ صبیح رحمانی نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ شخصیت پرست نہیں بلکہ فن کا قدردان ہے اور نعت میں تو فقط ایک ہی شخصیت ہوتی ہے اور وہ ہے ممدوحِ نعت حضرت محمد ﷺ۔ صبیح رحمانی نے محبت رسول خدا میں غائت درجہ مغلوب ہو کر احترامِ نعت کے فکری پہلوؤں اور عملی تقاضوں کو اُجاگر کیا ہے اس پر یہ حقیقت پورے افتخار کے ساتھ اُجاگر ہے کہ محض اپنی طرزِ فن کے لئے کام کرنے سے نام نہیں بنتا بلکہ ممدوحِ نعت حضور ﷺ کے جلوؤں میں گم ہو کر حیاتِ ابدی کی آرزو کی جاسکتی ہے اسی لئے صبیح رحمانی نے بڑے بڑے ناموں سے کہیں زیادہ ان کے کام کو دیکھا ہے گویا ان قلم کاروں پر جتلا دیا ہے کہ عظمتِ فن کی تمنا لے کر اس گلزار مدحت میں نہ آؤ بلکہ یہاں آنا ہے تو عجز و انکسار اور خلوص و ارادت کو زادِ سفر بنا کر آؤ آگے سرکار کی مرضی ہے جتنا چاہے نواز دیں۔ نعت رنگ کی مسلسل اشاعت اس حقیقت کا اعلانِ عام ہے۔ صبیح رحمانی نے ابلاغِ مدحت کے بنیادی اصولوں کو پالیا ہے اور وہ جس عجز و انکسار کی دنیا کا خود باسی ہے دوسروں سے بھی اسی کا تمنائی ہے۔

صبیح رحمانی سے میرا تعلق اتنا قدیم بھی نہیں لیکن اس ہمت آزما شخصیت نے اپنے قلم اور زبان سے زمین و مکان کے فاصلے یوں مٹائے کہ بالمشافہ ملاقات کے بغیر ہی یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے یہ تعلق اُفق تا اُفق پھیلا ہوا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی برق رفتاری نے پوری دنیا کو ”گلوبل ولیج“ بنا دیا ہے بس یہی کام صبیح رحمانی کے اخلاص کریمانہ نے یوں کر دکھایا ہے کہ کراچی اور گوجرانوالہ کے فاصلوں کو سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا ہے کہ صاحب نہ آپ گوجرانوالہ میں ہیں

اور نہ ہی میں کراچی میں۔ آمنے سامنے ہیں کہیے کیا لکھ رہے ہیں؟ میں لکھ رہا ہوں یا یہ لکھوار ہے ہیں، بات ایک ہی ہے۔ اب تو سبحان اللہ بالمشافہ ملاقات بھی ہو چکی ہے۔ جب بھی ملاقات ہوئی اس میں ادھر اُدھر کی باتوں کے بجائے مقصدیت غالب رہی۔ وہ اپنے عزائم کا اظہار کرتے ہوئے عقیدتوں کے پھول چنتے رہے کہ نعت کے میدان کو بعض سہل نگاروں نے محدود کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ موضوع انتہائی ہمہ گیر، وسیع اور لامحدود ہے۔ نعت سے فقط دلوں کے گلزاروں کو مہکانے کا کام ہی نہیں لیا جا سکتا بلکہ اس سے تبلیغِ دین اور بالخصوص تبلیغِ سیرتِ محمدی ﷺ کا کام لیا جا سکتا ہے۔ نعت کے پیغام میں وسعت ہے اس کے قالب کی وسعتیں انقلاب برپا کرنے کا تقاضا کرتی ہیں۔ ہمارے شعراء اور ناقدینِ نعت اس جانب سنجیدگی سے متوجہ ہو جائیں تو نعت عصرِ حاضر کے فکری اَدب کی نقیبِ اوّل بن سکتی ہے۔ صبیح رحمانی ایسی باتیں صرف سوچتے یا کہتے ہی نہیں ہیں بلکہ ہزار جان سے اپنی راست فکری پر عمل پیرا بھی ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ

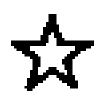
لڑکھڑاتا ہوا جب چلا ہوں بھیڑ نے راستہ دے دیا ہے
راہِ ہستی میں ان کے کرم نے کس جگہ پر سنبھالا نہیں ہے



ان کی مدحت پہ مامور ہوں میں غیر کی مدح سے دور ہوں میں
فکر و فن کو صبیح اپنے میں نے غزلوں میں ڈھالا نہیں ہے

جب پیغام نعت اور انقلاب نعت کی بات آتی ہے تو پکار اُٹھتے ہیں:

زیست کے تپتے ہوئے صحراؤں میں ان کا وجود
ان کی یاد ان کی تمنا ان کی سیرت کا گلاب



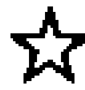
نکل آئیں گے حل سب مسئلوں کے چند لمحوں میں
حیات مصطفےٰ کو سوچنا اول سے آخر تک

ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق (بھارت) ان کی نعتیہ شاعری کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔ ''صبیح رحمانی نے اپنی عمر کے تھوڑے حصے میں جو کام کر دیا ہے وہ بہت ہے۔ جس خلوص اور جوش و خروش سے وہ اس راہِ میں آگے بڑھ رہے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ فکرِ سخن میں ان کا انہماک نئے نئے اسالیب کی تلاش، خوش آہنگ الفاظ دلآ ویز ترکیبوں، بدیع تشبیہات اور استعارات سے اپنے کلام

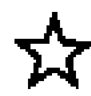
کو مزین کرنے کی فکر، یہ ان کی زندگی کا ایک ایسا مشغلہ ہے جو اپنی کیفیت میں عبادت سے کم نہیں۔ یہ ان کی ذہنی اور قلبی فضا کی تطہیر کے لئے ایک وظیفہ ہے۔ کلام میں تشبیہات اور استعارات کی جدّت ان کے مذاق سلیم اور ان کی شعر گوئی کی صلاحیت پر شاہد ہے۔"

صبیح رحمانی کے لئے نعت حاصلِ حیات ہے۔ فکر و فن کا اعزاز ہے۔ قرطاس و قلم کی آبرو ہے۔ عشق و عقیدت کی نئی منزلوں کے لئے ذوقِ جستجو ہے۔ نعت ان کا ایمان ہے۔ عشق کا اظہار ہے۔ لفظوں کا افتخار ہے۔ یہ لفظوں سے خوشبو اُگانے کا ہنر جانتے ہیں اور پھر یہی خوشبو زمانے بھر میں لٹانے کا عزم رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی شاعری عمل کا پیغام دیتی ہے۔ محبت رسول ﷺ کے حوالے سے باطل قوتوں سے ٹکرا جانے کا حوصلہ عطا کر دیتی ہے۔ اس لئے ہم نے کہا ہے کہ ان کے لئے نعت فقط سوز و گداز کا نام ہی نہیں بلکہ وقت کے ظلمت کدوں میں بصد جلال ایمانی شمعِ عمل روشن کرنے کا عزمِ پیہم بھی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

لب پہ نعت پاک کا نغمہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے
میرے نبی سے میرا رشتہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے



فکر نہیں ہے ہم کو کچھ بھی دکھ کی دھوپ کڑی تو کیا
ہم پہ ان کے فضل کا سایہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے

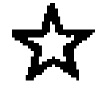


بتلا دو یہ گستاخِ نبیؐ کو غیرتِ مسلم زندہ ہے
ان پہ مر مٹنے کا جذبہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے

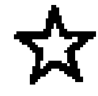
سید صبیح رحمانی بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ نعت اوّل و آخر حسن ہے۔ جمالِ آگہی ہے کمالِ آرزو ہے۔ حسنِ بصیرت ہے۔ نورِ یقین ہے۔ وظیفۂ قلب و جان ہے۔ وقت تہجد شبنم کے قطروں سے وضو کرتی ہوئی گلاب کی پتیوں کی طرح سرمایۂ عشق و گداز ہے۔ یوں تو ہر نعت جو محبت رسول ﷺ کے فکری اور عملی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سرمایۂ ایمان ہے مگر اُن نعتوں کا حسن ہی کچھ اور ہوتا ہے جو اپنے مترنم لب و لہجے، وجدانی سرمائے اور بہار آفریں مصرعوں کی بدولت کلکِ شاعر سے ٹپک کر پڑھنے والوں کے دلوں پر اپنی دائمی جگہ بنا لیں۔ صبیح رحمانی نے اپنی مترنم اور تغزل آفریں نعتیہ شاعری سے کچھ ایسا ہی رنگ جمایا ہے۔ یہ اشعار پڑھیے اور آنکھوں سے مدینے

والے کی عقیدت کے آنسوؤں سے وضو کرنے کا انداز دیکھئے۔

حضورؐ ایسا کوئی انتظام ہو جائے
سلام کے لئے حاضر غلام ہو جائے



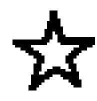
تجلیات سے بھرلوں میں کاسۂ دل و جاں
کبھی جو ان کی گلی میں قیام ہو جائے



مزا تو جب ہے فرشتے یہ قبر میں کہہ دیں
صبیح مدحتِ خیرالانام ہو جائے

صبیح رحمانی نے جس پیغامِ نعت کو عام کرنے کا پرچم لہرایا تھا وہ آج دور حاضر کا اعزاز بن چکا ہے۔ صبیح رحمانی کی نعت گوئی ہو یا نعت رنگ کے تاریخی سلسلے کی صدائے بازگشت آج اس مداحِ رسول ﷺ کا پیغام لمحے لمحے میں سما چکا ہے بلاشبہ اس کا یہ افتخار حاصلِ زیست بن چکا ہے۔

میں ہوں وقفِ نعت گوئی کسی اور کا قصیدہ
مری شاعری کا حصہ کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا



مرے طاقِ جاں میں نسبت کے چراغ جل رہے ہیں
مجھے خوف تیرگی کا کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا



کسی وہم نے صدا دی کوئی آپ کا مماثل
تو یقین پکار اُٹھا کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا

اس پوری نعت میں کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا'' کی ردیف صبیح رحمانی کے ایمان کی پختگی اور حضور ﷺ سے انمٹ محبت اور وابستگی کا واضح ترین اعلان ہے یعنی شاعر یہ سوچنے کو تیار ہی نہیں کہ اس کے محبوب ﷺ جیسا کوئی اور ہے یا ہوسکتا ہے۔ وہ ایسا سوچنا بھی گناہ کبیرہ سمجھتا ہے۔ تشکیک و اوہام کی دھند میں گرفتار ایسے شعراء کے لئے کہ جو فقط نام واعزاز کے لئے زندہ ہیں اور جب حضور ﷺ سے محبت وعقیدت کے واضح ترین اعلان کا وقت آتا ہے تو لفظوں کی بھول بھلیوں کی

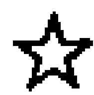
بدولت پہلو بچا کر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صبیح رحمانی کے عشق کی پختگی ایک زمانے کو حضور ﷺ سے غیر متزلزل وابستگی کا حسن عطا کر رہی ہے۔

ڈاکٹر محمد اسحٰق قریشی ناقدانہ انداز سے صبیح کی راست فکری پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ ''نوجوان، باعزم اور ادب آشنا صبیح رحمانی کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق بخشی کہ در بدری کی رسوائیوں سے محفوظ رہا اور نوخیزی کے ایام ہی میں جادۂ رحمت کا راہی بنا، غزل کی جلترنگ میں جوانی کے لئے بڑی ترغیبات ہوتی ہیں مگر قدرت نے اس جوان کو دورِ تربیت ہی میں ایقان کی پختگی عطا کر دی۔ کتنا بڑا اعزاز ہے کہ صبیح رحمانی کا شعری شعور صرف ایک پیکرِ جمال سے مستنیر ہے۔ اس لئے اسے اعتماد ہے۔

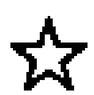
بس اس نام کی خوشبو ہے مرے ہونٹوں پر
بس یہی نام دو عالم میں بڑے کام کا ہے

صبیح رحمانی ایک بلند فکر نظریاتی شاعر ہے جو سوز و گداز سے عشق و عقیدت کے نئے نئے عنوان تراشتا ہے۔ فکر و فن پر غرور نہیں کرتا بلکہ بارگاہِ رسول ﷺ میں عاجزی اور عجز شعاری کو خضر راہ بناتا ہے اس کا ایمان ہے کہ ذاتِ رسالتمآب ﷺ اس قدر بلند، عظیم اور رفیع المرتبت ہے کہ ان کے حضور فرشتے بھی دم بخود حاضر ہوتے ہیں جہاں فنی تفاخر سے نہیں بلکہ انتہائے عاجزی سے آگے بڑھنے کا موقعہ ملتا ہے۔ جسے حضور ﷺ کی غلامی کی نسبت نصیب ہو جائے اس کے سامنے زمانے بھر کا جاہ و جلال ہیچ ہے۔ اسی کمالِ عجز کا انداز صبیح رحمانی کے ہاں ملاحظہ کیجئے۔

نظر کے ریگزاروں کو متاعِ نقشِ پا دے دو
میں ہوں تاریک راتوں میں اُجالوں کا پتہ دے دو



میں نواحِ شب میں بھٹک گیا نئے سورجوں کی تلاش میں
کوئی روشنی کہ بدل سکے مری شب کا حال مرے نبیؐ



مری کیا جرأت کہ بن جاؤں غلامِ مصطفیٰ ﷺ
مجھ کو تو ان کے غلاموں کی غلامی چاہیے

زندگی جہدِ مسلسل اور تحرک سے عبارت ہے۔ یہاں ستانے کا دوسرا نام کوتاہیءِ ذوقِ عمل

ہے اور وقت کی تیز رفتاری کوتاہیءِ ذوقِ عمل کی اجازت نہیں دے سکتی جو مسافر کاروانِ عمل سے بچھڑا سو بچھڑا یہاں منزل اسی کا مقدر بنتی ہے جو ہر آن محوِ جستجو رہنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ صبیح رحمانی کی تمام تر کاوشوں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ کسی طور بھی وقت کے سیلِ رواں کے مقابل اپنی جدو جہد کے پتوار پھینکنے کو آمادہ نہیں ہے۔ صبیح رحمانی کو قدرت نے سیمابی روح عطا کی ہے۔ یہ رکنے کے عمل سے نا آشنا ہے بلکہ خود رکنا تو ایک طرف یہ زمانے کو ساتھ لے کر چلنے کا عزم کیے ہوئے ہے اور خوش بخت ہیں وہ مسافر جو اس کے ساتھ جادۂ رحمت کے مسافر بن گئے۔ یہ انہیں بھی نعت گوئی اور تنقیدِ نعت کے میدان میں مسلسل محوِ عمل رکھتا ہے۔ یہ اسی جہدِ مسلسل کا ثمر ہے کہ آج ''نعت رنگ'' کے ظاہری و باطنی مواد، فکری محاسن اور مضامین کے تنوع کی صدائے باز گشت دنیا بھر کے ایوانوں میں سنی جا رہی ہے۔ صبیح رحمانی نے اپنی کاوشوں اور خداداد صلاحیتوں سے مجلّہ نعت رنگ کو یوں نقشِ دوام بخشا ہے کہ آج اس مجلّہ کا ہر شمارہ نعتیہ انسائیکلوپیڈیا کی ایک کڑی معلوم پڑتا ہے۔ دعا ہے کہ ربِ کریم صبیح رحمانی کے عزائم کو مزید وسعت اور اس کے حوصلوں کو مزید فراخی عطا کرے تاکہ یہ سعید بخت نعت گو اور نعت رنگ کا مدیرِ شہیر وہ سب کچھ کر گزرے جس کا تصوّر کر کے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ آمین بحرمتہ سیّدالمرسلین۔



مسدس کی ہمہ گیری اور
انور جمال کی مدحت نگاری

اگرچہ شاعری کا تعلق شاعر کی وارداتِ قلبی اور فکری تگ و تاز سے ہوتا ہے اور شاعر اپنے مدعا کو پیش کرنے کے لیے کسی بھی مخصوص صنفِ سخن یا مخصوص اسلوب کا پابند نہیں ہوتا۔ جس طرح ''نالہ پابندِ نے نہیں ہے۔،، اسی طرح سخن گو بھی کسی ایک صنفِ ادب تک خود کو محدود نہیں رکھتا۔ شاعروں، نغمہ گروں اور سخن طرازوں نے جملہ اصنافِ شاعری میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا جادو جگایا ہے۔ غزل، مثنوی، رباعی، ہائیکو اور مسدس سمیت انہوں نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ دراصل بعض اوقات کلام خود اپنے لئے راہیں ہموار کرتا ہے اور کلام کی موزونیت خود بخود مخصوص صنفِ سخن کا تقاضا کرتی ہے۔ حمد، نعت، مرثیہ اور قصیدہ سمیت ہر مضمون کو ہر صنفِ سخن میں ادا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی، یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض مضامین کو ادا کرنے کے لئے بعض اصناف سخن مخصوص ہو کر رہ گئیں۔ ان میں سے ایک اہم صنفِ سخن مسدس ہے۔ جس میں ہر مضمون کو سمونے اور شاعری کے مطالبِ شعری کو بشرح کمال بیان کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

مسدس کا ہر بند چھ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن مسدس کے ترکیبی عناصر میں بلا کی روانی اور الفاظ کی موزونیت ہے کہ جس مضمون کو بھی اس میں سمونا چاہیں، نظر آتا ہے کہ یہ مضمون اور یہ خیال مسدس ہی کے لئے موزوں ہوا ہے۔ تاریخ شعر و سخن پر ایک نظر ڈالتے ہی مسدس کی جامعیت، ہمہ گیریت اور تاثر انگیزی ظاہر ہونے لگتی ہے اور صاف دکھائی دینے لگتا ہے کہ یہ وہ شعری ملبوس ہے جو ہر صنف سخن کے قدِ زیبا پر موزوں نظر آتا ہے۔ مسدس میں ادا ہونے والے مضامین اور اصناف کو دیکھ کر اس کے دامان کی وسعت اور قالب کی فراخی کا احساس ہونے لگتا ہے حمدِ ربِ جلیل ہو یا نعت سرورِ کونین ﷺ، شہرِ آشوب ہو یا حالات کی سختیوں کا ماجرا، مرثیہ کے دلگداز موضوعات ہوں یا قصیدہ کے توصیفی لوازمات، حالات کی بے رحمیوں کا فسانہ ہو یا زوالِ اُمت کی داستاں، مسدس نے دوسری اصناف کی نسبت کہیں زیادہ بہتر انداز سے مطلوبہ موضوعات کی تصویر کشی کی کوشش کی ہے۔

جہاں تک مدحت و توصیف مصطفیٰ ﷺ کا تعلق ہے تو اس میں مسدس کا حسن اور ہی انداز سے جلوہ گر نظر آتا ہے۔ یہ ''مسدس حالی،، ہی تھی جس نے ایک زمانے کو بیدار کر دیا۔ شعری دنیا میں انقلاب برپا کر دیا اور شعرا کو نعت نگاری کے نئے اسلوب سے آشنا کیا، محشر رسول نگری کی

عظیم نعتیہ تصنیف ''فخرِ کونین''، مسدس کے پیرائے میں سرورِ کونین کی دلآویز سوانح حیات ہے۔ محسن کاکوروی کی نعتیہ مسدس اپنی جگہ بلند مقام کی حامل ہے۔ تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے جب ہم عہدِ حاضر میں داخل ہوتے ہیں تو نعت گو انور جمال کی مسدس ''لولاک لما''، قارئین کے اذہان اور افکار کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ''لولاک لما''، میں انور جمال نے مسدس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے جس کا حقیقی اندازہ اس کے مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے۔

رب دو عالم کا ہم پہ کس قدر احسان ہے کہ اس نے محبوب کائنات حضور ﷺ کو لولاک لما خلقت الافلاک کی خلعتِ دوام عطا کر کے آپ کو ممدوحِ آدم و بنی آدم بنا دیا۔ اب کون بے بصر ہے جو حسن و جمال مصطفویؐ کی لمعہ افشانیوں کو قلب و نظر کی زینت بناتے ہوئے آپ کی بارگاہ میں توصیف و ثنا کی ڈالیاں نذر کرنا نہ چاہے گا۔ سلطانِ دو جہاں اگر کرم بار ہو اور تحدیثِ نعمت کا جذبہ برقرار ہو تو پھر ذرات بے مایہ کو بھی مہرِ علم و آگہی کی مدحت و توصیف کا حوصلہ عطا ہونے لگتا ہے مدحت سرائی کے اسی ذوقِ سرمدی کی لے سے نعتِ مصطفویؐ کی نے ابھرتی ہے۔ آرزو کی خامکاری سے عشق کی جاں سپاری جنم لیتی ہے عقیدت کی وسعتوں سے مدحت کی رفعتوں کا اہتمام ہوتا ہے اور محشرستانِ خیال میں عشق مصطفویؐ کے نخلِ ایمانی کی چھاؤں تلے نعتِ سرکارِ دو عالم ﷺ واماندگانِ ہستی کو روحانی و فکری سکون سے بہرہ ور کرنے لگتی ہے۔

نعتِ سرورِ کائنات ﷺ حکم الٰہی کی تعمیل بھی ہے اور جذبات عشق کی تکمیل بھی۔ غلاموں کا آقائے نامدار کے حضور ارمغانِ نیاز بھی ہے اور خاصانِ کائنات کا امتیاز بھی۔ عشاق سرمست کا نغمۂ لاہوتی بھی ہے اور خاک نشینوں کی پروازِ تخیل کا اندازِ ملکوتی بھی۔ شہپرِ عقیدت کا ذوقِ پرواز بھی ہے اور خاموش لبوں پہ مچلتی ہوئی زندگی پرور آواز بھی۔ شاد کام تمناؤں کی صدا بھی ہے اور سرخوش و سرشار جذبات کی نوا بھی۔ ازل کی حسین ساعتوں میں جس ایوانِ نعتِ رسول ﷺ کو زینت بخشی گئی تھی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے درود و سلام کے قدسی زمزموں سے آباد ہو گیا۔ خدائے کریم کی تقلید میں تمام انبیا و رسل مختلف ادوار میں آپ کی ذاتِ والا صفات کو خراج مدحت ادا کرتے رہے لیکن عہدِ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم میں حضرت حسانؓ بن ثابت اور حضرت کعبؓ بن زہیر نے تجلیات نبوی کو آئینۂ دل میں پرتو فگن کرتے ہوئے جس باقاعدہ سلسلۂ نعت گوئی کا آغاز فرمایا وہ خوشنودیٔ مصطفےٰؐ کے طفیل ابد الآباد تک کے لئے مدحت و نعت کی عالمگیری کا مظہر بن گیا۔

ہر دور دورِ نعت ہے اور ہر عہد انوارِ مصطفےٰؐ سے مستنیر ہونے کے لئے نعت کا وسیلہ ڈھونڈتا رہا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں کرامت علی شہیدی، محسن کاکوروی، احمد رضا خاں، علامہ اقبال اور ظفر علی خاں کے حوالے سے جب ہم جدید ادبی دور کا جائزہ لیتے ہیں تو نعت گوئی کو اپنی تمام تر فکری و روحانی کاوشوں کا محور بنانے والے ثنا گویانِ مصطفےٰؐ کے احترام میں بے اختیار جبیں خم

اور پلکیں نم ہونے لگتی ہیں۔۔۔ انور جمال بھی دورِ حاضر کے ان خوش بخت شعراء میں شامل ہیں جنہیں توصیف و ثنائے رسول ﷺ کی دولت بطورِ خاص ودیعت ہوئی ہے انہوں نے ''لولاک لما،، کی صورت میں حضور پُر نور سید یوم النشور ﷺ کی مدحت و توصیف کا ایک ایسا گلشن سدا بہار کھلا دیا ہے جس کی کلیاں جوشِ عقیدت سے چٹکتیں، غنچے اظہارِ شوق کے لئے لب وا کرتے اور پھول فرطِ عشق و عقیدت سے تبسم آفریں دکھائی دیتے ہیں۔ لولاک لما خلقت الافلاک کی تفسیر انور جمال کے قلم عقیدت رقم سے ملاحظہ کیجئے۔

جذبوں میں جوش دل میں تمنا دھنک میں رنگ
برگِ گلاب و نورِ چراغ و شرارِ سنگ
موجیں ہوا پرند ، بھنور مچھلیاں نہنگ
الفاظ صوت گفتگو مضراب جلترنگ
پنہاں نظر سے تھا جو ہویدا کیا گیا
سب کچھ اسی کے واسطے پیدا کیا گیا

''لولاک لما،، میں شاعر نے شاعری کے نام پر اپنے جذبات بے کراں کو عقیدت رسول ﷺ کی زبان بخشی ہے۔ انور جمال ممتاز غزل گو شاعر ہیں لیکن جب آپ غم جاناں اور غم روزگار سے پہلو بچا کر ایوانِ نعت میں داخل ہوئے تو آپ کا فکری مشاہدہ، روحانی مطالعہ، فصاحت و بلاغت کی بوقلمونیاں، ندرت تخیل اور جدتِ بیان آپ کے پابہ رکاب تھے۔ شعری و فکری محاسن سے آپ کا دامانِ علم آباد تھا یہی وجہ ہے کہ ''لولاک لما،، میں جذبات اپنے تمام ترفنی و فکری شکوہ کے ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں۔ الطاف حسین حالی نے مدوجزر اسلام کی صورت میں اصحاب یقین کو جس طور حضور نبی کریم ﷺ کی شخصیت اور سیرت کا احساس دلایا'' لولاک لما،، اسی کی صدائے بازگشت ہے جو پڑھنے والوں کے ذہنی خلوت کدوں میں پوری تاثیر کے ساتھ گونج رہی ہے۔ غزل کی مجازی چکا چوند سے نعت کی ایمانی تب و تاب کی طرف لوٹتے ہوئے انور جمال حرفِ عجز کے نام سے رقمطراز ہیں۔

'' یہ شاعری نہیں۔ شاعری کے لئے میرا ذریعہ اظہار غزل ہے یہ تو ان گداز جذبوں کا تخلیقی اظہار ہے جو ہر وقت میری ذات کے سمندر میں متلاطم رہے۔ کبھی یہ میرے اشکوں میں منقلب ہو کر بہے، کبھی دھڑکن کے ساز میں متشکل ہوئے اور کبھی ان جذبوں نے طویل خاموشی کی ردا اوڑھ لی۔ یہ ساری جذباتی کیفیتیں ہیں جو لفظ محمد ﷺ کے جمال اور جلال کو شعور و وجدان کے سامنے رکھنے سے پیدا ہوتی ہیں،،۔

شاعری میں ایک مشکل مرحلہ مختلف کیفیات کو قلمبند کرنے کا ہوتا ہے اور جب اس

شخصیت کا تذکرہ ہو جس کے نام سے معمورۂ عالم کو شوکتِ نمود ملی، جس کا ذکر حسنِ عبادت، جس کی صورت رشکِ بہاراں اور جس کی سیرت جمال فطرت ہے۔ جس کے تصور سے دلوں میں عقیدت کے فانوس جلتے، دلوں میں زندگی کے ولولے مچلتے، آرزوؤں کے خواب حقائق میں ڈھلتے اور حسرت وحرمان کی بنجر زمینوں میں قبولیت و پذیرائی کے چشمے ابلتے ہیں جس کا نام محمدؐ و احمدﷺ ہے جو پریشاں حال بزم ہستی کا قرار، ٹھکرائے ہوئے انسانوں کا افتخار اور ممدوحِ مخلوق و خالق کردگار ہے تو پھر شاعر اپنے قلم کو زمزم عقیدت میں ڈبوتا اور احتیاطِ شریعت کو اپنی فکر میں سموتا ہوا آگے بڑھتا ہے دعائے خلیل اور نوید مسیحا کے ظہورِ قدسی کی جاں نواز ساعتوں کا تذکرہ ''لولاک لما'' کے حوالے سے ملاحظہ کیجئے۔

سورج نے دیں سحاب رُتوں کی بشارتیں
بادِ سحر نے لکھیں گلوں پر عبارتیں
شب نے مہ و نجوم پر ڈالیں بجھارتیں
اوقات کے ضمیر میں جاگیں حرارتیں
کلیاں نجوم کاہکشاں دیکھنے لگے
اٹھ اٹھ کے راہِ فخرِ زماں دیکھنے لگے



فرخ تھا لمحہ صبح سعادت کا وقت تھا
ایمان کی گھڑی تھی عبادت کا وقت تھا
ساعت تھی آگہی کی بصیرت کا وقت تھا
رب صمد کی خاص عنایت کا وقت تھا
جب کی دعا خدا سے خدا کے خلیل نے
دم بھر کو سانس روک لیا جبرائیل نے

حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی عالی مرتبت شخصیت حُسنِ صورت اور حسن سیرت سے عبارت ہے۔ حسن صورت وہ کہ ازل سے ابد تک کی جمال آفرینیوں کو آپ کے سراپائے اقدس میں سمو دیا گیا۔ مہر و ماہ آپ کی تابانیوں سے مستنیر ہوتے اور نجوم و کہکشاں آپ کی خیرات سے جگمگاتے ہیں۔ نورِ خدا کا مظہر بنا کر آپ کو ''یٰسین وطٰہٰ'' کا مصداق ٹھہرا دیا گیا۔ ادھر آپ کے جمال سیرت کا یہ کمال کہ صادق وامین کے القاب کا حامل ٹھہرا کر آپ کے کردار کو ''اُسوہ حسنہ'' کا نام دیا گیا۔ حقیقی نعت فی الواقع آپ کی صورت وسیرت کے ذکر جمیل سے عبارت ہے مگر بیشتر نعت گو شعراء جب نعت لکھنے بیٹھے تو ان کی نظر آپ کے انوار وتجلیات میں کھو کر رہ گئی اور پھر تمام تر کوشش کے باوجود وہ رُخِ مصطفٰے کی تجلیات سے نظر ہٹانے کی کوشش نہ کر سکے اور آپ کی عظمتِ کردار

سے کما حقہٗ آگاہ ہونے کے باوجود ان کے لئے اس پہلو کو اجاگر کرنا ممکن نہ رہا۔
انور جمال نے نعتِ رسولؐ کے حقیقی خدوخال کو فکر کی وسعتوں میں سموتے ہوئے آپ کے حُسنِ صورت کے ساتھ ساتھ حُسنِ سیرت کو بھی حاصلِ شاعری بنایا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کے جمال جہاں آفریں کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ کو غزل گو شعراء کے روائتی محبوب کی حیثیت سے پیش نہیں کیا ہے۔ وہ انسانِ کامل جو کائنات کے جملہ محامد ومحاسن کا مجموعہ اور بلند ترین خصائل واوصاف کا مرقع ہو اور جس کے لافانی سیرت وکردار کے افق سے روحِ حیات کی تابانیاں پھوٹ رہی ہوں۔ بادہ خوار غالب نے ایک غزل کے نعتیہ مطلع میں کہا تھا۔

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نُور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

غالب کے اسی شعر کے پیش منظر میں انور جمال کی نعتیہ مسدس کا بند پیش نظر ہے۔

جلوہ ہے وہ صفاتِ خدائے غفور کا
وہ عبدہٗ کی شکل میں پیکر ہے نُور کا
چمکا ہے جس کے دم سے مقدر ظہور کا
جس کے قدم کی خاک بھی سرمہ ہے طُور کا
راتوں کی ضو دنوں کا اجالا اُسی سے ہے
دنیا میں روشنی کا حوالہ اُسی سے ہے

اب انور جمال کے قلم سے سیرت وکردار مصطفوی ﷺ کا اظہار دیکھئے۔

ذہنوں کو سوچ ، سوچ کو دانائی بخش دی
مُردوں کو جان ، جاں کو مسیحائی بخش دی
سینوں کو دل دلوں کو توانائی بخش دی
غُربت کو فقر ، فقر کو دارائی بخش دی
افلاس کو وقار عطا کر دیا گیا
مفلس کو اعتبار عطا کر دیا گیا

انور جمال نے لولاک لما کے لئے مسدس کی ہیئت کا استعمال کر کے ایک کڑی راہ اختیار کی ہے۔ بحمد اللہ کہ وہ اس راستے پر پوری احتیاط شریعت اور احترام مقامِ مصطفےٰ ﷺ کو مدنظر رکھتے ہوئے چلے ہیں۔ مسدس کی ہیئت جس تاریخی شعور، زمانی ومکانی صداقت، واقعاتی سچائی اور معنوی ارتقا کے ساتھ ساتھ جس سلاست وروانی کا تقاضا کرتی ہے ''لولاک لما،، ان سب کا مؤثر اظہار ہے۔ حضور ﷺ کا ظہور، آپ کا اعلان نبوت، ظلماتِ کفر کی یورش، رحمتِ دو عالم کی پیہم

عنایتیں، اشرار کفر کی مشرکانہ تگ و تاز، وہ آپ کے لبوں پہ رقصاں تبسم دلنواز، وہ اعدائے دین کی حیلہ سازیاں، وہ سید الکونین کی رحمت نوازیاں، آپ کے خصائل و محاسن، آپ کی سیرت کے نقوش روشن، آپ کے روحانی و نظری کمالات، آپ کے خصائل و معجزات، آپ کی گفتار کی معجز کاریاں، کردارِ سر بلند کی ضو باریاں، خلق عظیم کی اثر آفرینی، وہ بے مثال رحمۃ العالمینی۔ ان سب کی جھلک ''لولاک لما،، کے آئینے میں ضور یز نظر آتی ہے ملاحظہ کیجئے۔

جو بوریا نشین ہے دشتِ حجاز کا
وہ رمز داں ہے کُن کی نوا ہائے ساز کا
محرم ہے وہ مظاہر فطرت کے راز کا
انگلی سے موڑ لائے جو لمحہ نماز کا

جس وقت چاہے کھینچ لے باگیں سحاب کی
اس کی گرفت میں ہیں رگیں آفتاب کی

نعتِ رسولِ کریم! ایک ایسا وسیلۂ اظہار ہے جس کی بدولت بندگانِ خدا کو محبوبِ خدا کی توصیف وثنا کا موقع میسر آتا ہے۔ گنبدِ خضریٰ کی خنک چھاؤں کی خاطر تڑپنے والے مہجور دلوں کے لئے نعت وہ شجرِ طوبیٰ ہے جس کے مہکبار سایے تلے انہیں قلبی سکون اور روحانی طمانیت میسر آتی ہے یا پھر نعت وہ زمزمِ حیات ہے جو زندگی کے جھلستے ہوئے صحرا میں نیم جان عشاق سرمست کو آبِ بقا بخشتا ہے یا پھر نعت وہ قندیلِ نُور ہے جس کی روشنی سے مدحت نگار پہلے اپنی فکری خلوتوں اور پھر کاروانِ شوق کی جلوتوں کو ضیا بار کرتا ہے' سو انور جمال نے بھی ''لولاک لما،، کی صورت میں ایک ایسے ہی چراغِ آرزو کو روشن کیا ہے۔ آج انور جمال فکری و فنی افتخار کے ساتھ نہیں بلکہ تمام تر عجز سامانی کے ساتھ لولاک لما کی ان اٹھائے شہر شوق کے تاجدار پُر انوار ﷺ کے حضور حاضر ہیں۔ یوسف عربی نازش خوبانِ دو عالم کی خریداری کا دعویٰ لے کر نہیں بلکہ ان کی خوشنودی کے طلبگاروں کی فہرست میں اپنا نام لکھوانے کے لئے۔ تو آیئے چند لمحوں کے لئے ہم بھی یہ کہتے ہوئے انور جمال کے ہمنوا بن جائیں۔

اے تُو کہ تیری ذات سے محکم ہے میری ذات
اے تُو کہ تیری ذات پہ نازاں قلم دوات
مجھ پر سدا رہی ہے تری چشمِ التفات
یہ نعت خواں ہو حشر میں بھی تیرے سات سات

حیرت میں ہوں ملک مرے اوجِ نصیب پر
محشر کے لوگ رشک کریں مجھ غریب پر

☆☆☆

منفرد اور سر بلند نعت گو

عبد الغنی تائب

توصیفِ مصطفےٰ ﷺ وہ نعمت عظمیٰ ہے جو ہر کسی کا مقدر نہیں بنتی۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہر دور میں وہی خوش بخت روحِ عصر کہلائے جنہیں بارگاہ لم یزل سے ثنائے حضور ﷺ کی توفیق عطا ہوئی۔ ثنائے رسول وہ لامتناہی داستانِ عقیدت ہے جو پھیلی تو لامحدود تھی مگر جب اسے سمیٹا گیا تو اسمِ محمد ﷺ کی تجلیات میں گم ہو کر رہ گئی۔ اس داستانِ شوق کو عہد ماضی سے دورِ حال اور حال سے زمانہٴ مستقبل تک کا اعزاز بنانے کے لئے جو سعید قسمت شعراء نوکِ خامہ سے جمالِ رسول ﷺ کے گل و لالہ مہکار ہے ہیں اُن میں سے ایک تیزی سے اُبھرتا ہوا نام عبد الغنی تائب کا ہے۔ عبد الغنی تائب دل کی خلوتوں کو مدت سے صورت و سیرت حضور ﷺ کی جلوہ گری سے آباد کیے ہوئے پارہٴ ناں، کے تصور سے بے نیاز ہو کر کرم نواز آقا کے در کی گدائی کو حاصلِ آرزو سمجھنے والے کاروانِ نعت کے معزز رکن، جن کے لئے نعت نمودِ فن نہیں بلکہ روح عبادت ہے۔ کشاکشِ حیات سے فرصت پا کر نعت کے مرکز دامن میں اس طرح پناہ لی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی وادیٔ جاں نواز کے ہو کر رہ گئے۔ جب حاصلِ آرزو دل کا مقدر بن جائے تو پھر کہیں اور جانے کا خیال بھی توہین آرزو کہلاتا ہے۔ کیونکہ

دید حق عشقِ احمد بندگان چیدهٔ خود را
بہ خاصاں می دہد شہ بادهٔ نوشینهٔ خود را

عبد الغنی تائب کی نعت گوئی محض لفظوں کی جلوہ گری نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں وہ غیر معمولی جذبہٴ عشق وارادت موجزن ہے جو عشاق کو دامانِ حضور ﷺ سے قلبی و نظریاتی وابستگی کے اسالیب عطا کرتا ہے۔ شاعر کو احساس ہے کہ مدحت و نعت کے جس کوچے میں وہ قدم رکھ رہا ہے وہاں جنید و بایزید بھی نفس گم کردہ آتے ہیں، وہاں اونچی آواز بھی عمر بھر کا سرمایہٴ عبادت چھین سکتی ہے، وہاں پلکوں سے جاروب کشی کی تمنا کی جاتی ہے، وہاں ناز نہیں بلکہ نیاز کی قبولیت ہے۔ وہاں عاجزی کی سرخروئی اور احساس بے مائیگی کو شوکتِ بندگی عطا ہوتی ہے۔ اس کمالِ عجز نے عبد الغنی تائب کو یہ ادراک بخشا کہ بارگاہِ مصطفوی میں ارمغان نیاز کو وسیلہ اظہار بنا کر ہی وہ خوشنودیٔ

رسول ﷺ کے تمنائی بن سکتے ہیں۔

ارمغان نیاز اگرچہ نعتیہ مجموعہ کا نام ہے مگر یہ نعت گو شعراء اور فنِ نعت گوئی پر مباحث پیش کرنے والوں کے لئے ایک مہکبار ترکیب بھی ہے اور عبدالغنی تائب نے تو شروع سے آخر تک زندگی کا ماحصل یہی بنائے رکھا ہے کہ

شاید اسی کا نام ہے توہینِ جستجو
منزل کی ہو تلاش ترے نقشِ پا کے بعد

اس تناظر میں ارمغانِ نیاز محبت وعقیدت مصطفےٰ ﷺ کا سدا بہار گلدستہ ہے جس کے پھولوں کی رنگت جدا جدا ہو سکتی ہے۔ بحور اور اوزان مختلف ہو سکتے ہیں مگر اس گلدستہ کا ہر پھول کسی نہ کسی حوالے سے صورت وسیرت محبوب دو عالم ﷺ کی رنگ آمیزی اور لطافت لئے ہوئے ہے۔ عبدالغنی تائب کے ہاں ایوانِ نعت میں داخل ہونے کے لئے پہلا قرینہ ہی نیاز مندی اور عجز و فروتنی ہے۔

وہ اسم محمد ﷺ ہے جسے ہونٹ بھی چومیں
کچھ ایسا حسیں نام ہے ہر ایک حسیں سے

....

نیاز عشق میرا مدعا ہے
حصول بندگی نعت و ثنا ہے

....

عرضِ دعا کو جنبشِ لب سے غرض نہیں
پلکوں پہ اشک بکھرے ہیں اس بے نوا کے پاس

....

میں بڑھ کر چوم لیتا ہوں قدم ہر اس مسافر کے
جسے محوِ سفر میں جانب طیبہ کہیں دیکھوں

....

شوق سر کو ہے جبیں سائی کا با عجز و نیاز
پوری ہوگی آرزو نقشِ قدم پانے سے ہی

....

یہ زباں گنگ اور شکستہ ہے قلم عاجز بیاں
ان سے ممکن ہی نہیں مدح شہِ کون ومکاں

....

ہر ثناخواں کی زباں پر عاجزی کا اعتراف
کب ہوا ہے نعت کا حق یا نبیؐ مجھ سے ادا

اس حقیقت کے اعتراف میں یارائے کلام نہیں کہ عبدالغنی تائبؔ نے اپنی نعت گوئی کی بدولت عصرِ حاضر کو سیرت حضورﷺ کا پیغام دیا ہے۔ بعثت مصطفویﷺ کا مقصد اولیٰ بھی یہی تھا کہ گمراہوں کو جادۂ حق پر گامزن کر کے خداناشناسوں کو عرفانِ الٰہی کی منزل سے ہمکنار کیا جائے۔ حضور پرنور سید یوم النشورﷺ نے ''لَقَد کان لکم فی رسول اللّٰہِ اسوۃ حَسنہ'' کا تاجِ زرنگار زیب سر کر کے قافلۂ انسانیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دینی دنیاوی سرفرازیوں سے بہرہ ور کر دیا۔ آپ کی سیرت مقدسہ جانِ قرآن تھی تو صورت نورِ قرآن آپ کے روشن کردار نے تاریک دلوں کو ضوبار کر دیا۔ عرب کے بدوؤں کو قیصرو کسریٰ کے مقدر کا مالک بنا دیا یہی وجہ ہے کہ رب کریم نے آپ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیتے ہوئے اطاعت مصطفےٰﷺ کو ہی نجات ابدی کی ضمانت بنا دیا۔ آج ضرورت ہے کہ زمانے کے مادیت زدہ دلوں میں اسمِ محمدﷺ کی شمع سے اُجالا کیا جائے۔ عبدالغنی تائبؔ نے اپنے آقا و مولا کی لازوال سیرت سے اکتساب وفیض کرتے ہوئے محاسن حضور کو زمانے بھر کے سامنے بشرحِ کمال پیش کر دیا ہے کہ خستہ سامانو! اگر حیاتِ سرمدی مقصود ہے تو بلا تاخیر دامانِ مصطفےٰﷺ سے وابستہ ہو جاؤ ورنہ۔

قافلہ تو اے رضا اول گیا آخر گیا

تائبؔ کے جملہ شعری محاسن اپنی جگہ، لاریب انہوں نے جس حسین انداز سے عصر حاضر کو عظمتِ رسولِ خدا کا پیغام دینے کے لئے آپ کے کردار اور سیرتِ مطہرہ کے مختلف زاویوں کو اُجاگر کیا ہے۔ اس نے ان کی شاعری کا حسن ہی دو چند نہیں کر دیا بلکہ بے شمار تاریک دلوں کو سیرت حضور کی ضیا بخشنے کا اہتمام بھی کر دیا جائے۔ اب ہم دیکھتے ہیں عبدالغنی تائبؔ کس حسین انداز میں کثافت آلود دلوں کی لطافتِ عشق مصطفےٰﷺ مہیا کرنے کی کوشش کرتے ہوں۔

اے باعث آبادئ بزمِ گل و لالہ
محبوب مجھے آپ کی سیرت کا حوالہ

ہمدوشِ ثریا ہے کیا اہلِ زمیں کو
انسان کو ہے آپ نے پستی سے نکالا

....

ہر اُفق پہ ہے مثال مہر و مہ جس کا وجود
قائدِ انسانیت کو رہنما رکھتا ہوں میں

....

اے صلِّ علیٰ نام ترا کتنا حسیں ہے
سیرت ہے کہ خود بولتا قرآنِ مبیں ہے

....

اشرف مخلوق کو دکھلا کے راہِ مستقیم
آپ نے کی دنیا بھر کی رہبری اچھی بھلی
توڑ ڈالے کعبۂ دل سے تعصب کے خم
کمتر وبرتر کو دے دی ہمسری اچھی بھلی

....

دلنشیں تھے اس قدر اطوارِ ختم الرسلیں
ہو رہے تھے لوگ جان ودل سے قائل دیکھ کر
دامنِ انسانیت پہ داغ تھا جن کا وجود
بن گئے انسان وہ انسان کامل دیکھ کر
آؤ کر لیں شاہراہِ زندگی کو تابناک
ہادیٔ کامل کے اوصاف و شمائل دیکھ کر

عبدالغنی تائب جب اپنے آقا ومولا کے محامد ومحاسن اور کمالات وخصائص کا ذکر کرتے ہیں تو نکہت ونور کی وادیوں میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ ذوق وشوق کو رہبر منزل بنا کر آگے بڑھتے ہیں۔ عشق وعقیدت ان کا زادِ راہ ہے تو وجود شوق سے اپنے جذبات کو تیز تر کرنے کا کام لیتے ہیں۔ وفورِ شوق وہ خوش بختی ہے جو ممدوح کائنات ﷺ کے اذن سے ہی کسی مداح حضور کا مقدر بنتی ہے۔ یہ تو ایک بحرِ بے کراں کا مواج ہو جانا ہے۔ جذبات عقیدت کے سیل نور کا بے کنار ہو کر وسعتِ قلب وذہن پہ چھا جانا ہے۔ یہ تو روحانی کیف وسرور کے نور آفریں نظاروں میں کھو جانا ہے۔ یہ تو اپنی ذات کے حصار سے اُبھر کر محبت رسول ﷺ کی پہنائیوں میں گم ہو جانا ہے۔ اس کیفیت پر شوق پر

اقبال کی یہ فکر صادق آتی ہے کہ

نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لئے

عبدالغنی تائب کی عقیدت کے بربط پر جو نغمے اُبھرتے ہیں ان کے اندر اس قدر ہمہ گیری، تاثیر انگیزی ہے کہ سننے والا خود اسی کیفیت سے ہمکنار ہو جاتا ہے جس نے تائب کے نوکِ خامہ کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہوتا ہے۔ ہم عبدالغنی تائب کے ان مضامین کی رنگا رنگی اور تنوع کا سراغ لگانے لگے، تو اسی ذوق وشوق کی بے کرانی نے آگے جانے سے روک دیا بلکہ آگے جانے کا یارا ہی کہاں رہا تھا؟ ہم تو ان کی شعری عمر اور فکری بلند پروازی کا تقابل کر رہے تھے مگر تقابل بھی کس طور ممکن ہے کہ

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

اہل نظر کا کہنا ہے کہ اگر نعتیہ شاعری وفورِ شوق سے محروم ہو جائے، تو محض نظم گوئی بن جاتی ہے۔ وفورِ شوق کا اُمڈتا ہوا نور مدحت نگاری کے انوار لٹاتا، محروم دلوں میں مرادوں کی شمعیں جگمگاتا، قلم کی نوک سے محبوب خدا کی محبت کے گلزار کھلاتا اور نعت کو محض لفاظی کی تہمت سے نکال کر حاصل اَدب عالیہ بناتا ہے۔ بلاشبہ عبدالغنی تائب اس سعادت سے بہرہ ور ہیں اور سعادت خاص سے بہرہ ور ہونے میں ان کی کسی شعوری کاوش یا لاشعوری جد وجہد کا دخل نہیں بلکہ یہ فقط اور فقط ممدوح کائنات کی بندہ نوازی ہے جس کی چشم کرم سے فیضیاب ہونے کے لئے ہر دور منا جاتوں کا کاسہ اُٹھائے پھرتا ہے اس وفورِ عشق عقیدت اور کمال ذوق وشوق نے عبدالغنی تائب کی مدحت نگاری سے کس طور خراج نیاز لیا ہے اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

وارفتگیٔ شوق کو منزل ہو اب نصیب
لرزیدہ پا کر طیبہ نگر تک رسائی دے
محشر میں مرے نامۂ عصیاں کے باوجود
ان کے وسیلہ پاک سے مجھ کو رہائی دے

....

آج تک رقصاں ہے طیبہ میں وہ رحمت کی بہار
سختیاں جھیلیں جو آقا نے محبت پیار سے
حضورؐ ناز میں پہنچے جو ارمغانِ نیاز
تو پھر نصیب ہو اپنا پر ہما کی طرح

پلکوں پہ قطرے عرضِ تمنا کے دیکھ کر
بن مانگے مجھ کو دیتے ہیں اپنی جناب سے
رہتے ہیں میری فکر میں طیبہ کے تذکرے
عنبر فشاں ہیں لب مرے مشک و گلاب سے

....

لامکاں میں خالقِ ارض و سما کی ذات تھی
چشمِ مازاغَ البصَر کے روبرو جلوہ نما
ابتدائے عشق پیغمبر شعورِ ذات ہے
انتہائے شوق ہے بس آپ ہی کا نقش پا

....

مجھ کو دی ہاتفِ غیبی نے نویدِ بخشش
آپ سے عشق و عقیدت کا جو رشتہ دیکھا
اوج پر اس کے مقدر کا ستارا چمکا
جس کو بھی پڑھتے ہوئے اُن کا قصیدہ دیکھا

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہیں کہ حضور محمد مصطفےٰ ﷺ جانِ دوعالم ہیں۔ افتخار آدم و بنی آدم ہیں۔ صبح ازل کا نور اور شامِ ابد کا سراج ہیں۔ آپ محبوب خدا بھی ہیں اور مطلوب کائنات بھی۔ جملہ انبیاء ورسل کے محاسن آپ کی ذات واحد میں جمع کر کے آپ کو کاروانِ عشق و سرمتی کی تمناؤں کا مرکز ومحور بنا دیا گیا۔ آپ کو ''ورفعنا لک ذکرک'' کا مصداق بنا کر آپ کے وجود سے بزم دوعالم جگمگائی گئی، آپ کے وجود کے صدقے میں یہ ساری کائنات بنائی گئی۔ آپ کے محاسن عقل کی آخری حدود سے ماوراء اور آپ کے ظاہری و باطنی کمالات فکرِ بشر کی معراج سے بھی بلند ہیں۔ جس کا مداح خود خدا ہو اور جس کا سب سے بڑا نعتیہ خراج قرآن مجید ہو انسان اس کے معجزات وخصائص پر طائرانہ نظر ڈالنے سے بھی قاصر ہے۔ امام احمد رضا خاںؒ کے مطابق

قرآن تو ایمان بتاتا ہے انہیں
ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ

عبدالغنی تائبؔ کو بخوبی ادراک ہے وہ جس ممدوح دوعالم کی مدح سرائی کا اعزاز حاصل کر رہے ہیں اُس کی ثناگوئی کا حق ادا نہیں کر سکتے مگر یہ شاعر سعید بخت نعت گوئی کو ایک اعزاز سمجھ کر

سینے سے لگائے مستقبل کے روشن دریچوں میں قدم رکھ رہا ہے۔ یہ اس عجز آفریں فخر سے سرشار ہے کہ "یارسول اللہ میں مانتا ہوں کہ آپ کی نعت گوئی کا حق ادا نہیں کر سکتا مگر کیا یہ شرف میرے لئے کم ہے کہ آپ کے نعت نگاروں میں میرا نام آ جائے۔

سلطان دو عالم ﷺ کے محاسن قدسیہ بیان کرتے کرتے عبدالغنی تائبؔ بار بار اس حسین احساس سے سرشار ہونے لگتے ہیں کہ انہیں حضور سے نسبت تو حاصل ہے۔ یہ وہی نسبت ہے جو غلام کو آقا سے، بندے کو بندہ نواز سے، شعاع کو سورج سے، کرن کو چاند سے، خوشبو کو پھول سے اور دردو آلام کے مارے ہوئے کو مسیحائے دوراں کے ساتھ ہوتی ہے۔

تری نگاہ جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

اب ہم ایک نظر دیکھتے ہیں کہ عبدالغنی تائب ممدوحِ دو عالم کے محاسن قدسی کا کس طور تذکرہ کرتے ہیں۔

واللیل کے گیسو سے قدر شب نے ہے پائی
اور عکسِ رخِ شاہِ اُمم دن کا اُجالا

....

جس کو بھی عطا کر دیں کبھی مات نہ کھائے
اعجاز ہے یہ سیدِ عالم کے علم کا

....

ختم الرسل ہیں اور ہیں مقصود کائنات
ہیں کنت کنزاً مخفیاً کے گوہر مکنوں

....

نغمات رفعنا لک ذکرک کے ہیں چرچے
از وسعتِ افلاک و زمیں شرق و غرب تک
حدیثِ دلنشیں الفقر فخری میری رہبر ہے
نبیؐ کے ہاتھ میں ہر نعمتِ دنیا و دیں دیکھوں

....

آ رہے ہیں آج تک قدسی قطار اندر قطار
عرشِ اعظم سے حسیں تر آستاں ہے آپ کا

لولاک لَما شانِ رفعنا لک ذکرک
تزئینِ گلستانِ جہاں آپ کے دم سے

....

سایہ زمیں پر نہ پڑا جس کے وجود کا
ہمسر ہو کون اُس کا بھلا کائنات میں

محامد ومحاسن مصطفےٰ ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے عبدالغنی تائبؔ جس نسبت سرکار پر نازاں ہیں وہ تو ہر صاحب ایمان کے لئے سرمایۂ حیات ہے مگر تائبؔ نے اس نسبت کو جس انداز سے دیکھا ہے وہ کچھ ان کا ہی خاصہ ہے۔ وہ انداز بدل بدل کر اسی نسبت کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ اس نسبت پر شاداں بھی ہیں اور مسرور بھی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نسبت مدحت حضور ﷺ انہیں خدا اور ملائکہ کی سنت کی ادائیگی کا شرف بھی عطا کرتی ہے۔ وہ لہجہ بدلتے ہیں۔ انداز بیاں بدلتے ہیں۔ اسلوب سخن گوئی بدلتے ہیں۔ لفظوں کے بانکپن کو نیا رنگ دیتے ہیں۔ تراکیب واستعارات کو نیا آہنگ عطا کرتے ہیں۔ حسن تغزل کی چاندنی اور جمال صوت کی کہکشاں کے انوار بکھیرتے ہیں۔ فکر وفن کا نئے سے نیا زاویہ تراشتے اور شعر ونغمہ گری کا تازہ سے تازہ پیرایۂ اظہار اختیار کرتے ہیں۔ مقصود فقط یہی ہے کہ مضامین کی تکرار بھی محسوس نہ ہو اور اسم محمد ﷺ کے حوالے سے نعت محمد ﷺ کا غازۂ نوبہار بھی بکھرتا رہے۔ عبدالغنی تائبؔ کے نزدیک نعت کیا ہے؟ نعت کا حسن کیا ہے اور نعت نگاری سے والہانہ لگاؤ نے انہیں صاحب نعت ﷺ سے محبت وعقیدت کے نام پر کس خلوص فن سے ہمکنار کیا ہے اس کا جائزہ لینے کے لئے تبرک کے طور پر چند اشعار نذرِ قارئین ہیں۔

اعجاز ہے سرکار کے فیضانِ کرم کا
ہے مدح و ثنا قبلہ مرے نوکِ قلم کا
گنجینۂ بخشش ہیں یہ گلہائے عقیدت
تائبؔ پہ کھلا رہتا ہے یوں باب کرم کا

....

بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہو میلاد کی محفل
مگر تائبؔ نے محفل میں نہ کی نغمہ سرائی ہو

....

یارسول اللہ تائب پر بھی ہو چشمِ کرم
لوگ کہتے ہیں کہ یہ بھی نعت خواں ہے آپ کا

....

ہاں مجھ کو عقیدت ہے مدینے کی زمیں سے
نسبت کا شرف اس کو جو ہے سرورِ دیں سے
تائب پہ ہوئی آج ہے پھر چشمِ عنایت
قطرے ہیں گرے عرقِ ندامت کے جبیں سے

....

تائب کو ان کی نسبتِ عالی پہ ناز ہے
اللہ کرے کہ فخر یہ تا زندگی رہے

عبدالغنی تائب نے جس حسنِ بیان اور الفاظ کی معجز نگاری کے ساتھ حضور ﷺ کے محامد ومحاسن بیان کرتے ہوئے آپ سے نسبت خاص کا ذکر کیا ہے۔ وہ ہر صاحب نظر کی آرزو بھی ہے اور حاصل آرزو بھی، انہوں نے جس طرح ندرت بیان اور حلاوت زبان سے اپنے آقا ومولا سے اپنے تعلق پر ناز کا اظہار کیا ہے۔ اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آتش کے اس شعر کی ایمان آفریں تفسیر پیش کرنے کے آرزومند ہیں کہ

نیا ہے لیجئے جب نام اس کا
بڑی وسعت ہے میری داستاں میں

اور اس امر میں کلام نہیں کہ عبدالغنی تائب کی داستانِ شوق میں بڑی وسعت ہے جو فہم وادراک کی حدود سے کہیں زیادہ جامع اور ہمہ گیر ہے۔ اس داستانِ شوق کے دراز ہونے کی رفتار ان کے راہوار عمر کی رفتار سے کہیں زیادہ ہے۔ نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے، ازل کے تصور اور ابد کے تعین سے بے نیاز، یوں سمجھئے کہ عمر سمٹ رہی ہے اور عبدالغنی تائب کے وفور شوق کی وسعتیں اپنے معاصرین سے خراجِ تحسین سمیٹ کر بارگاہ حضور ﷺ میں مقبولیت و پذیرائی کا شرف حاصل کر رہی ہیں۔

ارمغان نیاز کی صورت میں عبدالغنی تائب نے مدحت وتوصیفِ حضور کے جو گلہائے رنگا رنگ کھلائے ہیں وہ ہمیشہ عشاقِ سرورِ کونین کے مشام ذہن وفکر کو لطافت آشنا کرتے رہیں گے۔ ارمغان نیاز ایک ایسے شیش محل کی مانند ہے جس میں لاتعداد آئینے نصب ہوں اور وہاں عبدالغنی تائب اپنی تمام تر سعید بختیوں کو سرمایۂ فکر اور عجز سامانیوں کو ذریعہ اظہار بنا کر اس شیش محل میں

نعت حضور کی شمع نور لا کر رکھ دیں۔ اس ایک شمع نور (ارمغانِ نیاز) کے پرتو سے تمام آئینوں میں شمعیں جھلملانے لگیں گی ان میں سے ہر شمع اپنی جگہ مکمل اور خوبصورت وجود رکھتی ہو گی مگر یہ سب ایک ہی شمع نور ارمغانِ نیاز کا پرتو نور ہوں گی۔ ارمغانِ نیاز کے شیش محل میں جھلملانے والی شمعیں ہمیں کیا کچھ عطا نہیں کر رہیں؟

کہیں صورتِ مصطفیٰ ﷺ کی جلوہ گری ہے تو کہیں سیرتِ سرور کائنات ﷺ کی ناز آفرینی، کہیں نبی کریم ﷺ کے محامد و محاسن کا نور پھیلا ہوا ہے تو کہیں آپ کے اوصاف و کمالات کی ہر آن بکھرتی ہوئی روشنی، کہیں ضائع بدائع کی خوبصورتی ہے تو کہیں خوبصورت اور برمحل تراکیب واستعارات کی مرصع کاری، کہیں حسن تغزل اپنے تمام تر فکری وفنی لوازمات کے ساتھ جگمگا رہا ہے تو کہیں عشق وعقیدت سلطان مدینہ کی رم جھم دلوں کو حیات بخش تازگی عطا کر رہی ہے۔ کہیں گفتارِ حضور ﷺ معجز کاری ہے تو کہیں کردارِ سرورِ کونین ﷺ کی ہمہ گیری، کہیں عجز وانکسار کو بہانہ بنا کر شفاعت طلبی کا حسن اپنا وجود منوا رہا ہے تو کہیں اُمتِ اسلام کے رنج وآلام کا ماجرا سناتے ہوئے حضور ﷺ سے استمداد طلبی کا منظر دلوں کو کرب سے دوچار کرتا نظر آتا ہے۔ ان نعتوں میں حسن طلب بھی ہے اور ادائے نیاز بھی، رعنائی فکر بھی ہے اور عاجزی ودرماندگی کا انداز بھی، اس ایک شمع نور (ارمغانِ نیاز) نے اپنے نور آفریں پرتو صفات وکمالات حضور ﷺ کے حوالے سے جس قدر شمعیں روشن کر دی ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ ان کی روشنی کبھی بھی ماند نہ پڑنے پائے۔ ارمغانِ نیاز عبدالغنی تائب کی عشق حضور کے حوالے سے ان کی پہچان بھی ثابت ہے اور ان کے لئے سرمایۂ ایمان بھی ہے۔ ہم اس تحریر کا اختتام عبدالغنی تائب ہی کے ان نعتیہ اشعار پر کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

مرے قلب ونظر میں عشقِ احمد یوں مچل جائے
تصور میں مدینہ ہو بدن سے جاں نکل جائے
بسے ہوں گے خیالوں میں مرے جو شافع محشر
نہیں ممکن کہ پل سے پاؤں تائب کا پھسل جائے

☆☆☆

خیراتِ مدحت کا تمنائی

محمد اقبال نجمی

گلستانِ نعت کو قدرت نے وہ سدا بہاری عطا کی ہے کہ یہ کبھی خزاں آشنا نہیں ہوا۔ اس کی ہر کلی عطر بیز اور ہر پھول عنبر فشاں ہے۔ اس کی بہار جاودانی اور اس کی خوشبو دائمی ہے۔ اس گلستان نعت کی مہک کی ہمہ گیریت کا یہ عالم ہے کہ صدیوں کے تواتر سے جو بھی اس خوشبو کو اپنے مشامِ فکر کا اعزاز بنالیتا ہے وہی جمالِ نعت سے بزمِ عالم میں اجالا کرنے کو سرمایہ زندگی تصور کرنے لگتا ہے۔ فروغ نعت کا کبھی نہ ختم ہونیوالا یہ سلسلہ پورے روحانی تزک و احتشام سے جاری ہے۔ جو بھی نیا سورج طلوع ہوتا ہے وہ نئے شعراء کی کوچہ مدحت و نعت میں آمد کی نوید لے کر آتا ہے۔ کوچہ نعت میں بصد عجز و انکسار آنے والا ہر نعت گو اس احساس کے ساتھ گلہائے نعت سے ماحول کو معنبر کرنے کا اہتمام کرتا ہے کہ نعت گوئی اس کی شعوری کاوش نہیں بلکہ فقط انعام خداوندی اور رحمتِ مصطفوی ہے۔

وگرنہ کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ

محمد اقبال نجمی ایک طویل عرصہ سے شعر و ادب کی دنیا میں اپنے بھرپور وجود کا احساس دلا رہے ہیں۔ انہوں نے بڑوں کے لیے بھی لکھا اور بچوں کے لیے بھی متعدد نثری و شعری کتب کے خالق ہیں۔ وہ سہ ماہی مفیض اور ماہنامہ دلچسپ کے نام سے موقر ادبی جرائد بھی شائع کر رہے ہیں جب سے شاعری کی دنیا میں داخل ہوئے انہوں نے تمام شعری اصناف میں فکر و فن کے ستارے لٹائے ہیں۔ جب نعت کے گلستانِ صد رنگ میں داخل ہوئے تو نعت و مدحت کو خصوصی طور پر اعزازِ فکر بنالیا اور نعت مصطفیٰ ﷺ کی یہ شمع انہوں نے آغاز شاعری سے ہی جلا رکھی ہے۔ پنجابی اور اردو شاعری پر یکساں بھرپور گرفت رکھتے ہیں۔ کئی سال پیشتر ''آپ کی باتیں'' کے عنوان سے بچوں کے لیے معیاری نعتوں کا مجموعہ شائع کیا اور بچوں کے لئے ہی سیرت حضور دی، کے عنوان سے آسان پنجابی زبان میں حضور سرورِ کائنات ﷺ کی سیرت پاک تحریر کی۔ جدید صنف شاعری ہائیکو کو ذریعہ اظہار بنا کر نعتیہ ہائیکو کے عنوان سے عشق و عقیدت کا خوبصورت گلدستہ اہلِ یقیں کی نذر کیا۔ ''سک دی ڈالی'' کے عنوان سے ان کی پنجابی نعتیں اصحاب

نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔قومی ترانوں پر مشتمل ان کی کتاب ''قدم قدم آباد'' پاکستان رائٹرز گلڈ ایوارڈ پنجابی مثنوی ''ایہہ نہیں میرا پاکستان'' مسعود کھدر پوش ایوارڈ کی حقدار قرار پا چکی ہیں جبکہ ان کی پنجابی نعتیہ ہائیکو پر مشتمل کتاب ''مہکاں ونڈ دے بول'' کو وزارت مذہبی امور کی طرف سے اوّل ایوارڈ مل چکا ہے۔

ہر صاحب ایمان کا دل محبت رسول میں سرشار رہتا ہے۔کائنات میں جنم لیتے ہی اس کے دل میں حضور ﷺ کی محبت وعقیدت کی شمع فروزاں ہو جاتی ہے اور وہ کنار لحد تک دل و جاں کو اسی روشنی سے آباد پاتا ہے اور پھر جب صاحب ایمان قبر میں اترتا ہے تو محبت رسول ﷺ کے حوالے سے اس خوشی سے سرشار ہو کر قبر کی خلوتوں کو قبول کرتا ہے کہ اس کا جذبہ، عشق بارگاہِ خدا اور رسول ﷺ میں قبول ہو چکا ہو گا اور پھر یہی عشق قبر کی تاریکیوں میں چراغِ بخشش کی صورت فروزاں ہوگا۔امام احمد رضا خاں کے بقول

لحد میں عشقِ رخِ شہ کا داغ لے کے چلے
اندھیری رات سنی تھی چراغ لے کے چلے

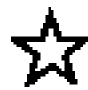
محمد اقبال نجمی کے دل میں بھی یہی جذبہ محبتِ حضور ﷺ شمع بن کر ضوبار ہے۔یہ جذبہ مچلتا ہے تو دل میں گنبدِ خضریٰ کو دیکھنے کی تمنا جاگ اٹھتی ہے۔شہر رسول ﷺ کی زیارت کی آرزو حاصل حیات بننے لگتی ہے۔ان کے لئے گنبدِ خضریٰ کا ہر نظارا ایمان آفریں ہے اور شہر رسول کی ہر جھلک جمال آگہی ہے تصورات کے دوش پر سفر کرتے ہوئے محمد اقبال نجمی کے قلم سے تمناؤں کی صد رنگی دیکھئے۔

دل میں طیبہ کے تصور سے اجالا دیکھوں
منزلِ شوق پہ اپنا میں سفینہ دیکھوں
ایک اُمّید لئے کب سے جیے جاتا ہوں
خوبیِ بخت اس سے نور کا جلوہ دیکھوں
دردِ ہستی کا مداوا بھی میں ایسے چاہوں
لطف فرماتا ہوا رشکِ مسیحا دیکھوں

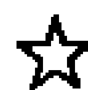
حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی آمد بہاراں کی تمہید بن گئی آپ الم رسیدگانِ ہستی کی آہ وزاری اور بلکتی ہوئی انسانیت کی بے قراریوں کے جواب میں رحمت پروردگار بن کر آئے۔آپ کے آنے سے نہ صرف تیرہ وتاریک ماحول ضوبار ہو گیا بلکہ دلوں کے ظلمت کدے بھی جگمگا اٹھے۔ ایمان کی روشنی سے محروم وہ حرماں نصیب کہ جنہیں اپنے وجود کا ادراک بھی نہیں تھا اسرارِ فطرت

کے ترجمان بن گئے، بے یقینوں کو ایمان کی دولت، گمراہوں کو حق شناسی کی نعمت، مایوس دلوں کو سکون کی رفعت اور بت پرستوں کو خدائے واحد کے حضور سربسجود ہونے کی سعادت عطا ہوئی۔ آپ ﷺ نے جس طرح عالم انسانیت کی راہنمائی فرمائی اس نے تاریخ عالم کے دھارے کا رخ تبدیل کر دیا اور بربادی وتباہی کے بحرِ بے کراں کی نذر ہونے والا سفینۂ حیات یکا یک عافیت کے ساحل پر لنگر انداز ہو گیا۔ دوسرے اصحاب شوق کی طرح محمد اقبال نجمی بھی حضور علیہ السلام کی اس خاکدانِ عالم میں قدم رنجہ فرمائی کی بدولت بپا ہونے والے ایمان آفریں انقلاب کے غور طلب اثرات سے آشنا ہیں۔ اُن کا قلم تعلیمات حضور ﷺ کی بدولت جہاں بھر کو ہر لحظہ منور کرتی ہوئی روشنی کو یوں خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

آئے حضور ہو گئی ہر سمت روشنی
آنے سے اُن کے چھٹ گئی دنیا کی تیرگی
کمزور جتنے لوگ تھے محفوظ ہو گئے
آئے جو آپ کٹ گئی زنجیرِ بے کسی
گونجی صدائے مرحبا آنے سے آپ کے
آئے جو آپ آ گئی چہروں پہ تازگی
چشمِ عطا ہوئی تو جواہر سبھی بنے
ذرّاتِ خاک کو ملی اِس طور دلکشی



جس پر حضور آپ کی چشمِ عطا ہوئی
اس کی تمام زندگی وقف ثنا ہوئی
مانگی ہے جب بھی آپ کے نعلین کے طفیل
پوری بس ایک آن میں میری دعا ہوئی
آئے جو آپ شمعِ ہدایت لیے ہوئے
ظلمت زدہ قلوب کو حاصل ضیا ہوئی



پستیوں میں گرنے والوں کو ہمالا کر دیا
نور بانٹا ظلمتوں میں اور اُجالا کر دیا

''سانیٹ'' ایسی صنفِ ادب ہے جس میں شعراء ترنم، تغزل اور تفکر کا جادو جگا کر کم

اشعار میں بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔ مختلف عنوانات کے حوالے سے ممتاز شعراء نے اس میدان میں بھی خوب طبع آزمائی کی ہے۔ محمد اقبال نجمی نے حصولِ سعادت کے لئے نعتیہ سانیٹ لکھے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اوصافِ حسنہ اور سیرت و کردار کے حوالے سے عصرِ حاضر کو نور آفریں پیغام دینے کی کوشش کی۔ نعتیہ سانیٹ بجائے خود ایک ایمانی ترکیب ہے جو ہمیں یہ احساس بخشتی ہے کہ جب شاعر کا دل حبِ مصطفیٰ ﷺ اور اُس کا قلم جمالِ حضور ﷺ سے آبدار ہو تو پھر نوکِ خامہ سے لفظوں کی جگہ ستارے پھوٹتے ہیں۔ تراکیب و استعارات کے نام پر انوار کی رم جھم کا سماں نظر آتا ہے اور شاعر ورطہ حیرت میں کھو جاتا ہے کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ محمد اقبال نجمی بھی اسی کیفیت سے دوچار ہیں انہیں فکر و نظر کی شادمانی اور رحمتِ خداوندی کی ارزانی کا گمان گزرتا ہے اور اُن کے قلم سے نعتیہ سانیٹ کا زمزمہ ابھرنے لگتا ہے۔

مل گیا پیغام مجھ کو کھل گئے دل کے گلاب
تھا شجر عمرِ رواں کا کب سے بے برگ و ثمر
مل گئیں شادابیاں جب ہو گئی اُن کی نظر
شوق کی تنویر سے روشن ہوئے ہیں میرے خواب
آسماں پر چھا رہے ہیں رحمتِ حق کے سحاب
میں کہ تھا اک خشک پتا کر دیا مجھ کو ہرا
ہے تمنا ان کی چاہت میں کروں خود کو فنا
مجھ کو لے آغوش میں ان کے کرم کا ماہتاب
دیدۂ پُر شوق نے منظر سہانے پا لیے
اُس عرب کے چاند کا ہم کو اُجالا مل گیا
اُن کی نعت مل گئی سارے خزانے پا لیے
اُن کے در پر آ گئے ہم کو سویرا مل گیا
نصرتیں ہی نصرتیں ہیں اور دامن تنگ ہیں
رحمتیں ہی رحمتیں ہیں اور دامن تنگ ہیں

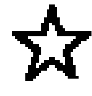
حضور پرنور سید یوم النشور ﷺ کی خوشنودی اور رحمت خداوندی کے حصول کا ایک اہم ذریعہ درود پاک ہے۔ درود کیا ہے؟ آرزوؤں کے نام پر چاہتوں کا نور ہے۔ بہتر سے بہترین پیرایہ میں صفت و ثنائے حضور ہے۔ یہی درود خدا بھی پڑھ رہا ہے اور ملائکہ بھی درود کی ڈالیاں بارگاہِ محبوبِ خدا میں نذر کرنے میں مصروف و محو ہیں، خدا اُمتِ مصطفیٰ ﷺ کو محسن انسانیت ﷺ کی

ذاتِ اقدس پر درود و سلام پڑھنے کا حکم دیتا ہے۔ گویا درود حکمِ ربانی کی تعمیل بھی ہے اور عشق رسول ﷺ کے تقاضوں کی تکمیل بھی، یہ سنت خداوندی بھی ہے اور جمالِ بندگی بھی۔ محمد اقبال نجمی کو بجا طور پر احساس ہے کہ جو بھی ارمغانِ عقیدت بارگاہ سالت مآب ﷺ میں پیش کیا جائے وہ درود ہی ہے مگر اس کے باوجود ان کا قلم درود کے عنوان سے اوصافِ حضور ﷺ رقم کرنا سعادت عظمٰی تصور کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

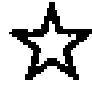
رکھتا ہے روح و جسم کو تازہ درودِ پاک
کرتا ہے رنج و غم کا مداوا درودِ پاک
وابستگی ہے جس کو محمد ﷺ کے نام سے
اُس کا تو ہر گھڑی ہے وظیفہ درودِ پاک
اُس کو مرے حبیب کی قربت ہوئی نصیب
جس نے مرے حبیب پہ بھیجا درودِ پاک

محمد اقبال نجمی نے ''نعتیہ ہائیکو'' کے عنوان سے ایک مجموعہ عقیدت و محبت پیش کر کے ثابت کر دیا ہے کہ جس طرح حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا ذکرِ جمیل ہر عہد اور ہر زبان کا اعزاز ہے اسی طرح ہر صنف سخن اسی محبوبِ دو عالم کے تذکار حسین کی بدولت مقبولیت کی حقدار ٹھہرتی ہے۔ ہائیکو اگرچہ جاپان سے درآمد ہوئی مگر ہمارے بعض ایجاد پسند شعراء نے اسے اردو زبان کا جامہ عطا کر کے اپنی فکر آفرینی کے ظہور کا ذریعہ بنا دیا۔ محمد اقبال نجمی نے معاصر شعراء پر سبقت حاصل کرتے ہوئے ''نعتیہ ہائیکو'' کی صورت میں جدید لہجہ میں نعت حضور ﷺ پیش کرنے کی انتہائی مستحسن کاوش کے ذریعہ ایک دنیا کو چونکا دیا۔ انہوں نے محض جدیدیت کی دھن میں یہ ہیئت اختیار نہیں کی بلکہ ان کے قلب و جاں میں پنہاں وفورِ شوق نے ہائیکو کی سمت سفر شروع کر دیا۔ محمد اقبال نجمی کی ہائیکو میں غزل کا وقار نظر آتا ہے اُن کی نعتیہ ہائیکو جمال مصطفیٰ ﷺ کی تابانیوں سے آباد نظر آتی ہے اس سلسلہ میں ان کا جو پہلو انہیں معاصرین سے ممتاز کرتا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے آقائے دو عالم ﷺ کی سیرت و کردار اور جمال جہاں افروز کے گل و لالہ اس شان سے مہکائے ہیں کہ ان کی خوشبو تا زیست عشاقِ حضور ﷺ کے مشامِ عقیدت کو معنبر کرتی رہے گی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

کتنی صدیاں گزر گئیں لیکن
تیری جانب ہی دیکھتا پایا
آدمیت کو ارتقا کے لئے



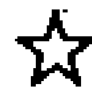
ایسے لمحات کچھ میسّر ہوں
میرے آقا کروں تری باتیں
میں ترے شہر کی کھجوروں سے



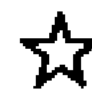
شوق میرا ہے بس یہی نجمی
رحمتوں کے حصار میں رہنا
مغفرت کی بہار میں رہنا

اب جمالِ مصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے نعتیہ ہائیکو میں محمد اقبال نجمی کا حسنِ قلم دیکھئے۔

جب وہ نازِ بشر شب اسریٰ
اپنی معراجِ انتہا پر تھا
عشق پر حسن کی نوازش تھی



تو کہ اک آفتاب روشن ہے
اس جہاں کو مٹھاس دیتا ہے
نور تیرا ہے سارے عالم میں

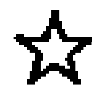


میں سراپا حضور کا پڑھ کر
جب درود و سلام کہتا ہوں
رحمتوں کا نزول ہوتا ہے

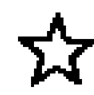
محمد اقبال نجمی کو احساس ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی بارگاہ وہ دربارِ عالم پناہ ہے جہاں سے ہر ایک کو حسب طلب ہی نہیں بلکہ طلب سے بھی سوا ملتا ہے۔ حضور نے زندگی بھر کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹایا اور آج جبکہ مونس بے کساں صلی اللہ علیہ وسلم گنبدِ خضریٰ میں آرام فرما ہیں تو سائلوں کا ہجوم ہمہ وقت محوِ طواف رہتا ہے۔ آپ کو پکارتے ہیں تو ان کی بے قراریوں کو قرار اور بے چینیوں کو سکون کی دولت نصیب ہونے لگتی ہے۔ محمد اقبال نجمی اپنے آقا و مولا کے حسنِ سخاوت سے بخوبی آگاہ ہیں اور جانتے ہیں کہ آپ کا نام لینے سے مایوسیوں کی گھٹائیں چھٹنے لگتی ہیں اور رحمت کا سورج طلوع ہونے لگتا ہے۔ آپ کا در لطف وعطا کا گہوارا اور آپ کا گنبدِ خضریٰ آپ کے عشاق کے لئے انوارِ خداوندی کا نظارہ ہے۔ آپ ﷺ کی بارگاہ سے زندگی کے آداب بھی عطا

ہوتے ہیں اور آپ سے محبت و ارادت کی بدولت آپ کے اُسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی توفیق بھی عطا ہوتی ہے۔ محمد اقبال نجمی کے قلم سے آرزومندی کا جمال دیکھئے۔

وہ جو مائل بہ کرم ہیں تو یہ دھڑکا کیسا
جب بھی دیکھیں طلب ، اپنی رضا بخشیں گے
اُن کی چاہت کے خزانے ہیں جہاں میں بٹتے
جتنا چاہو گے تمہیں اِس سے سوا بخشیں گے



جس پر حضور آپ کی چشمِ عطا ہوئی
اس کی تمام زندگی وقفِ ثنا ہوئی
مانگی ہے جب بھی آپ کے نعلین کے طفیل
پوری بس ایک آن میں میری دعا ہوئی

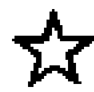


اُدھر رحمت لپکتی ہے جدھر سرکار ہوتے ہیں
جو اُن کے در پر آتے ہیں وہی سرشار ہوتے ہیں
جو اُن کو خواب میں دیکھیں وہی بیدار ہوتے ہیں
درود اُن پر سلام اُن پر درود اُن پر سلام اُن پر

اِس عندلیبِ گلستان رسالت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی طٰہٰ اور یٰسین کا مصداق ہے اُن کے لئے حضور سلطانِ دو عالم کی صورت و سیرت سراپا روشنی ہیں۔ آپ سے پہلے انسان وقارِ آدمیت سے محروم تھا۔ لات و منات کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ آپ کی ولادت باسعادت سے روشنی اور نور کا قافلہ اس شان سے منزل ایمان کی جانب گامزن ہوا کہ عرب و عجم اس سے یکساں فیض یاب ہونے لگے۔ غم کے ماروں کو قرار اور محروم قسمت انسانوں کو وقار کی دولت نصیب ہوئی۔ ٹھوکروں پر پلنے والے عظمتِ انسانیت کے علمبردار بن گئے۔ آمدِ مصطفےٰ ﷺ انسانیت نوازی کا پیغام لے کر آئی، فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہونے والے مہرِ رسالت نے ذروں کو آفتاب کی تابانی اور سنگریزوں کو خورشید کی تابانی بخش دی۔ محمد اقبال نجمی جانتے ہیں کہ ایسا انقلاب چشمِ فلک نے بھلا کب دیکھا تھا یہ تو ملجائے دو عالم ﷺ کی تشریف آوری کا فیضان ہے کہ اس صبحِ بہاراں کے طلوع ہوتے ہی کائناتِ ہستی ایک نئی ولولہ انگیز شان کے ساتھ قافلۂ زیست کی انسانی اقدار کی منزل کی جانب سفر کا حیرت انگیز منظر دیکھنے لگی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے تو ویرانے کس طرح بہارِ بداماں بن گئے اس کا احساس محمد اقبال نجمی کی نعت

کے مطالعہ سے بہت سے مقامات پر ہوتا ہے۔

اِس جہانِ رنگ و بو میں اُن سے ساری رونقیں
بٹ رہی ہیں اُن کے در پر دو جہاں کی نعمتیں
دل کے ویرانوں میں آئی اُن کے آنے سے بہار
اُن کا ذکرِ پاک سُن کر جھومتی ہیں رحمتیں
دولتِ تہذیب ہستی فکرِ عشق و آگہی
اُن کی نسبت سے ملی ہیں ہم کو ساری عظمتیں



دلکشی روشنی نور ہی نُور ہے
نُورِ طیبہ سے ہر آنکھ معمور ہے
جس نے فکر و نظر کو جلا بخش دی
میرے آقا کا روشن وہ منشور ہے

خیراتِ مدحت، اس نعتیہ تصنیف کا عنوان بھی ہے اور ایک دلآفریں نعتیہ ترکیب بھی۔ یہ ایسی نعتیہ ترکیب ہے۔ جس کی گہرائی میں ڈوب کر عظمت وشانِ حضور ﷺ اور سائل کی عجز سامانی کا احساس ہوتا ہے۔ دربارِ مصطفیٰ ﷺ وہ دربار ہے جہاں سے سائلوں کو طلب سے بھی سوا عطا ہو رہا ہے، جہاں سے بٹنے والی خیرات سے شاہ گدا، سلاطین وفقراء، تاجدارنِ کجکلاہ اور گدایانِ بے مایہ سبھی فیضیاب ہو رہے ہیں جس کے دربار کی خیرات پر دو عالم کا گزارا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ، خدا مجھے عطا کرتا ہے اور میں تقسیم کرنے والا ہوں۔

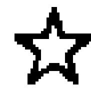
درِ مصطفیٰ ﷺ سے عطا ہونے والی خیرات پہ کونین کا گزارا ہے۔ خدائے کریم نے کُن کی کنجیاں آپ کے دامن میں ڈال دی ہیں تو پھر وہاں سے سائلوں کو کیا کیا عطا نہ ہوتا ہوگا اور کیا کیا عطا نہیں ہو رہا۔ انبیاء اور رسل بھی اپنے اپنے ادوار میں آپ ﷺ کی رحمت کا وسیلہ ڈھونڈتے رہے، یہ رحمت طلبی بھی تو خیراتِ نُور حاصل کرنے کا بہانہ ہے۔ اولیا، اغواث، شعراء، ادباء، قلم کار، فصحاء، خطباء سبھی خیراتِ مدحت کے تمنائی ہیں کیونکہ سب اپنے آقا و مولا ﷺ کی شانِ عطا سے آگاہ ہیں۔

مالکِ کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں
دو جہاں کی نعمتیں ہیں اُن کے خالی ہاتھ ہیں

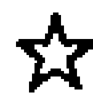
محمد اقبال نجمی بھی نعتوں کے گلاب اٹھائے، عقیدت کی کلیاں سمیٹے، محبتوں کے ارمغان کی خوشبو لٹاتے ہوئے اسی عظیم المرتبت دربارِ اقدس کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اُن

کے لہجے میں عاجزی ہے، اظہار میں سوز ہے، آنکھوں میں اشتیاق کا نم ہے، دل میں گداز شوق کا وفور ہے۔ کبھی آقا و مولا کے مقام مرتبہ کی رفعتوں کو دیکھتے ہیں اور کبھی اپنی کم مائیگی کو۔ ایک نیاز مندانہ جھجک آگے بڑھنے اور اظہار مدعا سے روکتی ہے۔ مگر گنبد خضریٰ سے رحمتِ عام اور بخشش و عطا کی ہر آن اُبھرتی ہوئی صدائیں اُن کے جذبہ طلب کو ابھارتی ہیں اور پھر اُن کے قلم سے حُسنِ طلب کے نام سے خیراتِ مدحت کی طلب ابھرنے لگتی ہے۔ یہ صرف اپنے لئے ہی نہیں مانگتے بلکہ اُمتِ اسلام کے لئے بھی مانگتے ہیں کیونکہ یہ خود کو اُمتِ اسلام سے الگ نہیں سمجھتے۔ خیراتِ مدحت کے اس تمنائی کا جذبہ خیرات طلبی دیکھیے یہ خیراتِ مدحت بھی طلب کرتے ہیں تو خیرات عطا کرنے والے آقا کی رفعت بے کراں کا تذکرہ کر کے۔

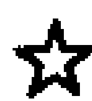
ترے در کے غلاموں کو ابد تک سرخوشی دے گا
وہ جامِ لطف جو تُو نے پلا رکھا ہے صدیوں سے
کیا اپنے فقیروں کا بھی اونچا اس قدر رتبہ
کہ اُن کے در پہ شاہوں کو جھکا رکھا ہے صدیوں سے



جادۂ شوق ترے لطف کی چھاؤں میں رہے
غنچۂ نعت سدا پاک ہواؤں میں رہے
زندگی اُس کو بتانے کا ہنر آتا ہے
جامِ رحمت جو پیے پیار کی چھاؤں میں رہے



ارضِ طیبہ سے ہر بے نوا کے لئے
نُورِ رحمت رواں ہے عطا کے لئے
لب پہ آتی ہیں سب دل کی بے تابیاں
ہاتھ اُٹھتے ہیں جب بھی دُعا کے لئے
ماہِ فاراں کی پھیلی ہے جو روشنی
وا کئے سب نے دامن ضیا کے لئے



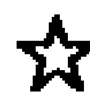
اپنی رحمت کا مرے سر پہ یوں سایا کر دیں
ارضِ طیبہ کا طرف میرا بھی پھیرا کر دیں

نعت کی اصل شان وہ ادب و احترام ہے جو عشاق حضور ﷺ کو والہانہ انداز کی رفعتیں عطا کرتا ہے۔ محمد اقبال نجمی محبتِ رسول کے نام پر بجا طور پر یہ ادراک رکھتے ہیں کہ بارگاہِ رسول ﷺ میں تو ملائکہ اور اولیائے کرام بھی سانس روک کر حاضری دیتے ہیں کہ کہیں سانسوں کا زیر و بم بھی گستاخی کا سبب نہ بن جائے۔ ادب محبت کے قرینوں میں پہلا قرینہ ہے اور پھر اس کے حضور باادب حاضری جو خلاق کائنات کا محبوب اور بزم فطرت کا مطلوب ہے۔ محمد اقبال نجمی کا قلم بھی عجز و انکساری کو اپنا ترجمان بنا کر ادب و احترام کے تقاضوں کو بجالاتے ہوئے جب نعت کے پھولوں کی مالا پروتا ہے تو پڑھنے والوں کے دل روحانی کیف و سرور کے احساس میں کھو جاتے ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں صاحبِ ایمان پہنچنے کی آرزو تو کرتا ہے مگر پھر واپسی کا راستہ یاد نہیں رہتا۔ بارگاہِ رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام میں محمد اقبال نجمی کے جذبات احترام و عقیدت، استمداد طلبی، وفورِ شوق، حسنِ ذوق، کمال آرزو، اور نیازِ تمنا کا ایک انداز دیکھئے۔

تصدق ہیں سارے اسی خوش بیاں پر
سدا پھول کھلتے ہیں جس کی زباں پر
فضائیں معطر یہ ہو جائیں ساری
مہکتا ہے جب اسمِ احمد زباں پر



میں نعت کی تکمیل کروں گا کیسے
دل نُور کی قندیل کروں گا کیسے
لفظوں کے ستارے میں بنا لوں لیکن
اس حُسن کو تمثیل کروں گا کیسے



نکھرے ہیں مرے لفظ ضیا کی صورت
چلتی ہے مری سانس صبا کی صورت
توصیف نبیؐ سے ہوا عالم ایسا
مہکتی ہے مری خاک حنا کی صورت

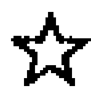
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے یوں تو وہ ذرّہ بھی رشکِ صد آسماں ہے جسے آپ سے نسبت ہو گئی لیکن بلادِ مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور بالخصوص گنبد خضریٰ کو آپ کی نسبت سے جو مقام حاصل ہے اس کی بلندی، درجات کا کسی اور مقام سے تقابل ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مدینہ منورہ کے تصور سے ہی عشاق کے دل دھڑکنے لگتے ہیں اور گنبد خضریٰ کے سامنے حاضری کے تصور سے ہی

نبضِ ہستی درہم برہم ہو جاتی ہے۔ خوش بخت ہیں کہ جنھوں نے مدینہ طیبہ میں شہرِ رسول کے ذرات کی خورشید سامانی کو دیکھا، وہاں کے در و بام پر پھیلی ہوئی تجلیات کو دیکھا، گنبدِ خضریٰ کا طواف کرنے والے عشاقِ حضور کی دعاؤں، مناجاتوں اور سسکیوں کو دل کی زبان سے سُن کر نعتوں کے تصورات سے دل و جان کو آباد کیا۔ گنبد خضریٰ کے حوالے سے محمد اقبال نجمی کی عقیدت کا انداز ملاحظہ کیجئے۔

گنبدِ خضریٰ تری کیا شان ہے
پاس تیرے دو جہاں کی جان ہے
زائرانِ کوئے طیبہ کے لیے
دید تیری وصل کا سامان ہے
اک نظر جو تیری جانب دیکھ لے
وہ ہی تیرے حسن پر قربان ہے

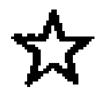
شہرِ مدینہ اور گنبدِ خضری کی عظمتوں کے کیا کہنے، جس نے نہیں دیکھا وہ دیکھنے کے لئے تڑپتا ہے جو دیکھ آیا ہے وہ بار بار زیارت کے لئے تڑپتا ہے۔ محمد اقبال نجمی بھی عشاق رسول ﷺ کے اُس قافلہ کے رکن ہیں جن کے تخلیات اور تصوّرات کی دنیا گنبدِ خضریٰ کے انوار سے بسی ہوئی ہے، اُن کی نعتوں کا گداز، لہجے کا خلوص، قلم سے ٹپکنے والے اشعار کا مودب پیغام، عشق و عقیدتِ حضور کی داستان بیان کر رہا ہے ایسی داستان، جو زبان کو حلاوت، فکر کو طراوت، افکار کو رفعت اور فکری بانکپن کو عاجزی کی لذّت سے آشنا کرتی ہے، یہ سوچتے ہیں، شہرِ مدینہ کے لئے تڑپتے ہیں، زیارتِ گنبدِ خضری کے لئے، جیتے ہیں تجلیاتِ مدینۃ الرّسول کے لئے، سانس سانس آباد رکھتے ہیں تذکارِ شہرِ حضور ﷺ کے لئے۔ جب عشق صادق ہو، جذبہ رفعت آشنا ہو، احساس مہکبار ہو، ادراک گہربار ہو اور آنکھیں اشکبار ہوں تو پھر نوکِ خامہ سے اشعار نہیں بلکہ گلاب مہکتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

ارضِ طیبہ سے محبت کا سندیسہ آیا
دل یہ چاہے کہ چلوں اب میں ہوا کی صورت



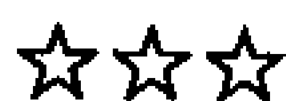
اُن کے در پر رہی حاضری چار دن
میں نے جانا ملی زندگی چار دن
اشک تھمتے نہ تھے ہونٹ تھے کانپتے
ایسی حالت بنی تھی مری چار دن

میری نظروں نے چومیں حسیں جالیاں
میں نے پائی عجب روشنی چار دن



طیبہ کی چاندنی میں کیا لطف پا رہا ہوں
صلِ علیٰ کے غنچے دل میں کھلا رہا ہوں
دل رو برو ہے اُن کے آنکھیں جھکی ہوئی ہیں
طیبہ کی روشنی ہے میں جگمگا رہا ہوں
میرے حضور کا ہے دربار سب سے عالی
بن کر گدائے طیبہ قسمت جگا رہا ہوں

ایوانِ مدحت میں محمد اقبال نجمی کا ذوقِ نعت پورے روحانی شکوہ کے ساتھ پروان چڑھتا، جذبات کے مطلعِ ایمان پر چمکتا، دلوں کو انوارِ آگہی سے ضوبار کرتا، احساسات کو مہکاتا اور معاصرین کے درمیان اپنے روشن وجود کا احساس دلاتا نظر آتا ہے۔ محمد اقبال نجمی کی نعتوں پر ایک نظر ڈالتے ہی یہ حقیقت واضح ہونے لگتی ہے کہ شاعر نے نعت محض شاعرانہ تفاخر یا فکر و فن اور نقد و نظر کے لحاظ سے اپنی محنت کی داد پانے کے لئے نہیں لکھی بلکہ اس کے پیشِ نظر فقط وہ جذبہء عشق رسول ﷺ ہے جو سیدنا حسانؓ بن ثابت سے علامہ اقبالؒ تک چمکتا، جگمگاتا اور وقت کے بنجر صحراؤں میں لطف و رحمت کے گلاب کھلاتا نظر آتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ وہ عظیم المرتبت مقام ہے جس کی عظمتوں کا احاطہ کرنے کے لئے شاعر کا قلم کما حقہ وہ کچھ بیان نہیں کرسکتا جسے بیان کرنے کی تمنا لے کر اس نے اس وادیء شوق کا سفر اختیار کیا ہے۔ یہاں زمانے بھر کے الفاظ ذخیرہ تمام، دنیا بھر کی سحر بیانی عاجز، اور اصحاب علم و ادب کا تمام شعری و نثری سرمایہ انتہائی محدود و مختصر نظر آتا ہے۔ یہ عجز بیانی اپنی جگہ، پھر بھی اس حقیقت کا اعتراف شوکتِ نعت کو خراج عقیدت پیش کرنے کے مترادف ہے کہ محمد اقبال نجمی نے سلطانِ سلاطینِ دو عالم ﷺ کے دربار میں اپنی چاہتوں اور آرزوؤں کا نذرانہ خیراتِ مدحت کی صورت میں پیش کرنے کے لئے جس اسلوب اور آہنگ کو اختیار کیا ہے وہ اہلِ شوق کی نگاہوں میں مقبول ٹھہرے گا اور غلامانِ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دلوں میں عشق و عقیدت کے ایسے چراغ روشن کرنے کا سبب بنے گا جن کی روشنی ان کے لئے حالات کے ظلمت کدوں کو منور کرنے اور لحد کی تاریکیوں کو کافور کرنے کا سبب بنے گی۔ ان شاءاللہ تعالیٰ العزیز





مصنّف کی دیگر کتب

مطبوعہ کتب

- روحِ تکلّم ... (تقریریں)
- حسنِ تکلّم ... (تقریریں)
- جمالِ فقر
- کاروانِ نعت کے حدی خواں
- تجلیاتِ مخدوم
- تجلیاتِ شیخ الاسلام
- شہ پارۂ خطابت
- سلام بحضور سید الانام ﷺ
- انوارِ میاں میر
- تاریخ گوجرانوالہ
- جمالِ اکبری
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- قافلہ شوق کے مسافر
- ضربِ قلم

زیر طبع کتب